رہنمائے اساتذہ

مطالعۂ قرآنِ حکیم

برائے طلباء وطالبات

حصّہ پنجم

نوٹ: مطالعۂ قرآنِ حکیم حصّہ پنجم کا رہنمائے اساتذہ ابھی ابتدائی مراحل میں ہے، لہذا فی الفور آپ کے استفادہ کے لئے سُوْرَۃُ الْاَنْعَام تا سُوْرَۃُ ھُوْد کے آیت بہ آیت تشریحی نکات پیش خدمت ہیں۔ یہ معروف تفاسیر سے ماخوذ ابتدائی مسودہ ہے، البتہ اس میں بہتری کی گنجائش موجود ہے۔

The ILM Foundation (TIF)

3/63, Block-3, Delhi Mercantile Cooperative Housing Society (D.M.C.H.S.),
Post Code 74800, Karachi, Pakistan.
Contact numbers: (+92-21) 34304450-51, 0335-3399929,
Email: info@tif.edu.pk / tif1430@gmail.com, Website: www.tif.edu.pk

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

فہرست مضامین

نمبر شمار	سبق	صفحہ نمبر
۱	سُوۡرَۃُ الۡاَنۡعَام	۰۳
۲	سُوۡرَۃُ الۡاَعۡرَاف	۶۶
۳	سُوۡرَۃُ یُوۡنُس	۱۰۷
۴	سُوۡرَۃُ ھُوۡد	۱۴۴

سُوْرَۃُ الْاَنْعَام

مقاصد مطالعہ:

اس سورت کے مطالعہ کے بعد طلبہ وطالبات میں اتنی استعداد پیدا ہو جائے کہ وہ مندرجہ ذیل مضامین سے آگاہی حاصل کر سکیں:

۱۔صفات باری تعالیٰ۔ ۲۔ مشرکین مکہ کا بار بار معجزات کا مطالبہ۔ ۳۔ اللہ ﷻ کی طرف سے قرآن حکیم ہی کو معجزہ کے طور پر پیش کیئے جانے کا بیان۔ ۴۔ مشرکین کے مطالبہ پر نبی کریم ﷺ کی دلجوئی۔ ۵۔ مشرکین کے شرکیہ عقائد واعمال کا رد۔ ۶۔ دعوتِ انبیاء کرام علیہم السلام۔ ۷۔ مشرکین مکہ پر اتمام حجت۔ ۸۔ مشرکین کی قیادت کا مکر وفریب اور غرور۔ ۹۔ قریش کے مَن پسند فیصلے اور باطل رسومات۔ ۱۰۔ توحید ودعوت کا خلاصہ اور رد شرک۔

ربط سورت:

سورۃ المائدہ میں یہود ونصاریٰ کے باطل عقائد، اسلامی شریعت سے فرار اور ان پر اتمام حجت کا تذکرہ ہے اور سورۃ الانعام میں مشرکین مکہ کے شرکیہ عقائد کا بیان اور ان پر اتمام حجت کا ذکر ہے۔

سورۃ الانعام کی فضیلت:

۱۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے: ”سورۃ الانعام قرآن کی افضل سورتوں میں سے ایک سورت ہے۔“ (سنن دارمی)

۲۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: ”سورۃ الانعام مکمل ایک ہی رات میں نازل ہوئی۔ ستر ہزار فرشتے اللہ ﷻ کی تسبیح کرتے ہوئے اِسے لے کر نازل ہوئے“۔ (طبرانی)

علمی بات: اس سورت میں ”انعام“ یعنی چوپاؤں کے بعض احکام بیان فرمائے گئے ہیں اس لئے یہ سورت ”الانعام“ کہلاتی ہے۔ اس سورت میں احکام کا بیان کم ہے زیادہ تر توحید کے اصول اور دلائل بیان فرمائے گئے ہیں۔

آیت نمبر ۱: اس آیت کا موضوع عقیدۂ توحید ہے۔ اس سورت میں اللہ ﷻ کی حمد اور صفتِ تخلیق کا بیان ہے اور اس کا آغاز کلمۂ حمد یعنی ”الحمد للہ“ سے کیا گیا ہے۔

علمی بات: حمد کا معنی تعریف بھی ہو سکتا ہے اور شکر بھی۔ تعریف (حمد) عام ہے اور شکر خاص۔ حمد کا تعلق قابل تعریف کارناموں سے ہے۔ مثلاً اللہ ﷻ نے زمین و آسمان، شمس و قمر اور ستاروں کی حرکت غرض تمام کائنات کا اس قدر مربوط اور منظم نظام بنا دیا ہے جسے دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اس پر اللہ ﷻ کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ اور شکر کا تعلق ان انعامات سے ہوتا ہے۔ جو کسی خاص ذات سے متعلق ہوں مثلاً اللہ ﷻ کا انسان کو بہترین صورت میں پیدا کرنا، صحت اور رزق کی فراوانیوں سے مالا مال کرنا وغیرہ۔ ایسی نعمتوں کے اعتراف کو شکر کہا جاتا ہے۔

عملی پہلو: مخلوق میں سے کوئی شخص کوئی قابل تعریف کارنامہ سر انجام دے اور اس پر اس کی تعریف کی جائے تو وہ بھی حقیقتاً اللہ ﷻ ہی کی تعریف ہو گی۔ کیونکہ قابل تعریف کام کرنے کی صلاحیت اور توفیق بھی اللہ ﷻ ہی کی طرف سے عطا ہوتی ہے۔ اس طرح ہر قسم کی تعریف کا مستحق اللہ ﷻ ہی قرار پاتا ہے۔

نوٹ: قرآنِ حکیم کی پانچ سورتوں کا آغاز ”الحمد للہ“ سے کیا گیا ہے۔ i۔ سورۃ الفاتحہ۔ ii۔ سورۃ الانعام۔ iii۔ سورۃ الکہف۔ iv۔ سورۃ سبا۔ v۔ سورۃ فاطر۔ اس آیت میں اللہ ﷻ کی صفتِ تخلیق کا بیان ہے کہ اللہ ﷻ نے ہی آسمان وزمین اور اندھیرا اور روشنی پیدا کئے۔

علمی بات: ۱۔ خلق کے معنی عدم سے وجود میں لانے کے آتے ہیں یعنی ایک چیز کا کوئی وجود نہ تھا پھر اس کی تخلیق کر کے وجود عطا کیا گیا اور خلق کے معنیٰ پہلے سے موجود اجزا باہم ملا کر کوئی نئی چیز بنانے کے بھی آتے ہیں۔ یہاں عدم سے وجود بخشنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ لفظ خلق کی نسبت

ذاتِ باری تعالیٰ کی طرف حقیقی ہے اور بندوں کی طرف اس کی نسبت مجازی ہے ہر چیز کا خالق حقیقی اللہ ﷻ ہے اور مخصوص اجزاء کو ملا دینے سے جو نئی شکل وصورت حاصل ہو گی اس کی نسبت بندوں کی طرف کرنا نسبتِ مجازی کہلائی گی۔

۲۔ ظلمات یعنی اندھیروں سے رات کی تاریکی اور نور سے دن کی روشنی یا اس سے کفر کی تاریکی اور ایمان کی روشنی مراد ہے۔ ظلمت کی تعبیر غلط اور گمراہی کے راستہ کی ہے جو کہ بہت سارے ہیں۔ اس لئے جمع کا لفظ ظلمات ذکر کیا۔ نور کی تعبیر سیدھے اور ہدایت کے راستہ کی ہے جو ایک ہے۔ اس لئے واحد کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ ظلمت میں کفر، شرک، نفاق اور ہر طرح کے گناہ شامل ہیں۔ خواہ وہ گناہ عقیدے کے ہوں یا عمل کے، سب ظلمات یعنی اندھیرے ہیں۔

۳۔ شرک پر تعجب کے اظہار کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ جب ساری چیزوں کا خالق اللہ ﷻ ہی ہے تو پھر شرک کی گنجائش کہاں سے آنکلی؟ اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس کائنات کی چیزوں میں بظاہر جو تضاد نظر آتا ہے، مثلاً زمین و آسمان، روشنی و تاریکی، سردی و گرمی، تو اس تضاد کے اندر اس کائنات اور اس میں بسنی والی مخلوقات کی بقا کے لئے ایسی حیرت انگیز کارسازی نظر آتی ہے کہ کوئی عاقل تصور بھی نہیں کر سکتا کہ ان میں سے ہر ایک کا خالق جُدا جُدا ہے۔ بلکہ ہر ذی عقل یہ ماننے پر مجبور ہے کہ پوری کائنات ایک ہی کارفرما کے ارادے اور مشیت کے تحت حرکت کر رہی ہے۔ خواہ زبان سے اس کا اقرار کرے یا نہ کرے۔

آیت نمبر ۲: اس آیت میں اللہ ﷻ کی صفت قدرت کا بیان ہے۔ مٹی سے انسان کی تخلیق اور مرنے کے بعد دوبارہ زندگی کا بیان ہے۔ مٹی سے تخلیق فرمانے سے مراد یہ ہے کہ تمہارے باپ حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا فرمایا، جو تمہاری اصل ہیں۔ اس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے تم جو غذائیں کھاتے ہو، سب زمین کی مٹی سے پیدا ہوتی ہیں اور انہیں غذاؤں سے نطفہ بنتا ہے جو رحم مادر میں ٹھہر کر تخلیق انسانی کا سبب بنتا ہے۔ اس لحاظ سے تمہاری پیدائش مٹی سے ہوئی۔

علمی بات: پہلی "اَجَلِ" سے مراد پیدائش سے لے کر موت تک کا عرصہ ہے اور دوسری مدت "اَجَلِ مُّسَمًّی" سے انسان کی موت سے لے کر وقوع قیامت تک کی مدت مراد ہے۔ یعنی جیسے ہر فرد کا وقت اجل متعین ہے ایسے ہی عالَمِ دنیا کے خاتمے کے لئے بھی ایک وقت متعین ہے۔ جس طرح ایک وقت معین پر کسی فرد کی موت واقع ہو جاتی ہے اس طرح ایک وقت معین پر قیامت برپا ہو گی۔ نظامِ دنیا ختم کر دیا جائے گا اور اُخروی زندگی کا آغاز ہو جائے گا۔

آیت نمبر ۳: اس آیت میں اللہ ﷻ کی صفتِ علم کا بیان ہے کہ اللہ ﷻ انسان کے ظاہر و باطن سے واقف ہیں۔ اللہ ﷻ کا آسمان اور زمین کے معبود برحق ہونے کا بیان ہے یعنی صرف وہی عبادت کا حق دار ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ کے زمین و آسمان میں ہونے سے مراد یہ ہے کہ اللہ ﷻ خود تو عرش پر جلوہ فرما ہے۔ جس طرح اس کی شان کے لائق ہے۔ البتہ اس کے علم و احاطہ سے کوئی چیز باہر نہیں، وہ تمام مخلوقات کے ظاہری اور پوشیدہ کاموں سے باخبر ہے۔ اس سے کوئی چیز مخفی نہیں، نیز اس سے یہ بھی مراد یہ ہے کہ آسمانوں اور زمینوں میں معبودِ برحق وہی ہے لہذا صرف اسی کی عبادت کی جائے۔ آیت کے آخر میں اللہ ﷻ کے علم کا ذکر ہے کہ وہ ہر شے سے اتنا واقف اور اتنا باخبر ہے کہ کوئی چیز اس کے علم سے پوشیدہ نہیں۔ ہمارے دلوں کے پوشیدہ احساسات، ہماری زبانوں سے نکلے ہوئے کلمات اور ہماری چھوٹی بڑی نیکیاں اور بُرائیاں اس کے احاطہ علم میں ہیں۔

آیت نمبر ۴: ا۔ اس آیت میں حق سے اعراض کرنے والوں کو تنبیہ کی گئی ہے یعنی توحید کے واضح دلائل اور کھلی نشانیوں کے باوجود منکرین کا حق سے منہ پھیرنے کا بیان ہے۔ نیز یہ بھی بتایا گیا کہ جانتے بوجھتے نہ ماننے کی ٹھان لینے والوں کے لئے کوئی نشانی کارگر ثابت نہیں ہوتی۔

علمی بات: ان نشانیوں سے مراد وہ احکام بھی ہیں جو آیات کی صورت میں انبیاء کرام علیہم السلام پر اترتے رہے اور وہ معجزات بھی ہیں جو نبوت کی دلیل کے طور پر اللہ ﷻ نے عطا کیئے، اسی طرح کائنات میں پھیلی ہوئی اللہ ﷻ کے جلال و کبریائی اور قدرت کی بے شمار نشانیاں ہیں جو اللہ ﷻ کے وجود اور

اس کی وحدانیت کی دلیل ہیں۔ اس کے علاوہ دوسری ناگہانی آفتیں مثلاً زلزلہ، کڑک، قحط، وَبا، نافرمان قوموں پر عذاب وغیرہ سب اللہ ﷻ کی نشانیاں ہیں۔ ان ساری نشانیوں کی تفصیل قرآنِ حکیم میں جگہ جگہ ذکر کی گئی ہیں ۔ جیسے کہ سورۃ الروم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمہیں مٹی سے پیدا فرمایا پھر اب تم انسان ہو کر (زمین میں) پھیل رہے ہو۔ اور اسی کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہاری ہی جنس سے جوڑے پیدا فرمائے تاکہ تم ان کے پاس سکون پاؤ اور اُس نے تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا فرمادی یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرتے ہیں۔ اور اسی کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں اور زمین کا پیدا فرمانا اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا مختلف ہونا یقیناً اس میں نشانیاں ہیں علم والوں کے لئے۔ اور اسی کی نشانیوں میں سے ہے تمہارا رات اور دن کو سونا اور تمہارا اُس کے فضل (یعنی رزق) کو تلاش کرنا یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو (غور سے) سنتے ہیں۔ اور اسی کی نشانیوں میں سے ہے کہ وہ تمہیں بجلی دکھاتا ہے ڈرانے اور امید دلانے کے لئے اور وہی آسمان سے پانی نازل فرماتا ہے تو اسی سے زمین کو اس کے مُردہ (یعنی خشک) ہو جانے کے بعد زندہ فرماتا ہے یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل رکھتے ہیں۔ اور اسی کی نشانیوں میں سے ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں پھر جب وہ تمہیں ایک بار پکارے گا زمین سے (تو) تم اُسی وقت (اپنی قبروں سے) نکل پڑو گے۔" (سورۃ الروم ۳۰، آیات: ۲۰ تا ۲۵)۔

آیت نمبر ۵: اس آیت میں حق سے مراد قرآنِ حکیم اور صاحبِ قرآن یعنی نبی کریم ﷺ دونوں ہیں۔ خبر کے لئے "انباء" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ انباء جمع ہے نباء کی۔ جس کا معنی ہے اہم اور اثر انگیز خبر، حقیقی و یقینی خبر۔ یہاں اس سے مراد عذاب الٰہی ہے۔ جو پے در پے شکستوں اور ناکامیوں کی صورت میں دیا گیا اور جو عذاب آخرت میں کفار و مشرکین کو دیا جائے گا۔

علمی بات: آیات ۴، اور ۵ میں اللہ ﷻ نے مشرکین مکہ کے انکار اور کفر کے تین احوال بیان فرمائے ہیں۔ پہلے پہل انہوں نے اللہ ﷻ کی نشانیوں سے منہ موڑا۔ پھر اس کے بعد انہوں نے ان نشانیوں کو جھٹلایا اور سب سے آخر میں انہوں نے ان نشانیوں کا مذاق اڑایا اور یہ ان کے کفر اور انکار کی انتہاء تھی۔

علمی بات: مشرکین کو متنبہ کیا گیا ہے کہ دین کی باتوں کا مذاق اُڑانا اور اُن کے جھٹلانے کا انجام عنقریب اُن کے سامنے آجائے گا۔ ایسے لوگوں کے انجام کے بارے میں مفسرین کرام کی دو آراء ہیں:

۱۔ اس سے مراد دنیا کا عذاب بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ جنگ بدر میں مشرکین مکہ کو شکستِ فاش ہوئی اور ان کو اپنی عددی برتری اور طاقت کا جو گھمنڈ تھا وہ خاک میں مل گیا۔ ۲۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد قیامت یعنی آخرت کی دائمی جزا و سزا ہو۔

آیت نمبر ۶: اس آیت میں مشرکین کو گرد و پیش کے حالات اور گزشتہ اقوام سے عبرت حاصل کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ ان کفار سے پہلے کئی بڑی قومیں گزری ہیں جن کی نافرمانی کی وجہ سے ان پر اللہ ﷻ کا عذاب نازل ہوا۔ مثلاً، قوم نوح علیہ السلام، قوم عاد، قومِ ثمود، قومِ لوط علیہ السلام، قومِ شعیب علیہ السلام اور آلِ فرعون وغیرہ۔ ان اقوام کا ذکر سورۃ الاعراف میں کیا گیا ہے جو سورۃ الانعام کے بعد ہے۔

مشرکین کو سابقہ گمراہ قوموں کے عبرتناک انجام کے ذکر کے ذریعے خبردار کیا جارہا ہے کہ یہ عاد و ثمود کی ویران بستیاں جن کو تم بارہا دیکھ چکے ہو یہاں کے بسنے والے تم سے زیادہ خوشحال تھے، مال و دولت کی فراوانی تھی، انہیں وسیع و عریض خطہ زمین پر اختیار حاصل تھا۔ ان کے ملک میں ٹھنڈے اور میٹھے پانی کی نہروں کا جال بچھا ہوا تھا۔ ان کے کھیت نہایت سرسبز و شاداب تھے اور ان کے گھر بہت ہی مضبوط بنے ہوئے تھے۔ لیکن جب انہوں نے دعوتِ توحید کو ٹھکرا کر اللہ ﷻ کی حدوں کو پامال کرنا شروع کیا تو ان کے گناہوں کی وجہ سے ایسا عذاب آیا جس نے ان کو نیست و نابود کر کے نشانِ عبرت بنا دیا۔

علمی بات: ۱۔ کسی قوم کی محض مادی ترقی اور خوش حالی سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ بہت کامیاب و کامران ہے۔ دراصل یہ بطور امتحان اللہ ﷻ قوموں کو عطا فرماتا ہے اور ان کی سرکشی کے باوجود ڈھیل دیتا ہے۔ لیکن جب توبہ کی مہلت بھی ختم ہو جاتی ہے تو پھر یہ ترقی اور خوش حالی انہیں اللہ ﷻ کے عذاب سے بچا نہیں سکتی۔ سابقہ قوموں کو پیغمبروں کی تکذیب اور نافرمانیوں کی پاداش میں ہلاک کر دیا گیا۔

عملی پہلو: ا۔ سابقہ قوموں کے احوال ہمارے لئے درس عبرت ہیں۔ جنہیں قوت و دولت اور کثرت مال و عیال کے باوجود کفر و سرکشی کی وجہ سے ہلاک کر دیا گیا۔ اس میں ہمارے لئے بھی یہ سبق ہے کہ جب تک ہم احکام الٰہیہ کے پابند رہیں گے اور ہماری صلاحیتیں خیر کے کاموں میں صرف ہوں گی۔ تب تک ہم عزت واقتدار کے مستحق رہیں گے اور جب بھی ہم مال و دولت، اقتدار اور عیش و عشرت کے دلدادہ بن گئے تو پھر ذلّت و پستی ہمارا مقدر ٹھہرے گی۔

آیت نمبر ۷: شانِ نزول: مشرکین مکہ میں عبداللہ بن ابی امیہ اور نضر بن حارث اور نوفل بن خویلد وغیرہ نے کہا اے محمد! (ﷺ) ہم آپ پر اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ آپ ہمارے پاس اللہ ﷻ کے پاس سے کتاب نہ لائیں اور اس کتاب کے ساتھ چار فرشتے ہوں جو یہ گواہی دیں کہ یہ کتاب اللہ ﷻ کی جانب سے ہے اور آپ ﷺ اللہ ﷻ کے رسول ہیں۔ تب یہ آیت نازل ہوئی۔

علمی بات: ا۔ مشرکینِ مکّہ نے قرآنِ حکیم کو کتابی صورت میں نازل فرمانے کی فرمائش کی۔ کفار کی ہٹ دھرمی کا بیان ہے کہ آسمان سے کتاب اتار بھی دی جائے اور وہ اسے چھو بھی لیں تب بھی یہ لوگ اسے نظر بندی یا جادو قرار دیں گے۔ (معاذاللہ)

۲۔ رسول اللہ ﷺ کی دعوتِ توحید اور پیغام اسلام کو مسترد کرنے والے دو قسم کے لوگ تھے۔ ایک وہ جو عیش و آرام کے دلدادہ تھے اور ان کو اپنی قوت و حشمت پر گھمنڈ تھا۔ ان کا ذکر اس سے پہلی آیتوں میں آچکا ہے۔ دوسری قسم کے لوگ وہ تھے جو نبی کریم ﷺ کے پیش کیئے ہوئے معجزات کو کھلا ہوا جادو قرار دیتے تھے۔ ان کا ذکر اس آیت میں ہے۔

۳۔ حقیقت میں کفار کے انکار اور تکذیب کی وجہ یہ تھی کہ وہ اللہ ﷻ کی نشانیوں سے اعراض کرتے تھے اور عناد و تکبر کی وجہ سے ان میں غور و فکر نہیں کرتے تھے۔ اس لئے اگر اللہ ﷻ ایک لکھی ہوئی کتاب نازل کر دیتا اور یہ لوگ اس کو چھو کر دیکھ بھی لیتے، پھر بھی کہتے کہ یہ کھلا جادو ہے اور ایمان نہ لاتے۔ ہاتھ سے چھونے کا اس لئے ذکر فرمایا کہ کبھی دیکھی ہوئی چیز کی بہ نسبت ہاتھوں سے چھوئی ہوئی چیز زیادہ یقینی ہوتی ہے، کیونکہ مشاہدہ میں یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ نظر نے دھوکا کھایا ہو یا نظر بندی کی گئی ہو۔ لیکن ہاتھ سے چھونے کے بعد یہ احتمال بھی ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ ایسے ضدی اور ہٹ دھرم لوگ ہیں کہ یہ پھر بھی ایمان نہیں لائیں گے۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر ان کی اسی ہٹ دھرمی کو یوں بیان کیا گیا: "اور اگر ہم ان کے لئے آسمان میں کوئی دروازہ کھول دیں اور یہ اس میں (دن بھر) چڑھتے رہیں (تو پھر بھی) یہ لوگ یقیناً یہی کہیں گے کہ محض ہماری نظر بندی کی گئی ہے، بلکہ ہم لوگوں پر جادو کیا ہوا ہے۔" (سورۃ الحجر ۱۵، آیات: ۱۴، ۱۵)

آیت نمبر ۸: اس آیت میں مشرکین مکہ کا رسول ﷺ سے فرشتوں کے ان کی اصلی شکل میں اُتارے جانے کے مطالبہ کا بیان ہے۔ مشرکین کو فرشتوں کے نزول کے بعد انکار پر مہلت ختم ہو جانے کی تنبیہ کی گئی ہے۔

علمی بات: فرشتوں کو نہ بھیجنے کی حکمت یہ ہے کہ اللہ ﷻ کی سنت ہے کہ جب کوئی غیبی حقیقت آنکھوں سے دکھا دی جائے تو اس کے بعد ایمان لانا معتبر نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص موت کے فرشتوں کو دیکھ کر ایمان لائے تو اس کا ایمان قابل قبول نہیں، لہذا فرشتے کو دیکھ لینے کے بعد ان کا ایمان معتبر نہیں ہوگا اور پھر انہیں اتنی مہلت نہیں ملے گی کہ یہ ایمان لا سکیں۔ نیز یہ بھی قانونِ الٰہی ہے کہ جب کوئی قوم کسی نشانی کا مطالبہ کرے بعد ازاں اس مطالبہ پر وہ نشانی بھیج دی جائے پھر بھی وہ ایمان نہ لائیں تو اللہ ﷻ اس قوم کو فی الفور ہلاک کر دیتا ہے۔ اور ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اگر اللہ ﷻ فرشتے کو ان کے پاس رسول بنا کر بھیجتا تو اگر وہ اپنی اصل صورت میں ان کے پاس آتا تو وہ نہ اس کو دیکھ سکتے نہ اس کا کلام سن سکتے اور نہ ہی اس کی عبادات اور معمولات ان کے لئے قابلِ عمل اور حجت ہوتے۔ کیونکہ دونوں جنس کے اعتبار سے الگ ہیں اور اگر وہ فرشتہ انسانی شکل میں آتا تو اس سے کہتے کہ تم کوئی فرشتہ نہیں ہو بلکہ ہماری ہی طرح انسان ہو اور پھر ان کا وہی مطالبہ اور اعتراض پلٹ آتا۔

علمی بات: انبیاء کرام علیہم السلام کے پاس بھی فرشتے بعض اوقات انسانی شکل میں آتے تھے۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کے پاس فرشتے انسانی صورتوں میں آئے اور نبی کریم ﷺ کے پاس حضرت جبرائیل علیہ السلام۔ البتہ آپ ﷺ کی خصوصیت ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو ان کی اصل شکل میں بھی دیکھا۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو ان کی اصل صورت میں دیکھا تھا جن کے چھ سو پر تھے۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی)

آیت نمبر ۹: اس آیت میں قریش مکہ کا فرشتہ کو رسول بنا کر نہ بھیجے جانے پر اعتراض کا بیان ہے۔ ان کے اعتراض کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی فرشتے ہی کو پیغمبر علیہ السلام بنا کر بھیجتا، یا پیغمبر علیہ السلام کی تصدیق کے لئے لوگوں کے سامنے کسی فرشتے کو بھیجتا تب بھی اس کو انسانی شکل ہی میں بھیجا جاتا کیونکہ کسی انسان میں یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ کسی فرشتے کو دیکھ سکے۔ اس صورت میں پھر یہ کافر لوگ وہی اعتراض دہراتے کہ یہ تو ہم جیسا ہی آدمی ہے اس کو ہم پیغمبر کیسے مان لیں۔

نوٹ: اگر فرشتوں کو اللہ تعالیٰ رسول بنا کر بھیجتا تو ان کے معاملات واحساسات اور معمولاتِ زندگی انسانوں سے مختلف ہوتے۔ ایسی صورت میں انسانوں کی رہنمائی کی ذمہ داری اُٹھانا اور لوگوں کے لئے عملی نمونہ بننا ممکن نہ ہوتا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کا انسانوں پر ایک بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے انسانوں کو ہی نبی اور رسول بنایا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اسے بطور احسان کے قرآنِ حکیم میں ذکر فرمایا ہے "یقیناً اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر احسان فرمایا کہ ان لوگوں میں انہی میں سے ایک رسول ﷺ بھیجا۔" (سورۃ الِ عمران ۳، آیت: ۱۶۴)

علمی بات: حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کے پاس جو مہمان آئے تھے وہ انسانی شکل وصورت میں آئے تھے، حضرت مریم علیہا السلام کے پاس بھی حضرت جبرائیل علیہ السلام انسانی شکل وصورت میں آئے تھے، اسی طرح نبی کریم ﷺ کے پاس حضرت جبرائیل علیہ السلام انسانی شکل میں آتے تھے جیسا کہ ایک طویل حدیث میں بھی حضرت جبرائیل علیہ السلام کی آپ ﷺ سے ملاقات کا ذکر ہے جو "حدیثِ جبرائیل علیہ السلام" کے نام سے مشہور ہے۔ البتہ نبی کریم ﷺ نے دو مرتبہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کو ان کی اصلی شکل میں بھی دیکھا۔ یہ صرف آپ ﷺ کی خصوصیت اور فضائل میں سے ہے۔

آیت نمبر ۱۰: اس آیت میں نبی کریم ﷺ کی یہ دل جوئی فرمائی گئی ہے کہ کفار مکہ کے بار بار مطالبہ کی وجہ یہ ہے کہ آپ ﷺ دین کی دعوت دینا ہی چھوڑ دیں۔ اگر یہ نہیں مان رہے تو پہلے بھی بہت سے لوگوں نے نہیں مانا اور جنہوں نے پیغمبر علیہ السلام کے بات نہیں مانی وہ ہلاک کیئے گئے تو آپ ﷺ تسلی رکھیں کہ جو نہیں مانے گا وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب میں مبتلا کیا جائے گا۔ یعنی سابقہ انبیاء کرام علیہم السلام کی قوموں نے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا تھا۔ جیسے آج مشرکین مکہ ہٹ دھرمی کر کے حق سے اعراض کر رہے ہیں، ایسے ہی پہلے بھی انبیاء کرام علیہم السلام کی بات سے اعراض کیا گیا۔ اس لئے نبی کریم ﷺ کو پچھلے واقعات بیان کر کے تسلی دی جارہی ہے۔

علمی بات: ۱۔ معجزات کے حوالے سے پہلی اقوام کے لوگ بھی انبیاء کرام علیہم السلام سے ایسے ہی مطالبات کرتے تھے۔ جیسا کہ حضرت صالح علیہ السلام کی قوم نے حضرت صالح علیہ السلام سے پہاڑ سے زندہ اُونٹنی نکالنے کا جو مطالبہ کیا، جب قوم کے مطالبہ پر اللہ تعالیٰ نے پہاڑ سے ایک زندہ اونٹنی نکال کر دکھادی تو قوم کے لوگوں نے اس اُونٹنی کی ٹانگیں کاٹ کر اُسے ہلاک کر دیا۔

۲۔ کفار مکہ نبی کریم ﷺ سے مختلف معجزات طلب کرتے تھے جن کا ذکر سورۃ بنی اسرائیل کی آیات ۹۰ تا ۹۳ میں ہے "اور انہوں نے کہا ہم ہرگز آپ کی بات نہ مانیں گے یہاں تک کہ آپ ہمارے لئے زمین سے کوئی چشمہ جاری کر دیں۔ یا آپ کے لئے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو پھر آپ اس کے درمیان بہت سی نہریں جاری کر دیں۔ یا آپ آسمان کو ہم پر ٹکڑے ٹکڑے کر کے گرا دیں جیسا کہ آپ کا خیال ہے یا آپ اللہ کو اور فرشتوں کو (ہمارے) سامنے لے آئیں۔ یا آپ کے لئے سونے کا ایک گھر ہو یا آپ آسمان پر چڑھ جائیں اور ہم آپ کے چڑھنے کو بھی نہ مانیں گے یہاں تک کہ آپ ایک کتاب اُتار لائیں جسے ہم خود پڑھیں، آپ فرمادیجئے میرا رب پاک ہے میں تو ایک انسان (اور) رسول ہوں۔"

۳۔ نبی کریم ﷺ کو مزید یہ تسلی دی گئی ہے کہ اللہ ﷻ کے عذاب کا مذاق اڑانے والے عنقریب اللہ ﷻ کی گرفت میں آئیں گے۔

آیت نمبر ۱۱: اس آیت میں مشرکین کو تباہ شدہ اقوام کے کھنڈرات نگاہ عبرت سے دیکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔یعنی جو قومیں تباہ ہو گئیں ان کے کچھ کھنڈرات باقی ہیں اور مشرکینِ مکّہ کے تجارتی سفر کے دوران راستے میں وہ علاقے بھی آتے تھے۔ لہٰذا ان کے مقامات کو دیکھ کر عبرت حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ اللہ ﷻ کی آیات کو جھٹلانے والوں کا انجام صاف اور کھول کر بیان کیا گیا ہے۔ مشرکین کو خبردار کیا جارہا ہے کہ جو کوئی دعوت حق کو جھٹلائے گا تو بالآخر ایسے لوگوں کا انجام سابقہ جھٹلانے والی قوموں جیسا ہی ہو گا۔

آیت ۱۲ نمبر: اس آیت میں توحید کے دلائل اور قیامت کے دن اٹھائے جانے کا بیان ہے۔ پھر اللہ ﷻ کے مالک حقیقی ہونے اور اس کی صفت رحمت کا بیان ہے۔

علمی بات: ۱۔ اللہ ﷻ کی رحمت کا معنی یہ ہے کہ وہ نیکی کی توفیق کے بعد اس پر ثواب عطا فرما کر اپنے بندے کو راحت عطا فرمائے اور اللہ ﷻ کے غضب کا معنی یہ ہے کہ وہ فاسقوں اور نافرمانوں کو عذاب میں مبتلا کر کے مصیبت سے دوچار کرے۔

۲۔ یہ اللہ ﷻ کی عمومی رحمت کا نتیجہ ہے کہ ہم سب زندہ ہیں ورنہ ہمارے اخلاق و اعمال اتنے بُرے اور نافرمانیاں اس قدر حد سے بڑھی ہوئی ہیں کہ ایک لمحہ بھی زندہ رہنے کے قابل نہیں ہیں۔ دنیا میں ایسی مجرم قومیں بھی موجود ہیں جو سرے سے رب کے وجود کا انکار کرتی ہیں۔ مگر اس کے باوجود وہ انہیں رزق دیتا ہے۔ یہ سب اللہ ﷻ کی عمومی رحمت کا نتیجہ ہے۔

فرمان نبوی ﷺ: حدیث قدسی ہے: "بے شک میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے" (صحیح مسلم، صحیح بخاری، مسند احمد، سنن ابن ماجہ) اس طرح ایک اور حدیث مبارک میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ ﷻ نے اپنی رحمت کو سو حصّوں میں تقسیم فرمادیا ہے جس میں سے ننانوے اس کے پاس ہیں اور ایک حصہ اس نے زمین پر اُتارا ہے، اسی ایک حصے کی وجہ سے مخلوق ایک دوسرے سے اچھائی سے پیش آتی ہے یہاں تک کہ گھوڑا اپنے بچے پر پاؤں نہیں مارتا اس اندیشے کے تحت کہ اسے کوئی نقصان نہ ہو جائے۔ (صحیح بخاری، سنن دارمی)

علمی بات: یہ دنیا دارالامتحان ہے۔ اس دنیا میں بھی اللہ ﷻ کی رحمت کے سوویں حصّے میں سے مسلمانوں کو اسلام، ایمان، قرآنِ حکیم، نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے ذریعے شریعت مطہرہ حاصل ہوئی اور مسلمانوں کے دلوں میں رحم کا جذبہ، نیکی، صلہ رحمی اور غریب پروری اس ایک حصّہ کی مرہونِ منّت ہے تو بقیہ ننانوے رحمتوں کی وسعت اور گہرائی کے متعلق کوئی شخص تصور بھی کر سکتا ہے؟ جو رحمتیں آخرت میں حاصل ہوں گی اور ہمیشہ کے لئے ہوں گی۔ رحمت کا بھرپور اور کامل ظہور فرماں برداروں کے لئے آخرت میں ہو گا۔ یعنی دنیا میں بھی اللہ ﷻ کی رحمتِ عمومی کی وجہ سے کافروں کو بھی مل رہا ہے لیکن رحمتِ خاصّہ کا ظہور فقط ایمان والوں کے لئے آخرت میں ہو گا۔

فرمان نبوی ﷺ: حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں قیدی پیش کیئے گئے قیدیوں میں سے ایک عورت کسی کو تلاش کر رہی تھی۔ اچانک اس نے قیدیوں میں اپنے بچہ کو دیکھا، اس نے بچے کو اپنے پیٹ سے چمٹا لیا اور اس کو دودھ پلایا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے ہم سے فرمایا تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا یہ عورت اپنے بچہ کو آگ میں ڈال دے گی؟ ہم نے کہا نہیں، اللہ کی قسم اگر آگ میں ڈالنا اس کے لئے مقدور ہو تو یہ اپنے بچہ کو کبھی آگ میں نہیں ڈالے گی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ اپنے بچہ پر جس قدر رحم کرنے والی ہے، اللہ ﷻ اپنے بندوں پر اس سے کہیں زیادہ رحم فرمانے والا ہے۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

علمی بات: اللہ ﷻ سب اولین و آخرین کو قیامت کے دن زندہ کر کے جمع فرمادیں گے۔ روزِ قیامت اللہ ﷻ کی رحمت سے وہ لوگ محروم ہوں گے جنہوں نے کفر اختیار کیا۔ یعنی اللہ ﷻ کی رحمت تو سب کے لئے تھی لیکن کفار و مشرکین رحمتِ خاصّہ سے اپنے کفر کی وجہ سے محروم ہوئے۔ خسارے

میں وہ بدنصیب لوگ مبتلا ہوتے ہیں جو اپنی فطرت اسلام اور عقل سلیم سے کام نہیں لیتے اور بغض وعناد اور تعصب وہٹ دھرمی کی پٹی باندھے گمراہی میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ گویا وہ نور ایمان سے محروم ہو کر اپنے آپ کو خسارے میں ڈال دیتے ہیں۔

آیت نمبر ۱۳: شان نزول: کفار نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ آپ علیہ السلام نادار ہیں۔ مال و دولت جمع کرنے کے لئے آپ علیہ السلام نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ جس سے ہر گھر میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑک گئی ہے (معاذاللہ)۔ اس لئے آپ علیہ السلام جس قدر دولت چاہیں ہم آپ علیہ السلام کے قدموں میں لا کر ڈھیر کر دیں گے۔ آپ علیہ السلام اپنے دین کی تبلیغ سے باز آجائیں اور ہمارے آباؤ اجداد کی طرح بتوں کی پوجا کریں تو اس پر اللہ ﷻ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ رات اور دن میں جو چیز بھی متحرک ہے یا ساکن، یا جو چیز بھی سکونت پذیر ہے، وہ سب اللہ ﷻ ہی کی ملکیت ہے۔

اس آیت میں توحید کے دلائل کا بیان ہے۔ نیز بتایا گیا ہے کہ دن اور رات میں جو کچھ بھی متحرک یا غیر متحرک ہے وہ اللہ ﷻ ہی کی ملکیت اور اسی کے قانون کے تابع ہے۔ اللہ ﷻ ہر امر سے بخوبی واقف ہے۔

عملی پہلو: یہ چیزیں گزشتہ آیت میں شامل الفاظ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ کے تحت داخل ہیں لیکن پھر بھی الگ سے ان کا ذکر فرمایا گیا ہے کیونکہ یہ چیزیں ہر وقت مخاطبین کے سامنے ہیں اور خود مخاطبین بھی اس میں شامل ہیں جو کچھ نظر کے سامنے ہو اس کو دیکھ کر زیادہ مشاہدہ اور عبرت حاصل ہوتی ہے۔

علمی بات: رات اور دن کے ذکر میں غالباً اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان اوقات میں جب لوگ سو کر بیدار ہوتے ہیں تو سونے کی حالت میں انسان دنیا سے بے خبر اور لاتعلق ہو جاتا ہے اور اس پر چھوٹی موت طاری ہوتی ہے۔ اور اللہ ﷻ جب چاہتا ہے اسے بیداری کی دنیا میں واپس لے آتا ہے۔ اسی طرح جب اصل موت آئے گی تب بھی انسان اللہ ﷻ کے قبضہ قدرت میں ہو گا اور وہ قیامت میں جب چاہے گا اسے دوبارہ زندگی دے کر یوم حساب کی طرف لے جائے گا۔

آیت نمبر ۱۴: ا۔ اس آیت میں اللہ ﷻ کے سوا کسی دوسرے کو کارساز بنانے کی نفی کی گئی ہے۔ فرمایا گیا ہے اے نبی ﷺ! آپ فرما دیجئے کہ کیا میں اللہ ﷻ کے سوا کسی غیر کو اپنا والی یعنی مددگار اور معبود بناؤں یقیناً ہرگز ایسا نہیں کروں گا۔

علمی بات: بعض علماء لغت کے نزدیک فاطر کے معنی کسی نمونہ و مثال کے بغیر کسی چیز کو پیدا کرنا ہے، مقصد یہ ہے کہ اللہ ﷻ نے زمین اور آسمانوں کی تخلیق کسی مادی اسباب کے بغیر کی ہے۔

آیت نمبر ۱۵: بڑے دن سے قیامت کا دن مراد ہے۔ نبی کریم ﷺ کے ذریعہ اُن لوگوں کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ اگر انہوں نے گناہوں کی روش نہ چھوڑی تو وہ روزِ قیامت اللہ ﷻ کے عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ آپ ﷺ کو مخاطب فرما کر امت کو خطاب کرنے میں یہ حکمت ہے کہ جب نبی کریم ﷺ جو معصوم عن الخطاء ہیں جن کی شفاعت کی وجہ سے گنہگار بخشے جائیں گے جب وہ بھی اللہ ﷻ کی نافرمانی کرنے پر عذاب سے ڈرتے ہیں تو عام مسلمانوں کو اللہ ﷻ سے کتنا زیادہ ڈرنا چاہیئے۔

آیت نمبر ۱۶: اس آیت میں کفر و شرک کی غلاظتوں سے بچنے اور اللہ ﷻ کی رحمت کے امیدوار بن جانے کی تلقین کی گئی ہے۔

علمی بات: مغفرت، نجات اور دخول جنت کا سبب اللہ ﷻ کا فضل ہے نہ کہ محض اعمال کیونکہ اعمال صالحہ کی توفیق بھی اللہ ﷻ کے فضل سے ہی ملتی ہے۔

اللہ ﷻ کے فضل کے حوالہ سے چند احادیث نبوی ﷺ: ا۔ تم میں سے کسی شخص کو اس کا عمل جنت میں ہرگز داخل نہیں کرے گا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا یا رسول اللہ (ﷺ)! آپ کو بھی نہیں؟ فرمایا مجھ کو بھی نہیں سوائے اس کے کہ اللہ ﷻ مجھے اپنے فضل اور رحمت سے ڈھانپ لے۔ (صحیح مسلم، صحیح بخاری، سنن ابن ماجہ، مسند احمد)

۲۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کچھ لوگوں کو ان کے گناہوں کی سزا دینے کے لئے جہنم میں ڈال دیا جائے گا، ان کے جسموں پر آگ کے نشان ہوں گے، پھر اللہ ﷻ اپنے فضل اور رحمت سے ان کو جنت میں داخل کر دے گا، ان کو جہنمیین کہا جائے گا۔ (صحیح بخاری، مسند احمد)

۳۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس مسلمان کے بھی تین نابالغ بچے فوت ہو جائیں، اس مسلمان کو اللہ ﷻ اپنے فضل اور رحمت سے جنت میں داخل کر دیں گے۔ (صحیح بخاری، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، مسند احمد)

علمی بات: بلند مقام حاصل کرنا تو بہت بڑی بات ہے، اگر کسی سے آخرت کا عذاب ہی ٹل جائے تو اپنی جگہ یہی بات کافی ہے۔ لیکن سب سے بڑی کامیابی آخرت کے خسارہ سے بچ جانا اور دائمی نفع حاصل کرنا ہے۔ یعنی اصل کامیابی تو آخرت کی کامیابی ہے۔ دُنیا کی بڑی سے بڑی کامیابیاں اس دن کی کامیابی کے سامنے کوئی وقعت نہیں رکھتیں۔ اس کامیابی کے سامنے دنیوی دولت، عزت، شہرت اور اقتدار وغیرہ ساری چیزیں کمتر اور فانی ہیں۔

آیت نمبر ۱۷: اللہ ﷻ کے سوا کوئی کسی کو نہ معمولی نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ ہی معمولی نقصان۔ اللہ ﷻ اپنے بندوں پر قادر ہے اور سب اس کے ماتحت ہیں۔

فرمان نبوی ﷺ: رسول اللہ ﷺ فرض نماز کے بعد یہ دعا مانگا کرتے تھے۔

اَللّٰھُمَّ لَا مَانِعَ لِمَآ اَعْطَیْتَ وَ لَا مُعْطِیَ لِمَا مَنَعْتَ وَ لَا یَنْفَعُ ذَاالْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ "اے اللہ! جو کچھ تو عطا فرمائے اس کا کوئی روکنے والا نہیں اور جو کچھ تو روک لے اس کا کوئی دینے والا نہیں اور کسی مالدار کو اس کی مالداری تیرے مقابلہ میں نفع نہیں دے سکتی۔" (صحیح مسلم)

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں ایک دن رسول اللہ ﷺ کے پیچھے تھا آپ ﷺ نے فرمایا اے لڑکے! اس کا یقین رکھ کہ اگر ساری امت اس مقصد کے لئے جمع ہو جائے کہ تجھے کچھ نفع پہنچا دے تو اس کے سوا کچھ نفع نہیں پہنچا سکتی جو اللہ ﷻ نے تیرے لئے لکھ دیا ہے اور اگر ساری امت اس مقصد کے لئے جمع ہو جائے کہ تجھے کچھ ضرر پہنچا دے تو اس کے سوا کچھ ضرر نہیں پہنچا سکتی جو اللہ ﷻ نے تیرے لئے لکھ دیا ہے۔ (جامع ترمذی، سنن ابو داؤد)

عملی پہلو: ہمیں اپنی ہر مشکل و پریشانی، بیماری و تنگی میں اللہ ﷻ کی طرف رجوع کرنا چاہیئے کیونکہ اس کے سوا کوئی بھی تکلیف دور کرنے والا نہیں۔

آیت نمبر ۱۸: اللہ ﷻ بندوں کے حالات سے خوب آگاہ ہے۔ وہ ہر چیز پر غالب ہے اور تمام کائنات اسی کی مطیع اور فرماں بردار ہے۔

علمی بات: قہر سے مُراد یہاں پر ظلم و زیادتی نہیں، جیسا کہ محاورۃً بولا اور سمجھا جاتا ہے بلکہ قہر سے مراد یہاں غلبہ و کامل اختیار ہے وہ اپنے بندوں پر پوری طرح غالب و حاوی اور ان پر مکمل اختیار رکھنے والا ہے۔

نوٹ: لفظ "قاہر" سے اللہ ﷻ کی قدرت کاملہ کا اور لفظ "حکیم" سے اس کے تمام افعال کا مبنی بر حکمت ہونا اور خبیر سے علم محیط کا بیان کیا گیا۔ ان صفات کے ذکر سے بتلانا یہ مقصود ہے کہ یہ صفات اللہ ﷻ کے کمال علم و قدرت کا مظہر ہیں۔ اللہ ﷻ غلبہ و تسلط رکھنے کے باوجود اپنی مخلوق کے معاملے میں حکمت کاملہ کا اظہار فرماتا ہے کیونکہ حکیم کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔

آیت نمبر ۱۹: اللہ ﷻ ہی معبود حقیقی ہے اور ہر قسم کے شرک سے پاک ہے۔ نبی کریم ﷺ کے رسول برحق ہونے کا سب سے بڑا گواہ خود اللہ ﷻ ہے۔ اللہ ﷻ کی گواہی سے مراد وہ آیات، بیّنات اور معجزات ہیں جو رسول ﷺ کے برحق ہونے کے لئے بطورِ ثبوت عطا فرمائیے گئے۔ نزول قرآن حکیم کا ایک اہم مقصد یہ ہے کہ اس کی تعلیمات اور احکام ہر اس شخص تک پہنچے جو آپ ﷺ کی اُمّت میں شامل ہے۔ اب یہ ذمہ داری تمام اُمّتِ مسلمہ کی ہے۔ جیسا کہ سورہ آل عمران ۳، آیت: ۱۱۰ میں بتایا گیا کہ "تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے بھیجی گئی ہو (یعنی پیدا کی گئی ہو)، تم اچھے کاموں کا حکم کرتے ہو اور برے کاموں سے منع کرتے ہو، اور اللہ ﷻ پر ایمان لاتے ہو۔"

شانِ نزول: ایک مرتبہ اہل مکہ کا ایک وفد نبی کریم ﷺ کے پاس آیا، اور کہنے لگا کہ آپ جو "اللہ کے رسول" ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اس پر آپ کا گواہ کون ہے؟ کیونکہ ہمیں کوئی آدمی ایسا نہیں ملا جو آپ کی تصدیق کرتا ہو، حالانکہ ہم نے یہود و نصاریٰ سے اس کی تحقیق میں پوری کوشش صرف کی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

علمی بات: حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جس شخص کو قرآنِ حکیم پہنچ گیا وہ ایسا ہو گیا جیسے اس نے محمد ﷺ کی زیارت کر لی اور ایک حدیث مبارک میں ہے کہ جس شخص کو قرآنِ حکیم پہنچ گیا میں اس کا نذیر ہوں۔

فرمان نبوی ﷺ: ۱۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد ﷺ کی جان ہے اس امت میں سے جس کسی کو میرے نبی ہونے کی خبر پہنچے گی خواہ وہ یہودی یا نصرانی ہو اور وہ اس دین پر ایمان لائے بغیر مر گیا جو دین دے کر میں بھیجا گیا ہوں تو وہ ضرور دوزخ والوں میں سے ہو گا، خواہ یہودی ہو یا نصرانی۔ (صحیح مسلم)

۲۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ ﷻ اس شخص کو تر و تازہ اور صحت مند رکھے جس نے میری کوئی بات سنی پھر اس کو یاد رکھا پھر اس کو امت تک پہنچا دیا، کیونکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی خود کسی کلام کے مفہوم کو اتنا نہیں سمجھ پاتا جتنا بعد میں آنے والا سمجھتا ہے جس کو یہ کلام اس نے پہنچایا ہے۔

۳۔ رسول کریم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تاکید فرمائی یعنی میرے احکام و تعلیمات لوگوں تک پہنچاؤ اگرچہ ایک ہی آیت ہو۔ (سنن دارمی، ترمذی)

۴۔ حجۃ الوداع کے موقع پر تقریباً سوا لاکھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو خطاب کرتے ہوئے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا سنو! جو لوگ یہاں موجود ہیں انہیں چاہیئے کہ یہ باتیں غائبین تک پہنچا دیں کیونکہ بسا اوقات کوئی غیر موجود شخص تم سے زیادہ سمجھنے اور محفوظ رکھنے والا ہو سکتا ہے۔ بہر حال میں نے یہ امانت تم تک پہنچا دی ہے، اس کو آگے پہنچانا اب تمہاری ذمہ داری ہے۔ (صحیح بخاری)

آیت نمبر ۲۰: اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کی صداقت کا ثبوت ہے کہ اہل کتاب کی کتابوں میں موجود آخری نبی ﷺ کی تمام نشانیاں آپ ﷺ کی ذاتِ بابرکت میں مکمل طور پائی گئیں اسی وجہ سے اہلِ کتاب آپ ﷺ کی رسالت کو اپنے سگے بیٹے کی طرح پہچانتے تھے۔ اہل کتاب نے رسول اللہ ﷺ کو پہچاننے کے باوجود حسد کے مارے آپ ﷺ کی رسالت کا نکار کیا اور دنیا میں ذلیل و رسوا ہو کر آخرت کے دائمی خسارے میں پڑ گئے۔

علمی بات: حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کے بعد یہود آپ ﷺ کے پاس آئے۔ ان سے رسول اللہ ﷺ نے پوچھا عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ تم میں کیسے آدمی ہیں؟ انہوں نے کہا وہ ہم میں سب سے بڑے عالم ہیں اور سب سے بڑے عالم کے بیٹے ہیں اور ہم میں سب سے افضل ہیں اور سب سے افضل کے بیٹے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بتلاؤ اگر عبد اللہ رضی اللہ عنہ اسلام لے آئیں تو! انہوں نے کہا اللہ ﷻ اس کو اس سے پناہ میں رکھے۔ تب حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ ان کے سامنے آئے اور کہا "اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّداً رَّسُوْلُ اللّٰه "تو انہوں نے کہا یہ ہم میں سب سے بدتر شخص ہے اور سب سے بدتر شخص کا بیٹا ہے (معاذ اللہ)۔ (صحیح بخاری)

آیت نمبر ۲۱: اس آیت میں مشرکین کے دو سنگین ترین جرائم بیان کئے گئے ہیں: ۱۔ اللہ ﷻ کی آیات کو جھٹلانا یعنی سیدنا محمد ﷺ کی نبوت کے ثبوت پر اللہ ﷻ نے جو معجزات ظاہر فرمائے کفار و مشرکین نے ان کو جھٹلا دیا اور قرآنِ حکیم جو نبی کریم ﷺ کی نبوت پر سب سے بڑا معجزہ ہے، باوجود اس کے کہ وہ اس قرآن کے مقابلے میں ایک آیت بھی نہ لا سکے پھر بھی قرآنِ حکیم کو کھلا جادو کہا، کبھی شعر و شاعری سے تعبیر کیا اور کبھی گزرے ہوئے لوگوں کی قصّے اور کہانیوں سے اور کبھی کہا یہ محض ان کے فکری تخیُّلات ہیں (معاذ اللہ)۔ انہوں نے اس کے کلام الٰہی ہونے کا انکار کیا اور آپ ﷺ کی نبوت پر ایمان نہیں لائے۔ ۲۔ کوئی شے خود گھڑ کر اللہ ﷻ کی طرف منسوب کرنا یعنی اپنے کاموں کی تاویل کرتے ہوئے یہ کہتے کہ فلاں حکم اللہ ﷻ کی طرف سے ہے جبکہ وہ حکم ہرگز اللہ ﷻ کی طرف سے نازل کردہ نہیں ہوتا تھا۔

علمی بات: کفار مکہ اللہ ﷻ پر بہتان لگاتے تھے یہ کہہ کہ یہ بُت اللہ ﷻ کے شریک ہیں اور اللہ ﷻ نے ان کی عبادت کرنے اور ان کے ذریعہ تقرب حاصل کرنے کا حکم دیا ہے، نیز کفار مکہ کہتے تھے کہ فرشتے اللہ ﷻ کی بیٹیاں ہیں۔ یہود و نصاری بھی اللہ ﷻ پر بہتان لگاتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ان کی شریعتیں غیر منسوخ ہیں اور ان کے نبیوں کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا اور خصوصاً یہود یہ کہتے تھے کہ ہم اللہ ﷻ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں اور دوزخ کی آگ ہمیں صرف چند دن جلائے گی اور ان میں سے بعض جہلاء یہ کہتے تھے کہ اللہ ﷻ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں اور نصاری کا عقیدہ یہ تھا کہ اللہ ﷻ تین میں کا تیسرا ہے اور یہ عقیدہ تثلیث کہلاتا ہے۔ اور یہود و نصاری ان دونوں میں سے ہر ایک اس بات کا دعوے دار تھا کہ ان کے سوا اور کوئی جنت میں نہیں جائے گا اور یہ تمام باتیں اللہ ﷻ پر افتراء اور بہتان ہیں یعنی خود سے بنا کر اللہ س ﷻ کی طرف منسوب کرنا اور اللہ ﷻ اس سے پاک ہے۔

عملی پہلو: اللہ ﷻ پر جھوٹ باندھنے والا سب سے بڑا ظالم ہے۔ ایسے مجرمین کے لئے نجات نہیں ہے۔ شریعت کی نظر میں جھوٹ بولنا انتہائی قبیح گناہ ہے۔ اس جرم کی سنگینی میں اس وقت بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے جب کوئی شخص اپنے باطل نظریات کو اللہ ﷻ کی طرف منسوب کر کے اسے حق ثابت کرنے کی کوشش کرے۔ ایسا شخص نہ صرف پرلے درجے کا کذّاب شمار ہوتا ہے بلکہ اللہ ﷻ کے نزدیک بدترین ظالم سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ ذاتِ حق پر جھوٹ بول کر لوگوں کو گمراہی کا راستہ دکھانا انتہائی سنگین جرم ہے۔ ایسے ظالم آخرت میں ہر قسم کی مدد سے محروم ہوں گے اور دنیا میں بھی ناکامی اور ذلّت و رسوائی ان کا مقدر ٹھہرے گی۔

آیت نمبر ۲۲: اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ روز قیامت مشرکین سے ان کے باطل معبودوں کے بارے میں سوال ہو گا۔

علمی بات: محشر میں جمع ہونے کے بعد فوراً ہی سوال جواب نہیں ہو گا، بلکہ عرصہ دراز تک اس کے شروع ہونے کے انتظار میں کھڑے رہیں گے، ایک مدّت کے بعد تمام اُمّتوں کے حساب کتاب شروع ہوں گے۔ ایک حدیث مبارک میں رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ اس وقت تمہارا کیا حال ہو گا جب کہ اللہ ﷻ تم کو میدان حشر میں ایسی طرح جمع کر دیں گے جیسے تیروں کو ترکش میں جمع کر دیا جاتا ہے، اور تم پچاس ہزار سال اسی طرح رہو گے، اور ایک روایت میں ہے کہ قیامت کے روز ایک ہزار سال سب اندھیرے میں رہیں گے۔ آپس میں بات چیت بھی نہ کر سکیں گے (مستدرک الحاکم، بیہقی)

آیت نمبر ۲۳: اس آیت میں مشرکین کا معذرت پیش کر کے چھٹکارا حاصل کرنے کی بے فائدہ کوشش کا بیان ہے۔ "فتنہ" کے معنی حجت، معذرت، آزمائش وغیرہ کے ہیں۔ ایک رائے کے مطابق یہاں فتنہ کے معنی عذر اور بہانہ کے ہیں۔ باطل معبودوں کی سفارش کا اعتقاد رکھنے والے مشرک اپنے شرک سے روزِ قیامت مکر جائیں گے اور جھوٹ بولیں گے۔

نوٹ: جب میدان حشر میں مالک حقیقی کے دربار میں انہیں پیش کیا جائے گا اور وہ اللہ ﷻ کے غضب کا مشاہدہ کریں گے اور ان کے بتوں، معبودوں اور دیوی دیوتاؤں کا کہیں نام تک نہ ہو گا۔ تو جب ان سے سابقہ سوال پوچھا جائے گا تو مارے تعجب و حیرت کے کوئی جواب نہ بن پڑے گا۔ اس وقت وہ انکار اور جھوٹ کا سہارا لیں گے۔

علمی بات: مشرکین جب وہاں کا عذاب دیکھیں گے تو جھوٹ بول کر عذاب سے بچنے کی کوشش کریں گے جیسا کہ دنیا میں بعض مرتبہ اپنے افعال و اعمال کا انکار کر کے دنیاوی سزا سے چھٹکارا پا لیتے تھے۔ آخرت کے دن اللہ ﷻ کے سامنے ان کا جھوٹ نہ چل سکے گا کیونکہ اللہ ﷻ علیم و خبیر ذات ہے لیکن یہ پھر بھی اپنی ہٹ دھرمی سے اپنے قصور کا انکار کر دیں گے۔

آیت نمبر ۲۴: قیامت کے دن کی دہشت اور اپنی بے بسی پر مشرکین جھوٹ بولیں گے۔ مگر قیامت کے دن ان مشرکین کے تمام غلط عقائد بیکار ثابت ہو جائیں گے اور وہ بے بسی اور لاچاری کی تصویر بنے کھڑے ہوں گے۔

آیت نمبر ۲۵: اس آیت میں قریش کے سرداروں کی سازش کا بیان ہے۔ مشرکین قرآنِ حکیم کو بظاہر سنتے مگر حقیقتاً اس سے اعراض کرتے ہیں۔ اس ضد، اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے قبول حق سے محروم کر دیئے گئے۔ سرداران قریش کا قرآن حکیم کو (معاذاللہ) پُرانے قصے کہانیاں قرار دے کر منہ موڑ لینے کا بیان ہے۔

شانِ نزول: ایک مرتبہ ابوسفیان، ابوجہل، ولید بن مغیرہ، نضر بن حارث، عتبہ، شیبہ بن ربیعہ، حارث بن عامر، ابی بن خلف اور امیہ بن خلف نبی کریم ﷺ کے پاس جمع ہوئے۔ آپ ﷺ اس وقت قرآنِ حکیم کی تلاوت فرما رہے تھے ان لوگوں نے آپ ﷺ سے قرآنِ حکیم سنا پھر سب نے نضر بن حارث سے پوچھا کہ اے ابوقتیلہ کچھ سمجھ میں آتا ہے کہ محمد (ﷺ) کیا کہتے ہیں نضر نے کہا میں نہیں جانتا کہ کیا کہتے ہیں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ اپنی زبان کو ہلاتے ہیں اور پچھلے لوگوں کی کہانیاں بیان کرتے ہیں جیسے میں تمہیں گزشتہ لوگوں (یعنی رستم، اسفندیار اور اہل فارس وغیرہ) کے قصے سناتا ہوں ابوسفیان نے کہا میرے خیال میں اس کی بعض باتیں سچی معلوم ہوتی ہیں ابوجہل نے کہا ہرگز نہیں تو اس کی کسی بات کے سچا ہونے کا اقرار نہ کر، ہمیں مرنا قبول ہے مگر اس پر ایمان لانا قبول نہیں اس پر اللہ ﷻ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

عملی پہلو: جو لوگ اپنی بداعمالیوں کے سبب قابل ہدایت نہیں رہتے اللہ ﷻ ان پر اپنی رحمت و شفقت کا دروازہ بند کر دیتا ہے۔ اسی کو دلوں پر پردہ ڈالنے اور مہر لگانے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور یہ اللہ ﷻ کی سنّت ہے کہ جو اس کی ہدایت حاصل کرنے کی سعی کرتے ہیں ان کو ہدایت سے نوازتا ہے: "اور جن لوگوں نے ہمارے (راستے کے) لئے کوشش کی ہم ان کو ضرور اپنے راستے دکھادیں گے" (سورۃ العنکبوت ۲۹، آیت:۶۹) اور تزکیہ نفس کے ساتھ نجات و کامیابی ممکن ہے: "یقیناً جس نے اس (نفس) کو پاک کرلیا وہ کامیاب ہوگیا" (سورۃ الشمس ۹۱، آیت:۹) اس کے برخلاف جن لوگوں نے ضد اور تعصّب کی بنا پر انکار کیا وہ تمام نشانیاں دیکھ بھی لیں تب بھی ایمان نہیں لاتے۔

نوٹ: قرآن حکیم نے ہدایت پانے کا یہ اصول بیان کیا ہے کہ سننے والا پورے دھیان، دل کی توجہ اور حق بات قبول کرنے کی نیّت سے بات سنے تو یقیناً اللہ ﷻ اسے ہدایت سے بہرہ مند کرتا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے "یقیناً اس میں نصیحت ہے اس شخص کے لئے جو دل رکھتا ہو یا کان لگا کر سنتا ہو اور وہ حاضر ہو (دل و دماغ سے)۔" (سورۂ قٓ ۵۰، آیت:۳۷) لیکن منکرین حق کی شروع سے ہی یہ بری عادت ہے کہ سچی بات قبول کرنا تو درکنار اس کا سننا ہی ان کے لئے گرانی کا باعث ہوا کرتا ہے۔

علمی بات: مشرکوں کے شرک اور منافقوں کے نفاق کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ اللہ ﷻ کی آیات کو سمجھنے اور حق بات سننے کے بجائے کہتے ہیں کہ یہ ہماری سماعت پر ایک بوجھ ہے اور ہم اسے پہلے لوگوں کے قصے کہانیاں سمجھتے ہیں۔ ضد اور تعصب انسان کو اندھا اور بہرا کر دیتا ہے۔ پھر حالت یہ ہوتی ہے کہ ایسا انسان حق بات سننا اور سمجھنا ہی نہیں چاہتا۔

آیت نمبر ۲۶: سرداران قریش قبول حق سے دوسروں کو روکتے تھے اور خود بھی پہلو تہی کرتے تھے۔ یوں وہ دوہرے جرم کے مرتکب ہو رہے تھے۔ حق سے روکنے اور خود رکنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے انجام سے بے خبر اپنے ہی ہاتھوں اپنی تباہی و بربادی کا سامان کر رہا ہوتا ہے۔

عملی پہلو: بدترین لوگ وہ ہیں جو خود بھی ہدایت سے محروم رہتے ہیں اور دوسروں کو ہدایت سے محروم رکھنے کی مذموم کوشش کرتے ہیں۔

آیت نمبر ۲۷: قیامت کے دن کفار دنیا میں لوٹائے جانے کی حسرت کریں گے۔ اس روز کفار کو دنیا کی بے ثباتی اور اپنی بدعقیدگی کی قباحت کا شدت سے احساس ہوگا۔

فرمان نبوی ﷺ: "بے شک اللہ ﷻ اس وقت تک بندے کی توبہ قبول فرماتا رہتا ہے جب تک نزع کا عالم طاری نہ ہو۔" (ابن ماجہ)

عملی پہلو: انسان مصیبت اور عذاب کو دیکھ کر توبہ کرتا ہے لیکن جب وہ عذاب اور مصیبت ٹل جائے تو پھر دوبارہ گناہوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

علمی بات: اسلام کے تین بنیادی اصول ہیں: عقیدہ توحید، رسالت اور آخرت، باقی سب عقائد انہی تین کے تحت داخل ہیں، کیونکہ اللہ ﷻ پر ایمان لانے اور آپ ﷺ کی رسالت کی تصدیق کے بعد عقیدہ آخرت اور اس میں حساب وکتاب اور جزاء وسزاء، ایک ایسا عقیدہ ہے جو انسان کے ہر عمل کو ایک خاص سمت فراہم کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم کے تمام مضامین انہی تین کے گرد گھومتے رہتے ہیں۔

عملی پہلو: قیامت کے دن کافروں کے عذاب کی کیفیت: قرآنِ حکیم میں وقوف کا لفظ ہے یعنی ان کافروں کا جب جہنم پر وقوف ہوگا۔ اس کا معنی قیام بھی ہے اور جاننا بھی ' اس صورت میں اس آیت کے کئی معنی ہیں۔

۱۔ وہ جہنم کے پاس کھڑے ہوں اور دوزخ کا مشاہدہ کر رہے ہوں۔

۲۔ جہنم کے اوپر جو پل صراط ہے ' وہ اس کے اوپر کھڑے ہوئے جہنم کو دیکھ رہے ہوں۔

۳۔ وہ جہنم کے عذاب پر واقف اور مطلع ہوں۔

۴۔ ان کو دوزخ میں ڈال دیا گیا ہو اور وہ اس حال میں دوزخ میں کھڑے ہوئے ہوں کہ وہ ہر طرف سے آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں ہوں۔

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جب فرشتے کافروں کو دوزخ کے پاس کھڑا کر دیں گے تو وہ بے پناہ حسرت ویاس اور خوف ودہشت کے عالم میں ہوں گے۔ اس وقت یہ کافر ندامت کے ساتھ تمنا کریں گے کہ کاش ہمیں پھر دنیا میں لوٹا دیا جائے اور ہم اپنے رب کی ان نشانیوں اور دلیلوں کی تکذیب نہ کریں جو اس کی وحدانیت اور اس کے رسولوں کی تصدیق کرتی ہیں اور اللہ ﷻ پر، قیامت پر، فرشتوں پر، کتابوں پر اور رسولوں پر ایمان لائیں اور گناہوں سے توبہ کریں اور نیک عمل کریں۔ چنانچہ اللہ ﷻ ان کا رد فرماتا ہے کہ اب یہ ممکن نہیں۔

آیت نمبر ۲۸: اس آیت میں کفار کی جھوٹی تمنّا کے رد کا بیان ہے۔ دنیا میں حق واضح ہونے کے باوجود ان کے بغض وعناد اور تکبّر کی وجہ سے ان پر غفلت اور گمراہی کے پردے پڑے رہے جس کے سبب وہ حق سے انکاری رہے اور بتلا دیا گیا کہ واپس دنیا میں بھیجے جانے پر بھی دنیا کی محبت پھر انہیں اسی راستے پر ڈال دے گی۔

عملی پہلو: جو لوگ خود اپنی بداعمالیوں کے نتیجے میں اپنی فطرت مسخ کر لیتے ہیں وہ بارہا مواقع ملنے کے باوجود ہدایت سے محروم رہتے ہیں۔

علمی بات: ۱۔ مفسرین کی ایک رائے کے مطابق یہ آیت منافقین کے بارے میں ہے جو جھوٹی قسمیں کھا کر اپنے نفاق کو چھپایا کرتے تھے، یا پھر اس سے کفار کے سردار مراد ہیں جو قرآنِ حکیم اور رسول اللہ ﷺ کا سچا ہونا جانتے تھے، مگر اپنے پیروکاروں سے چھپاتے تھے۔ قیامت کے دن یہ حقیقت ان کے پیروکاروں پر کھل جائے گی اور انھیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ ہمیں دھوکا دیتے رہے ہیں۔

علمی اشکال:۔ ۲۔ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوگا کہ قیامت میں دوبارہ زندہ ہونے، پھر حساب وکتاب اور جزاء وسزا سب آنکھوں سے دیکھنے کے بعد کیسے ممکن ہوگا کہ پھر دوبارہ دنیا میں آکر اس کا انکار کر دیں؟۔ اس کا جواب یہ ہے کہ انکار کرنے کے لئے یہ لازم نہیں ہے کہ ان کو تمام حقائق کا یقین نہ رہے گا بلکہ جس طرح آج بہت سے کفار ومشرکین اسلامی حقائق کا پورا یقین رکھنے کے باوجود بغض وعناد کی وجہ سے انکار وتکذیب پر جمے ہوئے ہیں، اسی طرح یہ لوگ دنیا میں واپس آنے کے بعد قیامت کے قائم ہونے، دوبارہ زندہ کئے جانے اور آخرت کے تمام حالات کا پورا یقین رکھنے کے باوجود اسی بغض وعناد اور دنیاوی دھوکے کا شکار ہو کر پھر تکذیب پر اتر آئیں گے جیسا کہ قرآنِ حکیم نے اسی موجودہ زندگی میں بعض کفار کے متعلق ارشاد فرمایا ہے: "انہوں نے ان کا انکار کر دیا حالانکہ ان کے دل ان (نشانیوں) کا یقین کر چکے تھے۔" (سورۃ النمل ۲۷، آیت: ۱۴) جیسے یہود کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ "وہ (خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفی ﷺ) کو اس طرح پہچانتے ہیں جیسے لوگ اپنے بیٹوں کو پہچانا کرتے ہیں۔" (سورۃ البقرہ ۲، آیت: ۱۴۶) مگر اس کے باوجود آپ ﷺ کی مخالفت پر تلے ہوئے ہیں۔

عملی پہلو: کفار و مشرکین کا حال یہ ہے کہ آنکھوں دیکھے عذاب پر بھی ان کی توبہ پکّی نہیں بلکہ محض جان بچانے کی خاطر ہے۔ پس اگر دنیا میں واپس بھیج دیئے جائیں تو بدی اور شرارت کی جو قوتیں ان میں ہیں پھر انہی کو کام میں لائیں گے اور جس مصیبت سے گھبرا کر واپس جانے کی تمنا کر رہے ہیں اسے خواب و خیال کی طرح فراموش کر دیں گے جیسا کہ بسا اوقات دنیوی مصائب میں پھنس کر آدمی توبہ کر لیتا ہے پھر جہاں چند روز گزرے اور مصیبت ٹل گئی تو کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔

آیت نمبر ۲۹: مشرکین کے دنیا میں باطل عقائد پر اڑے رہنے کے اسباب مندرجہ ذیل تھے۔

۱۔ انہیں قیامت، جزا و سزا اور جنت و دوزخ پر ایمان نہ تھا۔

۲۔ ان کے نزدیک زندگی بس یہی دنیوی زندگی تھی۔

۳۔ وہ موت کے بعد کی زندگی کے قائل نہ تھے یوں وہ اعمال کی جواب دہی کے منکر تھے اور بے فکر ہو کر اپنی گمراہیوں میں پڑے ہوئے تھے۔

عملی بات: آج کل کفر و الحاد کے مختلف shades ہیں، اس زمانے میں بھی ایسا ہی تھا۔ آج ایسے لوگ بھی دنیا میں موجود ہیں جو اللہ ﷻ کو تو مانتے ہیں۔ آخرت کو نہیں مانتے۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو اللہ ﷻ اور آخرت کو مانتے ہیں ‘لیکن رسالت کو نہیں مانتے ہیں۔ کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو بالکل ملحد اور مادہ پرست ہیں اور ان کا عقیدہ یہ ہے کہ ہم خود ہی پیدا ہوتے ہیں اور خود ہی اپنی طبعی موت مر جاتے ہیں ‘اور ہماری صرف یہی زندگی ہے ‘مرنے کے بعد جی اٹھنے کا کوئی معاملہ نہیں۔ اسی طرح اُس دور میں بھی کفر و شرک کے مختلف shades موجود تھے۔ قریش کے اکثر لوگ اور عرب کے بیشتر مشرکین اللہ ﷻ کو مانتے تھے، آخرت کو مانتے تھے ‘بعث بعد الموت کو بھی مانتے تھے ‘لیکن اس کے ساتھ وہ بُتوں کی عبادت بھی کرتے تھے اور ان کی سفارش اور شفاعت کے قائل تھے۔

عملی پہلو: یہ بعث بعد الموت (مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے) کا انکار ہے جو ہر کافر کرتا ہے اور اس حقیقت سے انکار ہی دراصل ان کے کفر و عصیان کی سب سے بڑی وجہ ہے ورنہ اگر انسان کے دل میں عقیدہ آخرت کی صداقت راسخ ہو جائے تو کفر و معصیت کے راستے سے فوراً تائب ہو جائے گا۔ گویا دنیا میں شر اور فساد کی بنیادی وجہ آخرت کا انکار ہے۔

آیت نمبر ۳۰: آخرت میں کفار پر فرد جرم عائد ہو گا اور انہیں سزا بھی دی جائے گی۔ روز قیامت بعث بعد الموت کا اعتراف انہیں کوئی نفع نہ دے گا۔ قبر سے اٹھنے کے بعد میدان حشر میں جب لوگ اپنے رب کی بارگاہ میں پیش ہوں گے تو ان سے سوال کیا جائے گا کہ کیا مرنے کے بعد اٹھ کر حشر کے میدان میں رب کی بارگاہ میں حاضر ہونا حق ہے؟ تو انسان بے ساختہ پکار اٹھیں گے کیوں نہیں ہم نے قدم قدم پر اپنے رب کا وعدہ سچا پایا مگر اس دن کا اقرار کفار کے لئے مفید نہ ہو گا۔

علمی بات: اللہ ﷻ ان سے بلاواسطہ کلام نہیں فرمائے گا اور اس آیت میں جس کلام فرمانے کا ذکر ہے وہ فرشتوں کے واسطے سے ہے، یا اللہ ﷻ ان سے رحمت کے ساتھ کلام نہیں فرمائے گا اور یہ کلام غضب کے ساتھ ہے۔ پھر اللہ ﷻ فرشتے کے واسطے سے ان سے فرمائے گا کہ کیا یہ مر کر دوبارہ اٹھنا حق نہیں ہے ‘جس کا تم انکار کرتے ہو۔ وہ قسم کھا کر کہیں گے کہ یہ بالکل حق ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے ‘پھر اللہ ﷻ فرمائے گا اب تم اپنے کفر اور تکذیب کی وجہ سے عذاب کا مزہ چکھو۔

آیت نمبر ۳۱: اللہ ﷻ سے ملاقات کو جھٹلانے والے ابدی خسارے میں ہوں گے۔ اُن پر اچانک قیامت برپا ہو گی، وہ روزِ قیامت اپنی حسرت اور ندامت کا اظہار کریں گے اور گناہوں کا بدترین بوجھ اُٹھائے ہوئے ہوں گے جس کی سزا سے بچنے کا کوئی راستہ نہ ہو گا۔

علمی بات: اس دن مجرم دہائی دیں گے اے ہمارے رب! آج ہمیں یقین ہو گیا کہ آپ کا فرمان سچا اور آپ کی ملاقات برحق تھی لیکن ان کا اعتراف اور معذرت کسی کام نہیں آئے گی۔ حکم ہو گا کہ اب عذاب کی سختیاں اور جہنم کی اذیتیں چکھتے رہو کیونکہ بار بار سمجھانے کے باوجود تم کفر ہی کرتے رہے تھے۔ تم نے اپنے رب کی ملاقات کو جھٹلائے رکھا یہاں تک کہ قیامت برپا ہو گئی۔

آیت نمبر ۳۲: دنیوی زندگی کے عارضی ہونے اور بہت جلد ختم ہونے کے اعتبار سے اسے لہو ولعب فرمایا گیا ہے۔ کھیل تماشہ کی طرح دنیا کی لذتیں بھی عارضی ہیں جب کہ آخرت کی لذتیں حقیقی اور دائمی ہیں۔

نوٹ: دنیا کی زندگی کو لہو ولعب قرار دینے کی وجوہات حسب ذیل ہیں:

i۔ لہو ولعب کی مدت کم ہوتی ہے اور بہت جلد ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح دنیا کی زندگی بھی کم ہے اور جلد ختم ہو جاتی ہے۔

ii۔ لہو ولعب عموماً کسی فریب پر مبنی ہوتا ہے ' اسی طرح انسان بھی دنیاوی زندگی کسی فریب کے سہارے گزارتا ہے۔

iii۔ عموماً بچے، نادان اور غافل لوگ لہو ولعب میں مشغول رہتے ہیں اور سنجیدہ اور ذی فہم لوگ لہو ولعب سے اجتناب برتتے ہیں۔ اسی طرح دنیا کی لذتوں اور دلفریبیوں میں بھی جاہل اور غافل لوگ مشغول رہتے ہیں اور جو لوگ عقل مند اور زیرک ہوتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ دنیا اور اس کی تمام لذتیں فانی اور جلد ختم ہو جانے والی ہیں۔ لہٰذا وہ فانی نعمتوں کے مقابلے میں ابدی نعمتوں کے حصول کی جدوجہد میں مشغول رہتے ہیں۔

فرمان نبوی ﷺ: "دنیا مومن کے لئے قید خانہ ہے اور کافر کے لئے جنت ہے۔" (صحیح مسلم، سنن ترمذی)۔

علمی بات: آخرت کی ابدی زندگی کے مقابلے میں چند روز کی دنیوی زندگی، جسے کافر سب کچھ سمجھ رہے ہیں کھیل تماشے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ جو لوگ اللہ ﷻ کے احکام کی پرواکئے بغیر دنیا میں زندگی گزارتے ہیں تو جس عیش و آرام کو وہ اپنا مقصد زندگی بناتے ہیں، آخرت میں جا کر ان کو پتہ چلے گا کہ اس کی حیثیت کھیل تماشے کی سی تھی۔ ہاں! جو لوگ دنیا کو آخرت کی کھیتی بنا کر زندگی گزارتے ہیں۔ ان کیلئے دنیوی زندگی بھی بڑی نعمت ہے۔ جو ابدی نعمتوں کے حصول کا سبب ہے۔

فرمان نبوی ﷺ: دنیا کے بے وقعت ہونے کے متعلق احادیثِ مبارکہ میں بھی بتایا گیا ہے۔ ا۔ حضرت مستورد بن شداد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سواروں کی ایک جماعت میں جا رہا تھا، اچانک آپ ﷺ ایک جگہ سے گزرے جہاں بکری کا (مردہ) بچہ پڑا ہوا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا تمہارا کیا خیال ہے کہ جب اس کے مالکوں نے اس کو پھینکا ہو گا تو یہ ان کے نزدیک بے وقعت ہو گا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا اس کے بے وقعت ہونے کی وجہ سے ہی انہوں نے اس کو پھینک دیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے۔ جس قدر یہ بکری کا مردہ بچہ اپنے مالکوں کے نزدیک بے وقعت ہے ' اللہ ﷻ عزوجل کے نزدیک دنیا اس سے بھی زیادہ بے وقعت ہے۔ (صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ، مسند احمد)

۲۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص اپنی دنیا سے محبت کرے گا وہ اپنی آخرت کو نقصان پہنچائے گا اور جو شخص اپنی آخرت سے محبت کرے گا ' وہ اپنی دنیا کو نقصان پہنچائے گا۔ سو تم باقی رہنے والی چیز کو فانی ہونے والی چیز پر ترجیح دو۔ (مسند احمد)

۳۔ حضرت عمرو بن عوف رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ ﷻ کی قسم مجھے تم پر فقر کا خوف نہیں ہے ' لیکن مجھے تم پر یہ خوف ہے کہ تم پر دنیا اس طرح کشادہ کر دی جائے گی جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر کشادہ کر دی گئی تھی ' سو تم دنیا میں اس طرح رغبت کرو گے جس طرح انہوں نے رغبت کی اور تم اسی طرح ہلاک ہو جاؤ گے جس طرح وہ ہلاک ہو گئے تھے۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابن ماجہ)

آیت نمبر ۳۳: رسول اللہ ﷺ کو کفار کی مخالفانہ باتوں پر تسلی دی گئی ہے کہ مشرکین آپ ﷺ کے سچے ہونے کا یقین رکھتے ہیں لیکن ان کی ظاہری تکذیب کا باعث ان کا بغض وعناد ہے۔ یہ مشرکین مکہ رسول اللہ ﷺ کی تکذیب نہیں کرتے بلکہ اللہ ﷻ کی آیات کو جھٹلاتے ہیں۔

نوٹ: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ابو جہل نے نبی کریم ﷺ کے سامنے کہا: "ہم آپ کو جھوٹا نہیں کہتے بلکہ ہم اس شریعت کو جھوٹا کہتے ہیں جو آپ لے کر آئے ہیں" (جامع ترمذی)۔

شانِ نزول: جنگ بدر کے دن اخنس بن شریق اور ابو جہل کی ملاقات ہوئی، اخنس ابو جہل کو اس جگہ لے گیا جہاں کوئی نہیں تھا۔ اس نے ابو جہل سے کہا اے ابوالحکم (یعنی ابو جہل) مجھے یہ بتاؤ کہ (سیدنا) محمد (ﷺ) صادق ہیں یا کاذب؟ کیونکہ یہاں پر میرے اور تمہارے سوا قریش کا اور کوئی فرد نہیں ہے جو ہماری باتیں سن رہا ہو۔ ابو جہل نے کہا تم پر افسوس ہے، بخدا (سیدنا) محمد (ﷺ) البتہ ضرور صادق ہیں اور (سیدنا) محمد (ﷺ) نے کبھی جھوٹ نہیں بولا، لیکن جھنڈا، کعبہ کی دربانی اور بئر زمزم پہلے ہی بنو قصی کے پاس ہیں۔ اگر نبوت بھی وہ لے گئے تو قریش کے پاس کیا باقی بچے گا، تب یہ آیت نازل ہوئی (ابن جریر)۔

آیت نمبر ۳۴: رسول اللہ ﷺ کو صبر کی تلقین فرمائی گئی ہے، کہ گذشتہ قوموں نے بھی آپ ﷺ سے پہلے بھیجے گئے رسولوں کی تکذیب کی تھی چنانچہ اللہ ﷻ کی مدد جیسے سابقہ رسولوں کو پہنچی اسی طرح آپ ﷺ کو بھی پہنچے گی اور آپ ﷺ کامیاب ہوں گے۔

علمی بات: ۱۔ وَلَقَدْ كُذِّبَتْ: اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کی توجہ دعوت الٰہی کی تاریخ اور اس میں رائج سنت الٰہی کی طرف دلائی کہ تاریخ انبیاء کرام علیہم السلام میں آپ ﷺ کی تکذیب پہلا واقعہ نہیں بلکہ دیگر رسولوں کی بھی تکذیب ہوئی ہے۔

۲۔ فَصَبَرُوْا: اس تکذیب پر صبر سے کام لیا۔ جو لوگ صداق و اخلاص کی آخری منزل پر فائز ہوں، ان کو جھٹلایا جائے تو یہ بات نہایت تکلیف دہ ہوتی ہے۔ رسولوں نے اس تکلیف کا صبر سے مقابلہ کیا۔

۳۔ وَاُوْذُوْا: صرف تکذیب نہیں کی بلکہ اس کے بعد اذیت بھی دی گئی۔ یہاں صبر کا دوبارہ ذکر نہیں کیا، چونکہ صبر کی منزل پر اذیت پہنچنے سے پہلے ہی فائز تھے۔

۴۔ اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا: اب اللہ ﷻ کی نصرت کا مرحلہ آتا ہے۔ یعنی اللہ ﷻ کی مدد، تکذیب اور اذیت پر صبر و تحمل کے بعد آتی ہے۔

۵۔ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ: اللہ ﷻ کے فیصلے کو بدلنے والا کوئی نہیں ہے۔ یعنی تکذیب و اذیت پر صبر کے بعد اللہ ﷻ کی مدد آنا یقینی و حتمی ہے جس میں کسی قسم کی تبدیلی کا امکان نہیں ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: اور یقیناً ہمارے بھیجے ہوئے بندوں (یعنی رسولوں) سے ہمارا یہ وعدہ ہو چکا ہے۔ یقیناً وہ مدد کیئے جانے والے ہیں۔ (سورۃ الصّٰفّٰت ۳۷، آیات: ۱۷۲، ۱۷۱) یعنی اس کی نصرت کے وعدے مومنین کے حق میں اور عذاب کی وعیدیں منکرین کے حق میں پوری ہو کر رہیں گی، چنانچہ "اللہ کے کلمات" پورے ہو کر رہے، اسلام کی دعوت مشرق سے مغرب تک پھیلی اور مشرکین ذلیل و خوار ہوئے۔

عملی پہلو: ۱۔ وَلَقَدْ جَاءَكَ: رسولوں کی تاریخ اور سرگزشت، آپ ﷺ کے سامنے ہے کہ ان کو کن صبر آزما مراحل سے گزارا گیا اور آخر میں ہمیشہ وہی فاتح رہے، اسی طرح آپ علیہ السلام بھی فتح یاب ہوں گے۔

۲۔ اس آیت میں ہمارے لئے سبق یہ ہے کہ تبلیغ حق کے راستہ میں مشکلات آتی ہیں جیسا کہ انبیاء کرام علیہم السلام کو بھی آئیں مگر جو ان مشکلات پر صبر اور ثابت قدمی کے ساتھ اپنے مشن کو جاری رکھتے ہیں وہ ایک دن اللہ ﷻ کی مدد سے اپنے مقصد کو پالیتے ہیں۔ دعوت اور اصلاح کے کام میں صبر بہت ضروری ہے۔ صبر کے بعد ہی اللہ ﷻ کی مدد اور نصرت نازل ہوتی ہے۔

علمی بات: اہل حق کی مخالفت کا ہونا تعجب انگیز نہیں بلکہ نہ ہونا باعثِ تعجب ہے۔

آیت نمبر ۳۵: نبی اکرم ﷺ کو مزید تسلی و تشفی فرمائی گئی ہے کہ دنیا کے تمام انسان سچائی پر اکٹھے نہیں ہوا کرتے۔ آپ ﷺ صبح و شام اس کوشش میں رہتے کہ کسی طرح کفار ہدایت سے بہرمند ہو جائیں۔ مگر بتایا گیا ہے کہ لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور کر دینا اللہ ﷻ کی حکمت کے خلاف

ہے۔ کیونکہ اصل مقصود امتحان ہے ، چنانچہ حق و باطل کو بالکل واضح طور پر بیان کر کے دونوں میں سے کسی بھی راہ پر گامزن ہونے کا اختیار انسان کو دے دیا گیا۔

عملی بات: کفار آپ ﷺ سے مختلف قسم کے دنیاوی فوائد پر مشتمل ظاہری و حسی معجزات کا مطالبہ اور فرمائش کرتے تھے۔ حضور اکرم ﷺ کی بہت خواہش تھی کہ سب لوگ مسلمان ہو جائیں، لہٰذا جب کفار اس قسم کے معجزات کا مطالبہ کرتے اور راہ حق سے روگردانی کرتے تو ان کا یہ فعل حضور اکرم ﷺ پر گراں گزرتا۔ اس پر اللہ ﷻ نے فرمایا: پیارے نبی ﷺ ! اگر آپ زمین کی تہ میں سرنگ کھود کر یا آسمان کی بلندیوں میں سیڑھی لگا کر ان کے فرمائشی معجزات ظاہر کر دیں تب بھی یہ ایمان نہیں لائیں گے کیونکہ وہ پہلے کئی معجزات (جیسے شق قمر، درختوں اور پتھروں کی گواہی وغیرہ) دیکھ چکے ہیں اور صرف تعصب اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے انکار کرتے ہیں تو جو شخص متعصب اور ضدی ہو اسے کسی عقلی یا نقلی دلیل سے مطمئن نہیں کیا جا سکتا۔ نیز اللہ ﷻ قادر مطلق ہے اگر وہ چاہتا تو سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا اور کوئی بھی کافر نہ ہوتا مگر اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ کسی کو مجبور نہ کیا جائے تا کہ لوگوں کی آزمائش ہو جائے کہ کون اپنے اختیار سے حق کو قبول کرتا ہے اور کون جان بوجھ کر اس سے روگردانی کرتا ہے، آپ ﷺ کو اس کے بارے میں غمگین ہونے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ یہ حکمتِ خداوندی ہے۔

آیت نمبر ۳۶: دعوتِ حق پر لبیک کہنے والے وہ ہیں جو حق بات توجہ اور طلب ہدایت کی نیت سے سننے والے ہیں جبکہ کفار کی مثال مُردوں جیسی ہے کہ انہوں نے اللہ ﷻ کی عطا کردہ صلاحیتوں کو حق سننے، سمجھنے اور قبول کرنے کے لئے استعمال نہ کیا یہ بالآخر روزِ قیامت اللہ ﷻ کے حضور پیش ہوں گے۔

علمی بات: جو لوگ حق بات غور سے سنتے ہیں وہ تو ہدایت قبول کر لیتے ہیں لیکن جو روگردانی کرتے ہیں وہ دراصل مُردوں کی طرح ہیں۔ کافروں کو جانداروں جیسی زندگی تو ملی ہے، لیکن ان کے دل فاسد عقائد اور اخلاقِ رذیلہ کے زہر سے بھر چکے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کی غور و فکر کی صلاحیتیں مردہ ہو گئیں اور انہیں اپنی اس کوتاہی کا احساس اس وقت ہو گا جب انہیں قبروں سے اٹھا کر اللہ ﷻ کی عدالت میں پیش کیا جائے گا، اس وقت انہیں حسرت و یاس ہو گی مگر اس وقت کا احساس بے سود ہو گا۔ ہمیں بھی حق بات دل و جان سے مان کر اُس کے تقاضوں پر عمل پیرا ہونا چاہیئے۔

عملی پہلو: حق کی دعوت وہی قبول کریں گے جو حق کے متلاشی اور طلبِ حق کی نیت سے سننے والے ہوں گے اور جو لوگ ضد اور عناد میں آخری حد تک پہنچے ہوئے ہیں ان کے دل مردہ ہیں وہ کبھی حق بات کو نہیں پا سکتے وہ ہدایت سے محروم ہی رہتے ہیں۔

آیت نمبر ۳۷: کفار کی ایک اور نارواابات پر ان کو تنبیہ کی گئی ہے کہ فرمائشی معجزہ دیکھ کر بھی نہ ماننے والے عذاب کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جبکہ اللہ ﷻ چاہتا ہے کہ فطری طریقہ کے مطابق لوگ عقل و فہم کو استعمال کر کے پیغمبر کی دعوت کو قبول کریں اور ایمان کی راہ اختیار کریں۔

علمی بات: ۱۔ معجزہ ایک غیر معمولی اور خلافِ عادت چیز ہوتی ہے جو کسی نبی علیہ السلام سے نبوت کے دعویٰ کے بعد اس کی صداقت کے لئے ظاہر ہوتا ہے مخلوق میں ہر ایک اس کے مقابلے میں بے بس ہو جاتا ہے۔ معجزہ اللہ ﷻ کی طرف سے صرف پیغمبروں کو ہی عطا فرمایا جاتا ہے تا کہ لوگ ان کی نبوت کی تصدیق کے بعد احکامِ الٰہی میں ان کی اطاعت کریں۔

۲۔ نبی علیہ السلام کی نبوت کی اصل دلیل تو نبی علیہ السلام کی ذات، صفات اور تعلیمات ہوتی ہیں انہی کو دیکھ کر سلیم الفطرت اور عقل مند لوگ ایمان لے آتے ہیں۔ مگر عوام الناس میں جو ظاہری اور حسی نشانیوں سے متاثر ہوتے ہیں ان کے لئے اللہ ﷻ معجزات عطا فرماتا ہے اور جن کی ضد اور بداعمالیوں کے سبب ان کے مقدر میں سوائے محرومی کے اور کچھ نہیں ہوتا وہ معجزات دیکھ کر بھی ایمان نہیں لاتے۔

۳۔ معجزات صرف پیغمبروں کو عطا ہوتے ہیں۔ اللہ ﷻ نے لوگوں کو جھوٹے نبی سے بچانے کے لئے کسی جھوٹے مدعی نبوت کو کوئی معجزہ نہیں دیا، اور نہ ہی اس کی کوئی پیشن گوئی پوری ہونے دی یہی وجہ ہے کہ مرزا قادیانی ملعون کی کوئی پیشن گوئی سچی ثابت نہیں ہوئی بلکہ وہ خود بھی عبرتناک موت

سے دوچار ہوا، دجال کے ہاتھوں اللہ ﷻ کئی خرق عادت کام ظاہر فرمائے گا لیکن وہ نبوت کا دعوی نہیں کرے گا بلکہ خدائی کا دعویٰ کرے گا اور کانے یعنی عیب زدہ شخص کے خدائی کے دعوے کی حقیقت ہر انسان خوب جانتا ہے۔

۴۔ معجزہ وَہبی یعنی عطا کیا ہوا ہوتا ہے کَسبی یعنی اپنی محنت سے کمایا ہوا نہیں ہوتا۔ معجزہ کسی نبی اور رسول علیہ السلام کے اپنے اختیار میں نہیں ہوتا کہ جب چاہیں اسے ظاہر کر دیں بلکہ اللہ ﷻ کے اختیار میں ہوتا ہے جب اللہ ﷻ چاہتا ہے اور جو معجزہ چاہتا ہے نبی علیہ السلام کے ہاتھوں ظاہر فرما دیتا ہے۔ اللہ ﷻ نے بعض مرتبہ کفار کے مطالبے کے عین مطابق نبی علیہ السلام کے ہاتھ پر معجزہ ظاہر فرمایا اور بسا اوقات کافروں کی طرف سے کسی خاص معجزے کے بارہا مطالبے اور اصرار کے باوجود بھی پورا نہیں فرمایا کیونکہ اس سے پہلے کتنے ہی معجزات دیکھنے پر وہ انکار کر بیٹھے تھے اور ایمان نہیں لائے تھے۔

نوٹ: مخصوص معجزات نہ دکھائے جانے کی وجوہات: پہلی وجہ یہ ہے کہ کفار کی طرف سے مخصوص قسم کے معجزات کا مطالبہ درحقیقت ضد اور عناد کی بنیاد پر تھا۔ نہ کہ ان کا مقصد ان کے ذریعے قبول ہدایت تھا۔ اس لئے عام طور پر انبیا کرام علیہم السلام کو فرمائشی معجزات عطا نہیں کیئے جاتے۔ وگرنہ اللہ ﷻ ہر قسم کے معجزات ظاہر کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ دوسرا اگر کوئی قوم فرمائشی معجزہ دیکھنے کے باوجود ایمان قبول نہ کرے تو اس پر اللہ ﷻ کا عذاب نازل ہو کر رہتا ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ قرآنِ حکیم جیسے بے مثال معجزہ کی موجودگی میں کسی حسی اور مادی معجزہ کی ضرورت نہیں۔

عملی پہلو: جن لوگوں نے خود ہی اپنے لئے اندھیروں میں بھٹکنے کا سامان کر دیا ہے اور اپنی آنکھوں پر کفر اور گمراہی کی پٹی باندھ رکھی ہو وہ ایمان کی روشنی کے باوجود ہدایت اور صراط مستقیم نہیں پا سکتے۔ جو لوگ (معاذاللہ) قرآنِ حکیم کو جادو کہہ کر ٹھکرا سکتے ہیں وہ کسی بھی دوسرے معجزے کو جادو قرار دینے سے باز نہیں آئیں گے۔

علمی بات: معجزات پر ایمان لانے کا حکم: انبیاء کرام علیہم السلام کے جو معجزات دلائل قطعیہ سے ثابت ہیں ان پر ایمان لانا فرض ہے، ایسے قطعی معجزات میں سے کسی ایک کے انکار سے بھی انسان دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے، مثلاً کشتی نوح علیہ السلام کا معجزہ حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کا معجزہ، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے آگ کو گلزار بنانے کا معجزہ، حضرت داؤد علیہ السلام کے لئے لوہے کو موم کی طرح نرم کرنے کا معجزہ، حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے چرند پرند کی بولیاں سمجھنے کا معجزہ، انسانوں اور جنوں کو ان کے تابع کرنے کا معجزہ، مہینوں کا سفر گھنٹوں میں طے کرنے کا معجزہ، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے عصا اور ید بیضاء کا معجزہ، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ پیدا کرنے کا معجزہ، پیدائش کے فوراً بعد کلام کرنے کا معجزہ، مٹی کے پرندے بنا کر انہیں زندہ کر کے اڑانے کا معجزہ، اندھے اور کوڑھی کو اچھا کرنے اور مردوں کو زندہ کرنے کا معجزہ، آنحضرت ﷺ کے لئے قرآنِ حکیم کا معجزہ کہ تقریباً سوا چودہ سال گزرنے کے بعد بھی کوئی اس کی نظیر پیش نہیں کر سکا، واقعہ اسراء کا معجزہ، آپ ﷺ کے مبارک ہاتھوں سے پھینکی جانے والی مٹی کو کافروں کی آنکھوں تک پہنچا دینے کا معجزہ وغیرہ انبیاء کرام علیہم السلام کے وہ برحق معجزات جو قطعی دلائل سے ثابت ہیں، ان کا انکار ضلالت و گمراہی ہے۔

نوٹ: مشرکین کے خاتم الانبیاء حضرت محمد ﷺ سے معجزات کے مطالبات: "اور انہوں نے کہا ہم ہرگز آپ کی بات نہ مانیں گے یہاں تک کہ آپ ﷺ ہمارے لئے زمین سے کوئی چشمہ جاری کر دیں۔ یا آپ کے لئے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو پھر آپ اس کے درمیان بہت سی نہریں جاری کر دیں۔ یا آپ آسمان کو ہم پر ٹکڑے ٹکڑے کر کے گرا دیں جیسا کہ آپ کا خیال ہے یا آپ اللہ کو اور فرشتوں کو (ہمارے) سامنے لے آئیں۔ یا آپ کے لئے سونے کا ایک گھر ہو یا آپ آسمان پر چڑھ جائیں اور ہم آپ کے چڑھنے کو بھی نہ مانیں گے یہاں تک کہ آپ ایک کتاب اُتار لائیں جسے ہم خود پڑھیں آپ فرما دیجیئے میرا رب پاک ہے میں تو ایک انسان (اور) رسول ہوں۔" (بنی اسرائیل: ۹۰ تا ۹۳)

نوٹ: حضرت سیدنا محمد رسول ﷺ کے بعد کسی سے معجزہ کا مطالبہ کرنا: سید حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ خاتم النبیین ہیں آپ ﷺ کے بعد قیامت تک کوئی نبی نہیں آئے گا۔ محمد رسول ﷺ کو آخری نبی ماننے کے بعد بھی کوئی شخص کسی جھوٹے مدعی نبوت سے دلیل یا معجزے کا مطالبہ کرے تو

اس کا بھی اسلام سے قطعاً کوئی تعلق باقی نہ رہے گا کیونکہ یہ مطالبہ عقیدہ ختم نبوت کی نفی کرنے والا ہے اور جب عقیدہ ختم نبوت (جو کہ اسلام کا بنیادی نظریہ ہے) باقی نہ رہا تو ایسا شخص کیسے مسلمان کہلا سکتا ہے۔

علمی بات: جو خرق عادت کام نبی کی نبوت سے پہلے ظاہر ہو اس کو ارہاص کہا جاتا ہے، جیسا کہ واقعہ فیل کو نبی کریم ﷺ کے ارہاصات میں شمار کیا گیا ہے۔ لفظ معجزہ دراصل علم العقائد والوں کی اصطلاح ہے کیونکہ انسان اس کے مقابلے اور نظیر پیش کرنے سے عاجز ہوتے ہیں ورنہ قرآن وحدیث میں معجزہ آیت، برہان، علامت اور دلیل سے تعبیر کیا گیا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے "اور وہ کہتے ہیں کہ اس کے رب کی طرف سے اس پر کوئی نشانی کیوں نہیں نازل کی گئی۔" (سورۃ الانعام ۶، آیت: ۳۷)

"اے لوگو! تمہارے پاس پروردگار کی طرف سے کھلی دلیل آچکی ہے۔" (سورۃ النساء ۴، آیت: ۱۷۴)

آیت نمبر ۳۸: اس آیت میں اللہ ﷻ کی قدرت اور علم کا بیان فرمایا گیا ہے کہ مخلوقات میں موجود نظم وضبط اور ترتیب اللہ ﷻ کی قدرت کا شاہکار ہے۔ نیز یہ بھی بتایا گیا ہے کہ قیامت کے دن سب ہی کو اللہ ﷻ کے حضور جمع ہو کر حساب وکتاب دینا ہے۔

علمی بات: ۱۔ **قانون ہدایت کی ہمہ گیری:** آیت کا مقصد یہ ہے کہ قانون ہدایت وترہیب ہمہ گیر ہے کائنات میں کوئی جاندار چیز اس سے مستثنیٰ نہیں۔ سب پرندے اور سب حیوان اللہ ﷻ کی جانب سے ہدایت حاصل کرتے ہیں، اور اس فطری ہدایت کی وجہ سے زندہ ہیں، چڑیا سے لے کر چیونٹی تک کے لئے مقررہ قانون ہیں، جن سے سرتابی کرنا ان کے لئے ناممکن ہے، اسی طرح حضرت انسان اپنی پوری زندگی بسر کرنے کے لئے اللہ ﷻ کی ہدایت کا محتاج ہے۔

۲۔ اللہ ﷻ ہی کی قدرت ہے کہ اس نے تمام جانوروں اور پرندوں کو مختلف جماعتوں میں تقسیم کر کے ان کے مزاج کے موافق ان کی غذا کا انتظام فرما دیا ہے۔ ان کی ضروریات کے مطابق ان کے اعضاء جسمانی تخلیق فرما دیئے ہیں۔ جس خطہ زمین اور آب وہوا میں انہیں زندگی بسر کرنا ہے ان کا گوشت پوست اور جسمانی ساخت اسی کے موافق ڈھال دی ہے۔ پھر ہر ایک کی ذمہ داری کے بقدر اسے شعور اور سمجھ عطا کی گئی ہے۔

نوٹ: کفار کو متنبہ کیا گیا ہے کہ جب اللہ ﷻ زمین کے کسی جانور یا پرندے کے حالات سے ناواقف نہیں ہے اور اس کا نامۂ اعمال محفوظ ہے اور اس کا بدلہ بھی اسے ملے گا تو تم اپنے بارے میں یہ کیوں سمجھ رہے ہو کہ تمہیں تمہارے اعمال کا بدلہ نہیں دیا جائے گا۔

علمی بات: ۱۔ اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ مرنے کے بعد دوسری زندگی صرف انسانوں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ بعض جانوروں کو بھی حشر کے دن زندہ کر کے اٹھایا جائے گا، تاکہ ان سے بدلہ لیا جائے، جیسا کہ حدیث مبارکہ میں مذکور ہے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ضرور بالضرور تم سے قیامت کے دن حق داروں کے حقوق ادا کرائے جائیں گے، حتیٰ کہ بے سینگ بکری کا بدلہ سینگ والی بکری سے لیا جائے گا۔ (صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ) یہاں اس حقیقت کو بیان فرمانے کا مقصد بظاہر یہ ہے کہ کفارِ عرب مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کو ناممکن قرار دیتے تھے اور کہتے تھے کہ سارے کے سارے انسان جو مر کر مٹی ہو چکے ہوں گے، ان کو دوبارہ کیسے زندہ کر کے جمع کیا جا سکتا ہے، اللہ ﷻ نے یہاں یہ فرمایا ہے کہ صرف انسانوں ہی کو نہیں بلکہ جانوروں کو بھی زندہ کیا جائے گا، حالانکہ جانوروں کی تعداد انسانوں سے کہیں زیادہ ہے، رہا یہ معاملہ کہ دنیا کی ابتداء سے انتہا تک کے بیشمار انسانوں اور جانوروں کے گلے سڑے اجزاء کا کیسے پتہ لگایا جائے گا تو اس کا جواب اگلے جملے میں یہ دیا گیا ہے کہ لوح محفوظ میں ہر بات درج ہے اور یہ ایسا ریکارڈ ہے جس میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی ہے، لہٰذا نہ انسانوں کو جمع کرنا اللہ ﷻ کے لئے کچھ مشکل ہے نہ جانوروں کا۔

۲۔ "الکتب" سے مراد لوح محفوظ ہے۔ جس میں تمام مخلوقات کے بارے ہر ایک چیز درج ہے۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک کتاب سے مراد وہ کتاب ہے جو اللہ ﷻ کے پاس ہے جس میں وہ سب کچھ درج ہے جس کا وقوع ہو گیا اور جو آئندہ ہو گا اور وہ (کتاب) لوح محفوظ ہے۔

فرمان نبوی ﷺ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے روز سب اہل حقوق کے حق ادا کیئے جائیں گے یہاں تک کہ بے سینگ بکری کا انتقام سینگ والی بکری سے لیا جائے گا۔ (بیہقی)

عملی پہلو: اسلام میں حقوق العباد کی ادائیگی پر بہت زور دیا گیا ہے۔ روز محشر میں جانوروں کا انتقام ان کے مکلف ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ رب العالمین کے انتہائی درجہ عدل و انصاف کی وجہ سے ہے کہ ایک جاندار کسی جاندار پر کوئی ظلم کرے تو اس کا بدلہ دلوایا جائے گا باقی ان کے کسی اور عمل پر کوئی مواخذہ نہیں ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ ﷻ کی مخلوق میں باہمی حقوق کی ادائیگی کا معاملہ اتنا سنگین ہے کہ غیر مکلف جانوروں کو بھی اس سے مستثنیٰ نہیں کیا گیا، مگر افسوس ہے کہ ہم میں سے اکثر لوگ اس میں غفلت برتتے ہیں۔

آیت نمبر ۳۹: اللہ ﷻ کی آیات کی تکذیب کرنے والے اپنے کانوں سے حق بات نہ سننے کی وجہ سے بہرے ہیں، اپنی زبانوں سے حق بات نہ بولنے کی وجہ سے گونگے ہیں اور کفر وضلالت کی تاریکیوں میں گھرے رہنے کی وجہ سے انھیں کوئی چیز نظر نہیں آتی جس سے ان کی اصلاح احوال ہو سکے۔

نوٹ: جو لوگ اللہ ﷻ کی آیتوں کی تکذیب کرتے ہیں اور جھٹلاتے ہیں وہ تو ایسے ہیں جیسے بہرے اور گونگے جو مختلف قسم کی تاریکیوں اور اندھیروں میں پڑے ہوئے ہیں یعنی نہ حق بات کو سنتے ہیں نہ حق کہتے ہیں اور ان کی حالت یہ ہے کہ کفر و شرک کے اندھیروں میں گرفتار ہو کر رہ بھٹک رہے ہیں۔ یعنی اللہ ﷻ کی آیات کو جھٹلانے والے کفر و شرک اور نفس کی بے جا خواہشوں کے اندھیروں میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ایسا آدمی کبھی بھی سیدھی راہ نہیں پا سکتا اور تاریکیوں سے کبھی بھی نہیں نکل سکتا، اللہ ﷻ نے قرانِ حکیم میں اہل کفر کے لئے یہ تشبیہ بہت سی آیتوں میں بیان کی ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ وہ جہالت میں پورے طور پر ڈوبے ہوئے ہیں اور فہم وادراک کے تمام راستے ان کی بداعمالیوں کی باداش میں ان کے لئے کلی طور پر بند ہیں۔ مثلاً سورۃ بقرہ، آیت:۱۷، ۱۸ اور سورۃ النور، آیت:۴۶ میں بیان ہوا ہے۔

علمی بات: ۱۔ یہ آیت کریمہ اس امر کی دلیل ہے کہ خالق تو اللہ ﷻ ہے مگر خیر و شر کا فاعل وکاسب بندہ خود ہے۔ کہ اللہ ﷻ نے سمجھانے کے بعد اختیار دے دیا ہے۔

۲۔ ظلمات میں پڑے رہنے سے مراد کفر، جہالت، عناد اور آباء پرستی کے اندھیروں میں پڑے رہنا ہے۔

۳۔ اللہ ﷻ کی آیات کو جھٹلانے والوں کو گونگا اور بہرا کہنے کی وجہ یہ ہے کہ جیسے گونگا، بہرا راہ نہیں پا سکتا کہ اندھے پن کی وجہ سے آنکھیں دیکھنے سے عاری ہو گئیں اور گونگا اور بہرہ ہونے کی وجہ سے وہ نہ خود بول سکتا ہے اور نہ کسی کی سن سکتا ہے۔ یہی حال ایسے لوگوں کا ہو جاتا ہے۔

۴۔ ہدایت اور گمراہی دونوں کا اختیار اللہ ﷻ ہی کے پاس ہے۔ اللہ ﷻ جس کو چاہے راہ راست سے دور کر کے گمراہی میں ڈال دے اور جس کو چاہے راہ راست پر ڈال دے۔ مگر وہ گمراہ اُن ہی کو کرتا ہے جو اپنی صلاحیتوں کو صحیح استعمال نہیں کرتے۔ جیسے (سورۃ البقرہ ۲، آیات:۲۶، ۲۷) اور (سورۃ الاعراف ۷، آیت:۱۷۶) میں ذکر ہے اور ہدایت اُن ہی کو دیتا ہے جو اپنی صلاحیتوں کا صحیح استعمال کرتے ہوئے، اس کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ جیسے (سورۃ شوریٰ ۴۲، آیت:۱۱) میں ذکر ہے۔

آیت نمبر ۴۰: کفار پر جب مصیبت پڑتی ہے تو اللہ ﷻ ہی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اس وقت باطل معبودوں کو بھول جاتے ہیں۔ کفار کو یہ کہہ کر جھنجھوڑا جا رہا ہے کہ اگر تم سچے ہوتے کہ معبودان باطل کی عبادت سے نفع پہنچتا ہے تو مشکل وقت میں ان کو چھوڑ کر صرف اللہ ﷻ ہی کی طرف کیوں متوجہ ہوتے ہو، معلوم ہوا کہ یہ جھوٹے معبود جو تم نے بنا رکھے ہیں کسی بھی نفع اور نقصان کے مالک نہیں پھر ان کو پکارنا اور ان کی عبادت محض حماقت نہیں ہے تو اور کیا ہے؟

علمی بات: پہلے اللہ ﷻ نے کفار کی جاہلیت کو آشکارا کرنے کے بعد یہ بتایا کہ تمام کائنات میں اللہ ﷻ کا علم محیط ہے اور اس کائنات میں وہی حقیقی اختیار رکھنے والا ہے۔ اس کے بعد اللہ ﷻ نے یہ بیان فرمادیا ہے کہ جب ان کافروں پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو پھر یہ اللہ ﷻ ہی کی پناہ میں آتے ہیں اور

اس کی اطاعت سے سرکشی اختیار نہیں کرتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان کی فطرت کا بھی یہی تقاضا ہے کہ یہ اللہ ﷻ کے سوا کسی کو مشکل کشا اور حاجت روانہ مانیں کیونکہ مصیبتوں اور تکلیفوں میں وہی واحد نجات دینے والا اور کارساز ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ ﷻ نے انسان کی فطرت میں اپنے خالق کی معرفت رکھی ہے اور اس کی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کرے اور اسی کو پکارے۔ اس لئے انسان پر جب کوئی سخت مصیبت اور پریشانی آتی ہے تو اس کی نگاہ اس کے سوا کسی اور کی طرف نہیں اٹھتی۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے "پس آپ اپنا رُخ یکسوئی کے ساتھ دین پر قائم رکھیں (یہی) اللہ کی وہ فطرت ہے جس پر اس نے لوگوں کو پیدا فرمایا اور اللہ کی بنائی ہوئی (فطرت) میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔" (سورۃ الروم ۳۰، آیت: ۳۰)

آیت نمبر ۴۱: انسانی فطرت میں توحید کا تعارف موجود ہے۔ جب انسان کسی بڑی مصیبت میں پھنس جاتا ہے تو اس وقت اسے اللہ ﷻ ہی یاد آتا ہے۔ اس آیت میں اللہ ﷻ نے از خود اس سوال کا جواب دیا ہے جو پچھلی آیت کے آخر میں مشرکین اور منکرین سے کیا گیا۔

اور بتادیا کہ سختی، مصیبت اور تنگی میں تم صرف اللہ ﷻ ہی کو پکارتے ہو 'تاکہ تمہاری مصیبتیں اور تکلیفیں دور ہو جائیں۔ پھر اللہ ﷻ اپنی حکمت اور مشیت کے مطابق اگر چاہے تو تم سے وہ تکلیف دور فرما دیتا ہے اور ایسے وقت میں تم اپنے بتوں کو بھول جاتے ہو اور اللہ ﷻ کے سوا تم کو کوئی یاد نہیں آتا۔ جیسا کہ اللہ ﷻ فرماتا ہے: "آپ پوچھئے تمہیں خشکی اور سمندر کی تاریکیوں سے کون نجات دیتا ہے؟ جس کو تم عاجزی سے اور چپکے چپکے پکارتے ہو۔ کہ اگر وہ ہمیں اس (مصیبت سے) سے بچالے تو ہم ضرور اس کے شکر گزار بن جائیں گے، آپ کہئے اللہ ہی تم کو اس (مصیبت) سے اور ہر مصیبت سے نجات دیتا ہے پھر (بھی) تم شرک کرتے ہو۔" (سورۃ الانعام ۶، آیات: ۶۴ تا ۶۳) دوسری جگہ ارشاد فرمایا "پس جب وہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں (تو) صرف اللہ ہی کو پکارتے ہیں اس کے لئے دین کو خالص کرتے ہوئے پس جب وہ انہیں خشکی کی طرف نجات عطا فرماتا ہے (تو) اسی وقت وہ شرک کرنے لگتے ہیں۔" (سورۃ العنکبوت ۲۹، آیت: ۶۵)

آیت نمبر ۴۲: دنیا میں عذاب سے متعلق اللہ ﷻ کا قانون بیان فرمایا گیا ہے کہ آزمائشیں قوموں کے لئے مہلت ہوتی ہیں تاکہ وہ سنبھل جائیں۔ نیز مشرکین کو دعوت فکر دی گئی ہے کہ وہ اللہ ﷻ کی طرف رجوع کریں اور اپنے کفر و شرک سے باز آئیں۔

عملی بات: ۱۔ اللہ ﷻ نے مشرکین مکہ کی عبرت کے لئے سابقہ امتوں کی مثال دی اور یہ بتلایا کہ اپنے بندوں کو مشکلات اور سختیوں میں مبتلا کرنا اللہ ﷻ کی سنت جاریہ ہے تاکہ وہ گمراہی اور کفر سے ہدایت اور ایمان کی طرف رجوع کریں۔ اس لئے فرمایا کہ ہم نے آپ سے پہلے کئی امتوں کی طرف رسول بھیجے جنہوں نے اپنی اپنی قوموں کو اللہ ﷻ کی توحید اور اس کی عبادت کی دعوت دی۔ سو انہوں نے اپنے پیغمبروں کی دعوت کو قبول نہیں کیا تو ہم نے ان کو فقر اور معاش کی تنگی میں اور بیماریوں اور تکلیفوں میں مبتلا کر دیا تاکہ وہ اللہ ﷻ سے ڈریں اور گڑگڑا کر اللہ ﷻ سے دعا کریں 'کیونکہ سختیاں جھیلنے سے انسان کندن بن جاتا ہے یعنی اس کی فطری صلاحیتوں میں نکھار آجاتا ہے۔ مشرکین مکہ کو یہ اس لئے بتایا ہے کہ وہ بھی پچھلی امتوں کے کافروں کی طرح عذاب الٰہی کے منتظر تھے اور نبی کریم ﷺ کی مخالفت کرتے تھے۔

۲۔ "باسا" اس تکلیف کو کہتے ہیں جو انسان کے بدن سے باہر ہو، بیرونی طور پر پیش آئے مثلاً سیلاب آجائے یا دشمن کا خطرہ لاحق ہو جائے قحط سالی ہو جائے یا مالی پریشانی ہو جائے یا اشیائے ضرورت مہنگی ہو جائیں وغیرہ اور " ضراء" اس تکلیف کو کہتے ہیں جو بدن کے اندر ہوتی ہے۔

فرمان نبوی ﷺ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جسے اچھا لگے (اور پسند آئے) کہ مصائب و مشکلات (اور تکلیف دہ حالات) میں اللہ ﷻ اس کی دعائیں قبول فرمائے تو اسے کشادگی و فراخی کی حالت میں کثرت سے دعائیں مانگتے رہنا چاہیئے۔" (جامع ترمذی) جب کہ عام طور پر معاملہ اس کے برعکس ہے لوگ خوشی میں اللہ ﷻ کو بھول جاتے ہیں۔ حالانکہ خوشی کے موقع پر ہمیں اللہ ﷻ کا زیادہ شکر ادا کرنا چاہیئے کہ اے رب! تیرا شکر ہے کہ تو نے ہمیں

خوشی کا یہ دن نصیب فرمایا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اب ناشکری ایک عام عادت سی بنتی جارہی ہے کہ دولت نصیب ہوجائے تولوگ برے اور غلط کاموں پر خرچ کرتے ہیں اچھے کاموں کے لئے کہاجائے توپیشانی پہ بل پڑجاتے ہیں اور کنی کتراتے ہیں۔

آیت نمبر ۴۳: اس آیت میں بتایا گیاہے کہ گناہوں کی کثرت اور عدم توبہ کی وجہ سے قوموں کے دلوں میں سختی پیداہوتی ہے۔ نیز شیطان ان کے بُرے کاموں کو خوشنما بناکر پیش کرتاہے اور ان پر کوئی نصیحت کارگر نہیں ہوتی۔ ایسے لوگوں کے بارے میں بتایا گیاہے کہ مصائب میں مبتلاہونے کے باوجود بھی ان کو تنبیہ نہ ہوئی اور نہ ہی انہوں نے اپنے اعمال کو ہی قابل اصلاح سمجھا۔ یہ توبہ سے روکنے والے اسباب کا بیان ہے اور اس بات کا اظہار ہے کہ دل کی سختی اور شیطان کے ورغلانے نے ان کو توبہ سے روک دیا تھا۔

عملی پہلو: ہمیں سوچناچاہیئے کہ کیا کہیں آج ہمارا بھی یہی حال تو نہیں ہوگیا کہ جب کوئی جنگ، سیلاب، قحط یازلزلہ یا کوئی آفت ہم پر نازل ہوتی ہے توہم اسے محض مادی اسباب کا نتیجہ سمجھتے ہیں اور اسے اللہ ﷻ کی طرف سے تنبیہ اور سزا سمجھنے کو جہالت اور بے وقوفی قرار دیتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ ایسی ہی صورت ہے توہمیں فوراًتوبہ واستغفار کرتے ہوئے اللہ ﷻ کی طرف رجوع کرناچاہیئے۔

آیت نمبر ۴۴: اس آیت میں گناہوں کی پاداش میں قوموں کو عذاب میں مبتلا کرنے کا بیان ہے۔ کہ ان پر دنیا کی مادی نعمتوں، راحتوں اور کامیابیوں کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ پھر یکدم ایساسخت عذاب آتاہے جو اس قوم کو صفحہ ہستی سے مٹادیتاہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ کا قانون یہ ہے کہ کوئی قوم اس وقت تک تباہ نہیں ہوتی، جب تک برائیاں کثرت کے ساتھ ان میں نہ پھیل جائیں، اور معصیت میں وہ اس قدر نہ ڈوب جائیں کہ ان کے نزدیک گناہ، گناہ ہی نہ رہے اور ان کے دل سے گناہ کا احساس تک ختم ہوجائے توایسے لوگ اللہ ﷻ کی پکڑ سے غافل ہوجاتے ہیں، تواللہ ﷻ کی طرف سے ایسے توایسے لوگوں پر عذاب بھیج کر نیست ونابود کردیاجاتاہے۔

عملی پہلو: عقل مند آدمی کو چاہیئے کہ جب سختی اور مصیبت آئے تو اسے اللہ ﷻ کی طرف سے تنبیہ سمجھ کر بُرے کاموں سے توبہ کرے ورنہ غفلت میں ڈوب گیاتو کہیں اچانک ایسی سخت پکڑ نہ ہوجائے کہ توبہ کا موقع بھی نہ مل سکے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایاجب تم کسی ایسے آدمی کو دیکھو جسے اس کی نافرمانیوں کے باوجود اللہ ﷻ ہر چیز دے رہاہے جسے وہ پسند کرتاہے تو سمجھو کہ اللہ ﷻ اسے ڈھیل دے رہاہے پھر نبی کریم ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ (مسند احمد)

علمی بات: اس آیت میں عام انسانوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ دنیامیں کسی شخص یاقوم پر عیش وعشرت کی فروانی دیکھ کر یہ دھوکہ نہ کھائیں، کہ یہ لوگ صحیح راہ پر ہیں اور بڑی کامیاب زندگی گزار رہے ہیں، بلکہ اکثراوقات یہ حالت ان نافرمانوں کی بھی ہوتی ہے، جن کو سخت سزامیں اچانک پکڑنے کا فیصلہ کیاجاچکاہوتاہے۔

آیت نمبر ۴۵: اس آیت میں نافرمانوں کو عذاب کے نتیجہ میں صفحہ ہستی سے مٹادینے کا ذکر ہے۔ مقصد یہ ہے کہ ظالم اور حق سے ناآشناطبقے کا دنیا سے مٹ جاناہی باقی دنیا کے لئے مفید ہے، کیونکہ جس طرح جسمانی بیماریاں تباہ کن اور متعدی ہوتی ہیں، اسی طرح روحانی امراض بھی ہولناک صورت اختیار کرلیتے ہیں اور اگر ان کو باقی رہنے دیاجائے، تو تمام قوم میں اخلاقی بگاڑ کا خطرہ بڑھ جاتاہے، اس لئے اللہ ﷻ ان کو دنیامیں مٹادیتاہے، تاکہ ان کے مفاسد اور ان کا نقصان ان تک محدود رہے۔

ظالموں کی ہلاکت لوگوں کے لئے اللہ ﷻ کا بڑا احسان ہے چنانچہ معاشرہ مفسدین سے پاک ہونے پر اللہ ﷻ کا شکر واجب ہے۔ ظالموں کو تباہ وبرباد کرنے کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے نعمتوں پر شکر کرنے کے بجائے ناشکری کی اور خوشی میں اطاعت الٰہی بجالانے کے بجائے گناہ کیئے۔ چنانچہ کفار کی تباہی وبربادی سے بقیہ اہل ایمان کو چھٹکارانصیب ہوجاتاہے، کیونکہ وہ ان کے عقائد واعمال کی نحوست سے پریشان ہوتے ہیں تو ایسوں کو تباہ وبرباد کردینا بھی اللہ ﷻ کی ایک نعمت ہے اور ہر نعمت پر شکر واجب ہے۔

عملی پہلو: قرآن حکیم کی آیت اور حدیث نبوی ﷺ سے معلوم ہوا کہ محض دنیاوی ترقی اور خوشحالی اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ جس فرد یا قوم کو یہ حاصل ہو تو وہ اللہ ﷻ کی پسندیدہ ہے اور اللہ ﷻ اس سے خوش ہے جیسا کہ بعض لوگ ایسا سمجھتے ہیں بلکہ بعض تو ایسے لوگوں کو اللہ ﷻ کے اس فرمان "ہمارے نیک بندے زمین کے وارث ہوں گے۔" (سورۃ الانبیاء ۲۱، آیت: ۱۰۵) کا مصداق قرار دے کر انھیں اللہ ﷻ کے نیک بندے تک قرار دیتے ہیں، ایسا سمجھنا اور کہنا غلط ہے۔ گمراہ قوموں یا افراد کی دنیاوی خوش حالی و مہلت آزمائش کے طور پر ہے اور یہ رب کی ناراضگی کی دلیل ہے۔

آیت نمبر ۴۶: علمی بات: ۱۔ اللہ ﷻ ہی نے کان آنکھ اور دل عطا فرمائے ہیں۔ اگر وہ ان نعمتوں کو سلب کرلے تو اس کے سوا انہیں کوئی لوٹا نہیں سکتا۔ انسان کے اشرف الاعضاء کان آنکھیں اور دل ہیں۔ اگر ان اعضاء کی صفات زائل ہو جائیں تو انسان کے حواس اور اس کی کارکردگی کا نظام فاسد ہو جائے گا اور وہ دین و دنیا کے فوائد حاصل کرنے سے محروم ہو جائے گا۔ معلوم ہوا کہ جس ذات نے ان قوتوں کو پیدا کیا اور ان کو زائل ہونے سے محفوظ رکھا ہے 'وہ اللہ ﷻ کے سوا کوئی نہیں ہے اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ ان عالی قدر نعمتوں کا دینے والا صرف اللہ ﷻ ہے تو پھر قابل تعظیم اور عبادت کا مستحق بھی صرف اللہ ﷻ ہی ہے۔

۲۔ اس آیت میں فرمایا ہے اگر وہ تمہارے دلوں پر مہر لگا دے مفسرین نے کئی معانی بیان کئے ہیں۔ اس کا ایک معنی یہ ہے کہ اللہ ﷻ کافروں کے دلوں پر مہر لگا دے جس سے وہ ہدایت کو نہ سمجھ سکیں اور اس کا دوسرا معنی یہ ہے کہ اللہ ﷻ ان کی عقلوں کو بالکل زائل کر دے اور وہ پاگلوں اور مجنونوں کی طرح ہو جائیں اور اس کا تیسرا معنی یہ ہے کہ اللہ ﷻ ان کے دلوں کو مردہ کر دے۔ کوئی بھی معنی مراد لیا جائے یہ سب ان کی بداعمالیوں کے سبب ہے۔

۳۔ اللہ ﷻ نے فرمایا ہے کبھی ہم انہیں اپنی نعمتیں یاد دلا کر ان کو ایمان لانے کی ترغیب دیتے ہیں اور کبھی انہیں پچھلی امتوں کا عذاب یاد دلا کر ڈراتے ہیں اور کبھی اس بات سے ڈراتے ہیں کہ اگر ہم چاہیں تو تمہارے اشرف الاعضاء کو معطل اور بے کار کر دیں اور کبھی اپنی الوہیت قدرت اور توحید پر دلائل پیش کرتے ہیں کہ تم ان دلائل سے متاثر ہو کر ایمان لے آؤ۔ مگر مشرکین کا حال یہ ہے کہ حسد اور غرور کی وجہ سے غور نہیں کرتے اور حق کو قبول نہیں کرتے۔

آیت نمبر ۴۷: اس سے پہلی آیت میں اللہ ﷻ نے انسان کے اشرف اعضاء کو زائل کرنے کی وعید سنائی تھی اور اس آیت میں عمومی عذاب کی وعید سنائی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ عذاب خواہ کسی قسم کا ہو 'اللہ ﷻ کے سوا اس عذاب کو کوئی دور کرنے والا نہیں ہے اسی طرح خواہ کسی قسم کی خیر اور بھلائی ہو اللہ ﷻ کے سوا اس کا کوئی عطا کرنے والا نہیں ہے۔ اس آیت میں عذاب کی دو قسمیں بیان فرمائی ہیں۔ اچانک اور کھلم کھلا کیونکہ یا تو عذاب سے پہلے اس کی علامتیں نمودار ہوں گی یا عذاب کی نشانیوں کے بغیر اچانک عذاب آئے گا۔ پہلا عذاب اس کی علامتیں ظاہر ہونے کے بعد اور دوسرا عذاب اچانک آنے والا ہے اول الذکر کو کھلم کھلا اس لئے فرمایا کہ اس عذاب کی علامتیں پہلے نمودار ہو چکی تھیں حتی کہ اگر وہ اس عذاب سے بچنا چاہتے تو وہ کفر اور سرکشی سے توبہ کر کے بچ سکتے تھے۔ اس آیت میں فرمایا ہے کہ اگر یہ عذاب آجائے تو ظالم لوگوں کے لئے ہلاکت سے بچنے کا کوئی راستہ نہ ہو گا۔

علمی بات: یہاں ایک سوال ذہن میں آتا ہے کہ جب عمومی عذاب آئے گا تو پھر نیک اور بد کی تمیز نہیں رہے گی اور کافروں کے ساتھ مومن بھی ہلاک ہو جائیں گے؟ ایک جواب مفسرین نے یہ دیا ہے کہ اگرچہ بظاہر کچھ مومن بھی اس سے متاثر ہوں گے لیکن حقیقت میں ہلاکت صرف کفار کے لئے ہو گی اور مومنوں کے لئے یہ ضرر عظیم ثواب اور بلند درجات کا سبب ہو گا اس لئے ان کے حق میں یہ ہلاکت نہیں ہے۔ اس کا ایک جواب یہ بھی ہے کہ اللہ ﷻ کی سنت جاریہ ہے کہ جب وہ کسی علاقہ کے کافروں پر عمومی عذاب نازل فرماتا ہے تو ایمان والوں کو وہاں سے نکال دیتا ہے 'جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کی قوموں پر جب عذاب نازل فرمایا تو ایمان والوں کو وہاں سے نکال لیا۔

نوٹ: پیغمبروں کو جھٹلانے والی قوموں پر عذاب حجت تمام ہونے کے بعد آتا ہے جیسا کہ سورۃ بنی اسرائیل ۱۷: آیت ۱۵ میں ذکر ہے "اور ہم عذاب دینے والے نہیں ہیں جب تک کہ ہم رسول نہ بھیج دیں۔"

آیت نمبر ۴۸: انبیاء رسل علیہم السلام لوگوں کو امن و سلامتی اور اللہ ﷻ کی طرف بلاتے ہیں، جنت کی خوش خبری دیتے ہیں اور جہنم سے ڈراتے ہیں۔ رسولوں کی اتباع کرنے والوں اور ان پر ایمان لانے والوں کا ٹھکانا جنت ہو گا۔ ایسے لوگوں کو نہ ماضی کا کوئی غم ہو گا اور نہ مستقبل کا کوئی خوف ہو گا۔

انبیاء کرام علیہم السلام کا مقرر شدہ کام: اس آیت کا معنی ہے کہ اللہ ﷻ رسولوں کو ترغیب دینے اور ڈرانے کے لئے بھیجتے ہیں۔ جیسے ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا: "اگر بستیوں والے ایمان لے آتے اور ڈرتے رہتے تو ہم ضرور ان پر آسمان اور زمین سے برکتیں کھول دیتے 'لیکن انہوں نے (رسولوں کی) تکذیب کی تو ہم نے ان کے کرتوتوں کی وجہ سے ان کو گرفت میں لے لیا، کیا بستیوں والے اس سے بے خوف ہیں کہ راتوں رات ان پر عذاب آجائے درآنحالیکہ وہ سو رہے ہوں"۔ (سورۃ الاعراف ۷، آیت: ۹۶، ۹۷) اللہ ﷻ نے رسولوں کو اس لئے بھیجا ہے کہ وہ خوشخبری سنائیں اور خبر دار کریں۔ اس لئے نہیں بھیجا کہ کفار ان سے من مانے اور فرضی معجزات طلب کریں۔ انبیاء کرام علیہم السلام صرف ان ہی معجزات کو پیش کرتے ہیں جن کی اللہ ﷻ کی طرف سے اجازت ہوتی ہے اور کسی انسان کی تسلی اور اطمینان کے لئے جس قدر معجزات کی ضرورت ہوتی ہے وہ اللہ ﷻ انبیاء کرام علیہم السلام کو عطا فرما دیتا ہے اور جو شخص ان معجزات کی وجہ سے انبیاء کرام علیہم السلام کی تصدیق کرتا ہے اور نیک اعمال کرتا ہے وہ آخرت میں عذاب سے بے خوف ہو گا اور جن لوگوں نے ان معجزات کے باوجود انبیاء کرام علیہم السلام کی تکذیب کی اور اللہ ﷻ کی نافرمانی کی ان کو آخرت میں عذاب ہو گا۔

آیت نمبر ۴۹: انبیاء ورسل علیہم السلام کی تکذیب کرنے والوں کے بارے میں ذکر ہے کہ وہ اپنی نافرمانیوں کی پاداش میں سزا بھگت کر رہیں گے۔

یعنی جس نے انبیاء کرام علیہم السلام کی باتوں پر یقین کیا اور اعتقاداً اور عملاً اپنی حالت درست کر لی تو اس کو حقیقی امن اور چین نصیب ہوا۔ اور جس نے اللہ ﷻ کی آیات کو جھٹلا کر ہدایت الٰہی سے روگردانی کی وہ نافرمانی اور بغاوت کی وجہ سے سخت تباہی اور عذاب عظیم میں گرفتار ہوا۔

آیت نمبر ۵۰: اس آیت میں کفار کے عجیب و غریب معجزے دکھانے کے مطالبوں کا جواب دیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے یہ کہلوایا گیا ہے کہ نہ وہ فرشتہ ہیں اور نہ ہی وہ خود سے معجزات دکھا سکتے ہیں۔ آپ ﷺ نے منصبِ رسالت کے ساتھ پیغامِ حق پیش فرما دیا ہے اور آپ ﷺ وحی کے مطابق احکام کی پیروی کرتے ہیں۔ انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت پر لبیک کہنے والے بینا ہوتے ہیں جو ان کو نابینا سے ممتاز کرتے ہیں یعنی اندھا اور بینا گمراہ اور ہدایت یافتہ اور مومن اور کافر برابر نہیں ہو سکتے۔

علمی بات: نبی کریم ﷺ کے حوالہ سے اس معاملہ میں کسی مسلمان کو کلام نہیں ہو سکتا کہ اللہ ﷻ نے نبی کریم ﷺ کو بذریعہ وحی تمام فرشتوں اور اولین و آخرین کو جتنا علم دیا گیا ہے، ان سب سے زیادہ حضور ﷺ کو علم عطا فرمایا گیا ہے۔ اور مخلوقات میں سب سے زیادہ علم عطا فرمایا اور آپ علیہ السلام کو قرب خداوندی کا وہ مقام نصیب ہوا جو کسی نبی رسول اور مقرب فرشتے کو عطا نہیں کیا گیا یہی پوری امت کا عقیدہ ہے۔ ہاں اس کے ساتھ ہی قرآن وسنت کی بے شمار تصریحات کے مطابق تمام ائمہ سلف وخلف کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ تمام کائنات کا علم محیط صرف اللہ ﷻ کی مخصوص صفت ہے۔ جس طرح اس کے خالق ورزاق، قادر مطلق ہونے میں کوئی فرشتہ یا رسول اس کے برابر نہیں ہو سکتا 'اسی طرح اس کے علم محیط میں بھی کوئی اس کے برابر نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے اللہ ﷻ کے سوا کسی فرشتہ یا پیغمبر کو لاکھوں چیزیں معلوم ہونے کے باوجود عالم الغیب نہیں کہا جا سکتا۔ خلاصہ یہ ہے کہ سرور کائنات سید الرسل امام الانبیاء محمد مصطفیٰ ﷺ کے کمالات کے بارے میں بڑا جامع جملہ یہ ہے کہ "بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر"۔ کمالات علمی میں بھی یہی ہے کہ اللہ ﷻ کے بعد تمام فرشتوں اور انبیاء ورسل علیہم السلام سے آپ ﷺ کا علم بڑھا ہوا ہے، مگر اللہ ﷻ کے برابر نہیں جیسا کہ عیسائیوں کا عقیدہ ہے۔ آیت کے آخر میں یہ ارشاد فرمایا کہ اندھا اور بینا برابر نہیں ہو سکتے، مطلب یہ ہے کہ نفسانی خواہشات، ضد وعناد کو چھوڑ کر حقیقت کو مانو تاکہ تمہارا شمار اندھوں میں نہ رہے، تم صاحب بصیرت اور بینا ہو جاؤ اور یہ بینائی تمہیں اللہ ﷻ کی آیات میں غور وفکر سے حاصل ہو سکتی ہے۔

آیت نمبر ۵۱: تمام رسول خوش خبری سنانے اور خبر دار کرنے کے لئے آتے رہے ہیں۔ اس آیت میں بتایا جارہا ہے یہ فریضہ منصب رسالت قرآنِ حکیم کے ذریعے سے سرانجام دیا جائے۔

علمی بات: ۱۔ اس آیت میں نبی کریم ﷺ کو یہ ہدایت دی گئی ہے کہ ان واضح آیات کے بعد بھی اگر یہ لوگ اپنی ضد سے باز نہ آئیں تو ان سے بحث و مباحثہ کو موقوف کر دیجئے اور اصلی فریضہ رسالت، تبلیغ دین اس میں مشغول ہو جایئے، اور اسی دعوت کا رخ ان لوگوں کی طرف پھیر دیجئے، جو قیامت میں اللہ ﷻ کے سامنے پیشی اور حساب کتاب کا عقیدہ رکھتے ہیں، جیسے مسلمان یا وہ جو کم از کم اس کے منکر نہیں، بطور احتمال کے ہی سہی، کم از کم ان کو خطرہ تو ہے کہ شاید ہمارے اعمال کا ہم سے حساب لیا جائے۔ خلاصہ یہ ہے کہ قیامت کے متعلق تین طرح کے آدمی ہیں، ایک وہ جو یقینی طور پر اس کے معتقد ہیں، دوسرے وہ جو متردد ہیں، تیسرے وہ جو بالکل منکر ہیں، اور دین کی تبلیغ کا حکم انبیاء کرام علیہم السلام کو اگرچہ ان تینوں طبقوں کے لئے عام ہے، جیسا کہ بہت سے ارشادات قرآنی سے واضح ہے، لیکن پہلے دو طبقوں میں چونکہ اثر قبول کرنے کی توقع زیادہ ہے، اس لئے اس آیت میں خاص طور پر ان کی طرف توجہ کرنے کی ہدایت فرمائی گئی "وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ "۔

۲۔ اس آیت میں مشرکین کے اس عقیدے کی تردید ہے کہ وہ اپنے دیوتاؤں کو سفارشی سمجھتے تھے، لہذا اس سے آنحضرت ﷺ کی اس شفاعت کی تردید نہیں ہوتی جو آپ اللہ ﷻ کی اجازت سے مومنوں کے لئے کریں گے کیونکہ دوسری آیتوں میں مذکور ہے کہ اللہ ﷻ کی اجازت سے شفاعت ممکن ہے۔ (مثلاً سورۃ البقرہ ۲، آیت: ۲۵۵) جب کہ مشرکین کا گمان یہ تھا کہ براہ راست اللہ ﷻ سے مدد طلب کرنے کے بجائے اگر ہم ان بتوں کا واسطہ وذریعہ بنائیں گے تب ہماری مطلب براری ہو گی۔

قرآن سمجھنے اور سمجھانے کی فضیلت: ۳۔ قرآن حکیم کو سمجھنا اور پھر آگے سمجھانا بہت بڑی بات ہے اللہ ﷻ نے اس کو جہاد کبیر فرمایا ہے۔ چناچہ سورۃ الفرقان ۲۵، آیت: ۵۱ میں ہے۔ "اور آپ اس (قرآن) کے ذریعے ان سے بڑا جہاد کریں۔" تو یہاں جہاد کبیر سے مراد قرآن حکیم کی تعلیم ہے اور اس کا سمجھانا مراد ہے، قرآنِ حکیم کی نشر واشاعت کرنا مراد ہے نیز اس کے پیغام کو عام کرنا اس کی آیات کے ذریعہ سے باطل عقائد و نظریات کا رد کرنا مراد ہے۔

آیت نمبر ۵۲ : شانِ نزول: آپ ﷺ کی مجلس میں غرباء صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بیٹھے رہتے تھے جن کی اپنی کوئی جائیداد تھی نہ کاروبار، صاحب حیثیت اللہ ﷻ کے نیک بندے ان کے طعام کا انتظام کرتے تھے اور یہ صرف آپ ﷺ کی خدمت میں رہا کرتے تھے جیسے حضرت بلال رضی اللہ عنہ، حضرت صہیب رضی اللہ عنہ، حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ، حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ، حضرت عمار رضی اللہ عنہ، حضرت یاسر رضی اللہ عنہ، بعض مالی اعتبار سے کمزور تھے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ۔ قریش مکہ کے کچھ سرداروں نے یہ کہا تھا کہ آنحضرت ﷺ کی مجلس میں اکثر کم حیثیت کے لوگ رہتے ہیں، ان کی موجودگی میں آپ کی مجلس میں بیٹھنا ہماری توہین ہے، اگر آپ ان لوگوں کو اپنی مجلس سے اٹھادیں تو ہم آپ کی بات سننے کے لئے آسکتے ہیں اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی۔

نوٹ: اللہ ﷻ نے ان لوگوں کی رعایت و دلجوئی کا حکم فرمایا جو دین اسلام قبول کر کے اپنے رب سے لو لگائے رہتے ہیں۔ اور مکہ کے رؤسا کی درخواست رد فرمادی۔ اس سے جہاں ان حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی فضیلت معلوم ہوئی جن کو غریبی کی وجہ سے رؤسا عرب نے حقیر سمجھا تھا۔ وہاں یہ بھی معلوم ہوا کہ جو لوگ اسلام قبول کر چکے ہوں ان کی رعایت اور دلجوئی ان لوگوں سے مقدم ہے جو ابھی تک منکرین اسلام ہیں۔

عملی پہلو: ۱۔ سچے اہل ایمان کی یہ شان بیان ہوئی کہ وہ صبح شام اللہ ﷻ کو پکارتے ہیں اور صرف اللہ ﷻ کی رضا ان کا مقصود و مطلوب اور مطمع نظر ہوا کرتی ہے۔

۲۔ متکبرین کی سزا اور مال و دولت پر گھمنڈ کرنے والوں پر تنبیہ کی گئی ہے کہ جن لوگوں کے پاس مال و دولت ہو، یا کسی منصب پر فائز ہوں۔ ان میں ایک بڑا مرض یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ غریبوں اور مسکینوں کو حقیر سمجھنے لگتے ہیں۔ انہیں اس لائق بھی نہیں سمجھتے کہ وہ پاس بیٹھیں حتیٰ کہ وہ سلام بھی

کریں تو سلام کا جواب دینے میں عار اور ذلت محسوس کرتے ہیں یہ تکبر ہے اور تکبر بدترین خصلت ہے۔ یہ صفت انسان کو حق قبول کرنے سے اور کفر کو چھوڑ کر اسلام میں داخل ہونے سے روکتی ہے اور آخرت میں اس کا بڑا عذاب ہے۔

۳۔ ہر شخص اپنے اعمال کا خود جواب دہ ہے لہذا ہمیں اپنی آخرت اور نجات کے لئے خود فکر مند ہونا چاہیئے اور ایمان اور یقین کی دولت سے بہرہ مند ہونے کے بعد اعمال صالحہ کا اہتمام کرنا چاہیئے۔

آیت نمبر ۵۳: غنیٰ اور فقر انسان کی آزمائش کے لئے ہے۔ اللہ ﷻ نے بعض کو بعض کے ذریعے آزمائش میں ڈالا ہے جو غنی ہیں وہ فقیر کو حقیر سمجھتے ہیں۔ نیز یہ بھی آزمائش ہے کہ نادار مسلمان کفار کی باتوں پر کس حد تک صبر کرتے ہیں۔ اس آیت میں غریب اہل ایمان کا مذاق اُڑانے والے کفار و مشرکین کا ذکر کرکے یہ بتایا گیا ہے کہ یہ ایک آزمائش ہے جن لوگوں کو کسی طرح کی برتری حاصل ہے وہ نعمت عطا کرنے والے کا شکر ادا کرنے کے بجائے متکبر بن کر ان لوگوں کی طرف دیکھتے ہیں جو اس نعمت سے محروم ہیں حالانکہ وہ اپنے سے کمزور لوگوں کو دیکھ اللہ ﷻ کے فضل کا احساس کرتے تو ضرور شکر بجالاتے۔ لیکن مال و دولت اور اختیار و اقتدار کے نشہ میں دوسروں کو حقیر سمجھنے لگتے ہیں اور اس طرح امتحان میں ناکام ہو جاتے ہیں۔

علمی بات: ۱۔ سورۃ الاحقاف میں فرمایا "اور کافر ایمان والوں کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ اگر یہ (دین) کچھ بہتر ہوتا تو یہ لوگ اسے قبول کرنے میں ہم سے آگے نہ بڑھتے اور جب انہوں (یعنی کافروں) نے اس سے ہدایت حاصل نہ کی تو اب یہ کہیں گے کہ یہ پرانا جھوٹ ہے۔" (سورۃ الاحقاف ۴۶، آیت: ۱۱) اللہ ﷻ نے جسے مال و دولت عطا فرمایا ہے اُسے چاہیئے کہ وہ غریبوں کو حقیر جاننے کی بجائے منعم حقیقی کی طرف رجوع کرے اور وہ طریقہ تلاش کرے جو اس کے رب کو پسند ہے اور ناشکری و نافرمانی سے پرہیز کرے اور جب حق بات پہنچ جائے تو اسے فوراً قبول کرے۔ اور اس خیال سے حق بات کو بہتر نہ سمجھنا کہ غریبوں نے اسے حق قبول کر لیا ہے اس لئے ہم اسے قبول نہیں کرتے ان کا یہ خیال تکبر اور حماقت پر مبنی ہے لہذا ہمیں اس سے واضح طور پر یہ پتا چلا کہ سمجھداری و ذہانت کا امیری و غریبی سے کوئی تعلق نہیں۔

۲۔ عہد نبوت میں ایسے متکبر لوگ بھی تھے جن کا ذکر آیت شریفہ میں ہوا۔ آج بھی ایسے لوگ ہیں جو اپنے مال و دولت کے نشہ میں دین سے وابستہ رہنے والوں کو حقیر سمجھتے ہیں یہ لوگ اسلام کے دعویدار بھی ہیں لیکن اسلام پر چلنے والوں اور نیک اعمال اختیار کرنے والوں کو حقیر جانتے ہیں کہ ان کے کپڑے پھٹے پرانے، رہنے کا کچا مکان، بھوک پیاس کے ستائے ہوئے ہیں۔ مالداری اور غریبی اللہ ﷻ کے نزدیک مقبول ہونے کا پیمانہ نہیں ہے بلکہ اصل پیمانہ تقویٰ ہے۔ اللہ ﷻ کا قرب اور اللہ ﷻ کے ہاں درجات کی بلندی تقوی کی بنیاد پر ہے۔ جس طرح بہت سے مال دار اللہ ﷻ کی یاد سے غافل ہیں۔ تارک فرائض و واجبات ہیں اسی طرح بہت سے غریبوں اور مسکینوں کا بھی یہی حال ہے کہ وہ عبادت سے غافل اور مالداروں سے حسد کا شکار ہیں اور ان میں اکثر اللہ ﷻ پر اعتراض کرتے ہیں کہ اللہ ﷻ نے ان کو دیا اور ہم کو نہ دیا۔ ایسی غریبی وبال اور باعث مواخذہ و عذاب ہے امیر ہو یا غریب سب پر لازم ہے کہ شریعت کے احکام کی پابندی کریں اچھے اخلاق اختیار کریں گناہوں سے بچیں اور متقی بنیں۔

عملی پہلو: رسول اللہ ﷺ نے سب کو زندگی گزارنے کا ایک طریقہ بتایا ہے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی شخص ایسے شخص کو دیکھے جو مال میں اور شکل و صورت میں اس سے بڑھ کر ہے تو اسے چاہیئے کہ اپنے سے نیچے والے کو بھی دیکھ لے۔ (صحیح مسلم) دنیاوی چیزوں میں اپنے سے نیچے کو دیکھا جائے تاکہ عبرت اور جذبہ شکر پیدا ہو اور یہ سمجھ میں آئے کہ اللہ ﷻ نے ہمیں ہزاروں لاکھوں افراد سے بہتر بنایا ہے اور بہت زیادہ دیا ہے اور دین میں اپنے سے اوپر والے کو دیکھا جائے جو دین میں ہم سے آگے ہیں، جو لوگ اللہ ﷻ کی یاد و تقویٰ میں لگے رہتے ہیں ان کی برابری بلکہ ان سے آگے بڑھنے کی کوشش کرے۔

نوٹ: مساکین صالحین کی فضیلت: غریب مسلمانوں کو ایمان اور اعمال صالحہ کی وجہ سے فضیلت حاصل ہے۔ قیامت میں اس کا یہ فائدہ پہنچے گا کہ مالداروں سے پہلے جنت میں چلے جائیں گے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں ایک مرتبہ ضعفاء مہاجرین کے پاس بیٹھ گیا (جن کے

پاس مال نہ تھا اور کپڑوں کی اس قدر کمی تھی کہ) ان میں سے بعض بعض کے ذریعہ آپس میں پردہ کرتے تھے۔ (یعنی اس ترتیب سے بیٹھے تھے کہ ستر چھپانے کے بعد بقیہ بدن پر ایک دوسرے کی نظر نہ پڑے) ایک صاحب ان میں سے قرآنِ حکیم پڑھ رہے تھے وہ اسی حال میں تھے کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے آپ ﷺ قریب میں تشریف لا کر کھڑے ہوگئے آپ ﷺ کے تشریف لانے پر قاری خاموش ہوگئے۔ آپ ﷺ نے سلام کیا۔ پھر فرمایا تم کیا کر رہے تھے ہم نے عرض کیا کہ ہم کان لگا کر اللہ ﷻ کی کتاب سن رہے تھے آپ ﷺ نے فرمایا: "کہ سب تعریف اللہ ﷻ کے لئے ہے جس نے میری امت میں ایسے افراد بنا دیئے جن کے ساتھ مجھے جم کر بیٹھنے کا حکم دیا گیا۔" اس کے بعد آپ ﷺ نے اشارہ فرمایا جس پر حاضرین نے حلقہ بنا لیا اور سب ہمہ تن آپ ﷺ کی طرف متوجہ ہوگئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ اے مہاجرین و مساکین! تم اس بات کی خوشخبری قبول کر لو کہ تمہیں قیامت کے دن مکمل نور عطا کیا جائے گا اور تم مالداروں سے آدھے دن پہلے جنت میں داخل ہوگے اور یہ آدھا دن پانچ سو سال کا ہوگا۔ (سنن ابی داؤد)

آیت نمبر ۵۴: اہل ایمان کی دلجوئی کے لئے نبی کریم ﷺ کے طرف سے سلامتی کی دعائیں اور رحمت کی بشارت کا ذکر ہے کہ لاعلمی میں گناہ ہو جانے پر توبہ، اصلاح احوال کرنے پر کامیابی کی بشارت ہے نیز اللہ ﷻ کی شان رحمت اور غفاری کا بیان ہے کہ وہ گناہوں کو بخش دینے اور انتہائی رحم فرمانے والا ہے۔

شانِ نزول: i۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ یہ آیت ان لوگوں کے متعلق نازل ہوئی ہے جو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اسلام لانے سے پہلے ہم سے بڑے بڑے گناہ سرزد ہوگئے ہیں رسول اللہ ﷺ خاموش رہے تو یہ آیت نازل ہوئی۔

ii۔ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے اشارۃً یہ کہا تھا کہ مالدار کافروں کی دلجوئی کے لئے مسکین کافروں کو موخر کر دیجئے اور جب یہ آیت نازل ہوئی اور (ان مسکین مسلمانوں کو) دور نہ کیجئے جو صبح و شام اپنے رب کی عبادت کرتے ہیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے اس مشورہ پر معذرت کرتے ہوئے اور استغفار کرتے ہوئے آئے تب یہ آیت نازل ہوئی۔

علمی بات: آپ ﷺ کو خطاب کر کے ہدایت فرمائی گئی کہ جب آپ ﷺ کے پاس ہمارے یہ بندے آئیں جو ہماری آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں تو آپ ﷺ سلامتی اور رحمت کی دعا کے ساتھ انھیں خوش آمدید کہا کریں اور ان کو ہماری طرف سے یہ خوشخبری سنا دیں کہ اللہ ﷻ نے اپنے فضل سے ایمان والوں پر رحمت کو اپنے اوپر واجب کر رکھا ہے، یہاں حقیقی قدر و قیمت ایمان و یقین کی دولت کی ہے جس سے یہ حضرات متصف ہیں، پس وہ ان کو اپنی رحمت سے ضرور نوازے گا اسی رحمت میں سے ہے کہ اگر اِنہی میں سے کسی سے نادانی کی بناء پر کوئی غلطی صادر ہو جائے اور اسکے بعد وہ توبہ اور اصلاح احوال کرے تو اللہ ﷻ بڑا ہی بخشنے والا مہربان ہے۔

نوٹ: سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جب اللہ ﷻ نے مخلوق کو پیدا کیا تو اپنی کتاب میں لکھا اور وہ کتاب اس کے پاس عرش پر موجود ہے کہ میری رحمت میرے غضب پر غالب آگئی ہے۔" (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

آیت نمبر ۵۵: اللہ ﷻ آیات تفصیل سے بیان فرماتا ہے تاکہ حق کھل کر واضح ہو جائے اور طالب حق کے لئے قبول حق آسان ہو جائے اور مجرموں کا راستہ بھی واضح ہو جائے تاکہ خیر کے طلبگار اُس بُرے انجام سے بچیں جو کفار کے لئے مقرر ہے اور عنقریب انہیں اس سے دوچار ہونا ہے۔

علمی بات: مجرمین کی صفات: ایسے مجرموں کے حالات کچھ تو پہلے بیان ہو چکے ہیں یعنی ایسے لوگ ایمان لانے کے قریب تو آتے نہیں مگر مطالبات اور اعتراضات کیئے جاتے ہیں مثلاً ہمیں فلاں معجزہ لا کر دکھا دو یا فلاں بات کا پتہ دو تو تب ہم ایمان لائیں گے اور کبھی یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ اگر حقیر قسم کے لوگ آپ اپنی مجلس سے نکال دیں تو تب ہی ہم آپ کی مجلس میں آسکتے ہیں۔ کچھ بری صفات تو ان مجرموں کی سابقہ آیات میں مذکور ہو چکیں اور کچھ آگے ذکر ہو رہی ہیں۔ اللہ ﷻ کا فرمان ہے کہ یہ تفصیلات اس لئے بیان کی جا رہی ہے تاکہ ایسے ہٹ دھرم لوگوں کی بری صفات کھل کر سامنے آجائیں۔

آیت نمبر ۵۶: مشرکین کی پیشکش کا ذکر ہو رہا ہے کہ ایک معین عرصے تک ان کے بتوں کی پوجا کی جائے اور بدلے میں وہ اتنے ہی عرصہ خالصتاً اللہ ﷻ کی عبادت کر لیں گے۔ مشرکین مکہ یہ چاہتے تھے کہ کوئی درمیانی راہ نکل آئے۔ تاکہ رسول اللہ ﷺ ہمارے معبودوں کی توہین نہ کریں اور ہم انہیں کچھ نہ کہیں۔ آپ ﷺ کی تعلیم یہ تھی کہ یہ بت نہ کسی کا کچھ بگاڑ سکتے ہیں اور نہ سنوار سکتے ہیں اور ان کے گمان کے مطابق اس توحید کی دعوت سے نہ صرف ان کے بتوں کی توہین ہوتی تھی بلکہ وہ اس میں اپنی اور اپنے آباواجداد کی بھی توہین سمجھتے تھے اسی لئے وہ سٹپٹاتے تھے چنانچہ اس بات کے جواب میں اللہ ﷻ نے فرمایا کہ ان سے کہہ دو کہ نہ میں تمہاری اس خواہش کو پورا کر سکتا ہوں نہ ہی ان باطل معبودوں کی تعظیم کر سکتا ہوں میں تو مامور ہی اس بات پر ہوں کہ لوگوں کا تعلق ان جھوٹے معبودوں سے توڑ کر اللہ ﷻ سے جوڑ دوں۔ اللہ ﷻ نے اپنے محبوب ﷺ کو حکم دیا کہ آپ ﷺ کھلے الفاظ میں اعلان کر دیں کہ میں تمہارے جھوٹے خداؤں کی عبادت ہر گز نہیں کروں گا اس خام خیالی کو ہمیشہ کے لئے اپنے ذہنوں سے نکال دو۔ کیونکہ نہ عقل سلیم اس کی اجازت دیتی ہے کہ خالق دوجہان کو چھوڑ کر کسی غیر کی عبادت کی جائے اور نہ توحید کی روشن دلیلوں نے اس کے لئے کوئی گنجائش چھوڑی ہے۔ اس لئے عقل و نقل کے خلاف ایک صریح باطل کو کیوں کر اختیار کیا جا سکتا ہے۔

علمی بات: یعنی نزول قرآنِ حکیم سے پہلے فطری طور پر اور نزول قرآنِ حکیم کے بعد شرعی طور پر رب نے مجھے بت پرستی سے منع فرما دیا ہے۔ اس لئے نبی کریم ﷺ نے کبھی بھی بت پرستی نہ کی اور کسی نافرمانی کے کام کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا حتیٰ کہ کبھی غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا ہوا جانور نہیں کھایا۔ نبی کریم ﷺ کی اطاعت عبادت، تقوی، پرہیز گاری نبوت کے ملنے پر موقوف نہ تھی بلکہ آپ ﷺ نبوت ملنے سے قبل بھی صادق و امین تھے اور ہر قسم کی برائیوں سے دور تھے۔

آیت نمبر ۵۷: مشرکین کی ہٹ دھرمی کا ذکر ہے جو نبی کریم ﷺ سے عذاب کا مطالبہ کرتے تھے۔ رسول ﷺ کے ذریعہ وضاحت کی گئی ہے کہ عذاب دینے کا اختیار بھی اللہ ﷻ کا ہے۔

علمی بات: مفسرینِ کرام فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ انہیں ڈرایا کرتے کہ اگر تم نے شرک نہ چھوڑا تو عذاب الٰہی آئے گا اور تم نیست و نابود کر دیئے جاؤ گے۔ وہ بطور مذاق کہتے کہ ہم آپ کا دین قبول نہیں کرتے پھر ہم پر جلدی عذاب اتاریئے بلکہ وہ تو یہ دعا بھی مانگا کرتے کہ اے اللہ ﷻ! اگر یہ دین سچا ہے تو ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش کر۔ اللہ ﷻ ان کی اِس بات کے رد میں اپنے محبوب ﷺ کو یہ جواب دینے کی ہدایت فرما رہے ہیں کہ اے کفار! جس عذاب کے لئے تم جلد بازی کر رہے ہو۔ وہ اللہ ﷻ کے دست قدرت میں ہے۔ جب چاہے گا اتارے گا اور اس وقت اس کے غضب سے تمہیں کوئی نہ بچا سکے گا۔ جیسا کہ سورۃ الانفال ۸، آیات: ۳۲، ۳۳ میں بیان ہوا ہے۔

آیت نمبر ۵۸: آپ ﷺ سے فرمایا جا رہا ہے کہ آپ ﷺ مشرکین کو بتا دیجئے کہ جس چیز (یعنی عذاب) کو تم جلدی طلب کر رہے ہو اس کو لانے کا اختیار میرے پاس نہیں ہے۔ نیز آپ ﷺ یہ فرما دیجئے! اگر میرے پاس وہ چیز ہوتی جس کو تم جلدی طلب کر رہے ہو تو میرے اور تمہارے درمیان (کبھی کا) فیصلہ ہو چکا ہوتا۔

اس آیت سے مراد یہ ہے کہ اس عذاب کو نازل کرنا صرف اللہ ﷻ کی قدرت اور اس کے اختیار میں ہے۔ وہ اگر چاہے گا تو عذاب نازل فرمائے گا اور اگر وہ اپنی کسی حکمت کی بنا پر عذاب نازل نہ کرنا چاہے تو نہیں فرمائے گا ' مجھے اس عذاب کے نازل کرنے یا اسے مقدم و موخر کرنے پر قدرت نہیں ہے ' اور اگر بالفرض یہ معاملہ میرے اختیار میں ہوتا تو میں تمہارے مطالبہ پر عذاب لا چکا ہوتا۔

آیت نمبر ۵۹: اللہ ﷻ کے علم کی وسعت کا بیان ہے کہ اللہ ﷻ ہر شی کے کل و جز، اصل و فرع کے ساتھ ساتھ تمام تر جزئیات سے بھی واقف ہے۔ یعنی ہر بڑی اور چھوٹی بات اس کے علم میں ہے۔

علمی بات: ا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "رطب" سے مراد وہ ہے جو اگتا ہے اور "یابس" سے مراد وہ ہے جو نہیں اگتا۔ بعض علماء نے فرمایا کہ رطب و یابس سے تمام اجسام مراد ہیں اس لئے کہ اجسام کی دو قسمیں ہیں یعنی رطب اور یابس، اور ایک قول یہ بھی ہے کہ رطب سے "حی" یعنی زندہ اور یابس سے "بے جان" چیزیں مراد ہیں۔ مفسرین کی ایک جماعت نے "کتاب مبین" سے لوح محفوظ کو مراد لیا ہے۔ "کتاب مبین"۔ ایک اصطلاح ہے، جو تعبیر ہے علم الٰہی سے یعنی خدا کے علم میں کائنات کی تمام تفصیلات موجود ہیں، وہ بحر و بر کی وسعتوں سے آگاہ ہے، پتے پتے سے واقف ہے، زمین کی تاریکیوں میں جو کچھ بھی ہے، اسے علم ہے، اللہ ﷻ کا علم ازلی ہے اور ابدی ہے اسے جاننے یاد رکھنے کے لئے کسی کتاب کی ضرورت نہیں لوح محفوظ میں لکھنے کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ جو کچھ وجود میں آتا رہے فرشتوں کو اس کا علم ہوتا رہے کہ یہ سب معلومات الٰہیہ میں سے ہے اور مخلوقات الٰہیہ میں سے ہے اور ایک یہ حکمت بھی ہے کہ جو لوگ مکلف (یعنی احکامات پر عمل کرنے کے پابند) ہیں وہ یہ یقین کر لیں کہ ہمارے اعمال میں سے کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو لکھنے سے رہ گئی ہو۔ اس کتاب کو لوح محفوظ اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ تحریف سے اور شیاطین کے وہاں تک پہنچنے سے محفوظ ہے کوئی اس میں ردوبدل نہیں کر سکتا۔

۲۔ اللہ ﷻ اپنی صفات میں ایسا کامل ہے کہ کوئی مخلوق کسی صفت میں اس کے برابر نہیں ہو سکتی، پھر ان صفات میں بھی دو صفتیں سب سے زیادہ ممتاز ہیں، ایک علم دوسری قدرت، اس کا علم بھی تمام موجود و غیر موجود، ظاہر اور مخفی، بڑے اور چھوٹے ہر ذرہ ذرہ پر حاوی اور محیط ہے، اور اس کی قدرت بھی ان سب پر پوری طرح غالب اور حاوی ہے۔

آیت نمبر ۶۰: اس آیت میں نیند کو موت سے اور نیند کے بعد بیداری کو دوبارہ جی اٹھنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ نیند اور اس کے بعد بیداری کی مثال پیش فرما کر پورے عالم کی موت اور پھر دوبارہ زندگی کے متعلق تنبیہ کی گئی ہے۔ نیز روز قیامت اللہ ﷻ کی بارگاہ میں پیشی اور اعمال کا حساب و کتاب بیان فرمایا گیا۔ سونا اور جاگنا، کام اور آرام 'دن اور رات 'زندگی اور موت کا ایک سلسلہ ہے جو ہر انسان کے ساتھ لگا ہوا ہے تاکہ انسان ان تغیرات اور انقلابات سے عبرت حاصل کر سکے۔ وہ لوگ جو آئندہ جی اٹھنے پر یقین نہیں کرتے وہ اس پر غور کریں کہ کس طرح نیند انہیں ہر روز مغلوب کر دیتی ہے۔ وہ نیند پر قابو نہیں پا سکتے۔ اسی طرح موت ان پر قابو پالے گی اور وہ موت پر قابو نہیں پا سکیں گے۔ کس طرح وہ ہر نیند کے بعد جاگ اٹھتے ہیں۔ اسی طرح وہ موت کی نیند کے بعد بھی جاگ اٹھیں گے اور حساب و کتاب کے لئے اللہ ﷻ کے سامنے پیش کر دیئے جائیں گے۔ اور قیامت کے دن جب دوسرا صور پھونکا جائے گا 'سارے مردے اپنی اپنی قبروں سے نکل پڑیں گے۔ پہلا جملہ جو وہ کہیں گے یہی ہو گا "ہمیں کس نے نیند سے بیدار کر دیا؟"۔

علمی بات: یہاں "تَوَفّٰی" کا لفظ نیند کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس کا حقیقی معنی ہے کسی چیز کو پورا پورا لے لینا۔ کیونکہ نیند کے وقت انسان کا عقل و شعور معطل ہو جاتا ہے۔ چلنے پھرنے، دیکھنے سننے وغیرہ کی قوتیں بے کار ہو جاتی ہیں۔ اس بنا پر "تَوَفّٰی" کا لفظ استعمال ہوا۔ اور موت کے وقت بھی مرنے والا شخص چونکہ اپنے مقررہ دن پورے گزار چکا ہوتا ہے اس لئے وہاں بھی "تَوَفّٰی" کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ "تَوَفّٰی" کا یہ مفہوم خوب ذہن نشین رہنا چاہیئے۔ تاکہ کوئی بھی شخص توفی کا معنی اور مراد فقط موت قرار دے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات سے انکار نہ کر سکے جو کہ قرآن و حدیث سے واضح طور پر ثابت ہے۔

عملی پہلو: جو اللہ ﷻ نیند کے بعد اُٹھاتا ہے وہی موت کے بعد زندگی عطا فرمائے گا اور پھر اس کے حضور حاضری ہے اور وہاں لوگوں کے تمام اعمال پیش ہوں گے۔

آیت نمبر ۶۱: اللہ ﷻ اپنے سب بندوں پر پر زور قوت رکھتا ہے۔ قیامت کے دن جب اللہ ﷻ لوگوں کو زندہ فرمائے گا تو فرشتے ان کو اللہ ﷻ کی بارگاہ میں پیش کریں گے جو ان کا حقیقی مالک ہے۔ اس دنیا میں تو نمرود اور فرعون جیسے کئی ظالم لوگ ناحق حاکم بن کر اپنا حکم چلاتے رہے ہیں اور حقیقی مالک کو تسلیم نہیں کیا مگر قیامت کے دن ہر خاص و عام اور کافر و مومن کو مشاہدہ ہو جائے گا کہ حقیقی مالک تو صرف اللہ ﷻ ہے۔ اس دن صرف اسی کے حکم کے مطابق فیصلے ہوں گے اور اس کا کوئی فیصلہ عدل و انصاف کے خلاف نہ ہو گا۔

علمی پہلو: ۱۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تمہارے پاس رات اور دن کے فرشتے ڈیوٹیاں بدل کر آتے جاتے ہیں اور فجر اور عصر کی نماز میں ان کا اجتماع ہو جاتا ہے پھر وہ فرشتے جو رات کو تمہارے پاس رہے تھے اوپر چلے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سے دریافت فرماتا ہے حالانکہ وہ اپنے بندوں کو اچھی طرح جانتا ہے کہ تم نے میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا؟ وہ جواب میں عرض کرتے ہیں کہ ہم نے ان کو نماز پڑھتے ہوئے چھوڑا اور جب ہم ان کے پاس گئے تو اس وقت بھی نماز پڑھ رہے تھے۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

۲۔ حضرات مفسرین کرام فرماتے ہیں فرشتے اپنے کام کے اعتبار سے تین اقسام پر مشتمل ہیں:

i۔ وہ فرشتے جو انسانی حفاظت پر مامور ہیں اور ان کو مضرتوں سے بچاتے ہیں۔ جیسا کہ سورۃ الرعد ۱۳، آیت:۱۱ میں فرمایا گیا ہے۔ "اس کے پہرے دار (مقرر) ہیں اس (انسان) کے آگے بھی اور پیچھے بھی وہ اللہ کے حکم سے اُس کی حفاظت کرتے ہیں"۔

ii۔ وہ فرشتے جو انسان کی حفاظت اور اس کے احوال تحریر کرتے ہیں۔ جیسا کہ سورۃ الانفطار ۸۲، آیت:۱۱،۱۰ میں فرمایا گیا ہے "اور یقیناً تم پر محافظ (فرشتے) مقرر ہیں۔ بہت معزز (تمہارے اعمال) لکھنے والے ہیں"۔

iii۔ وہ فرشتے جو انسان کی روح نکالنے کے لئے مقرر کیئے گئے ہیں اس قسم کے فرشتوں کے سردار حضرت عزرائیل علیہ السلام ہیں، باقی ان کے مددگار ومعاون ہیں، قرآنِ حکیم میں ایک مقام پر موت کی نسبت ملک الموت کی طرف ہے اور ایک مقام پر دیگر فرشتوں کی طرف ہے اور ایک مقام پر اللہ تعالیٰ کی طرف ہے کسی میں کوئی تعارض نہیں حقیقت میں سب کو موت دینے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

۳۔ سیدنا حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ ملک الموت کا تسلط زمین کی تمام چیزوں پر اسی طرح ہے جس طرح اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چیز پر ہوتا ہے، تمام روحوں کو وہ خود ہی قبض کرتے ہیں مگر ان کے ساتھ رحمت اور عذاب کے فرشتے ہوتے ہیں پاک روح کو قبض کرنے کے بعد رحمت کے فرشتوں کے حوالے کر دیتے ہیں اور ناپاک روح کو عذاب کے فرشتوں کے سپرد فرما دیتے ہیں۔

علمی بات: حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا مؤمن بندے کا جب دنیا سے تعلق ختم ہوتا ہے اور آخرت سامنے آرہی ہوتی ہے تو سورج جیسے چمکدار اور روشن چہروں والے فرشتے اس کے پاس اتر کر آتے ہیں جنت کا کفن اور خوشبو ان کے پاس ہوتی ہے وہ حد نگاہ کے فاصلہ پر بیٹھ جاتے ہیں پھر ملک الموت آکر مرنے والے کے سرہانے بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے اے پاکیزہ روح اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور رضامندی کی طرف نکل کر چل روح فوراً اس طرح بہتی نکل آتی ہے جس طرح مشک کے اندر سے پانی کا قطرہ نکل آتا ہے۔ موت کا فرشتہ اس کو لے کر فوراً اوپر والے فرشتوں کے سپرد کر دیتا ہے پل بھر بھی اپنے ہاتھ میں نہیں روکتا فرشتے اسی بہشتی کفن اور خوشبو میں روح کو لپیٹ دیتے ہیں، اسی حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کافر کے متعلق ارشاد فرمایا کہ سیاہ ملائکہ ٹاٹ لئے حد نگاہ کے فاصلہ پر آکر بیٹھ جاتے ہیں پھر ملک الموت آکر اس کے سرہانے بیٹھ جاتا ہے اور روح کو قبض کر کے فوراً عذاب کے سیاہ رو فرشتوں کے سپرد کر دیتا ہے پل بھر بھی اپنے ہاتھ میں نہیں رکھتا۔ (مسند احمد)

آیت نمبر ۶۲: اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کا مولیٰ ومالکِ حقیقی ہونے کا بیان ہے۔ نیز یہ بھی بتایا گیا ہے کہ موت کے بعد روح انسانی کو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹایا جائے گا۔ ہر انسان اپنے اعمال کا خود جواب دہ ہو گا۔

علمی بات: ۱۔ موت کے بعد کے احوال اور قبر میں سوال وجواب: اس بارے میں بہت سی احادیث وارد ہیں۔ اُن کا حاصل یہ ہے کہ جب فرشتے انسان کی روح قبض کرنے آتے ہیں تو فرشتوں کے رویہ سے ہی مرنے والے کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ اہل جنت میں سے ہے یا اہل دوزخ میں سے۔ جنتی کی روح کو ریشم کے کپڑوں میں لپیٹ کر آسمان کی طرف جاتے ہیں وہاں اس روح کی خوب پذیرائی ہوتی ہے چنانچہ آسمان کا دروازہ کھول دیا جاتا ہے پھر اسے عزت و اکرام سے واپس بھیج دیا جاتا ہے اور یہ روح اپنی میت کے ساتھ ساتھ رہتی ہے اور پکارتی رہتی ہے کہ مجھے جلدی جلدی تدفین کے لئے لے چلو۔ پھر تدفین کے بعد قبر میں جب سوال وجواب ہونے کے بعد اسے مقام علیین پہنچا دیا جاتا ہے اور دوزخی کی روح کو فرشتے بدبودار کپڑوں میں لپیٹ کر آسمان کی طرف

لے جاتے ہیں تو اس کے لئے دروازہ ہی نہیں کھلتا پھر اسے وہاں سے اپنی میت کی طرف پھینک دیا جاتا ہے اور وہ پکار پکار کر کہتی ہے کہ مجھے تدفین کے لئے نہ لے جاؤ۔ پھر جب تدفین کے بعد قبر میں سوال وجواب ہوتے ہیں اور وہ اس امتحان میں ناکام رہتا ہے تو مقام سجین میں قیامت تک کے لئے قید کر دیا جاتا ہے۔ یعنی عذاب وثواب کا سلسلہ مرنے کے ساتھ ہی شروع ہو جاتا ہے پھر قبر میں جنتی کے لئے جنت کی ایک کھڑکی کھول دی جاتی ہے اور وہ قیامت تک ایسے اکرام کے ساتھ مسرت کی نیند سوتا ہے جیسے کوئی دلہن سوتی ہے اور دوزخی کے لئے دوزخ کی طرف کھڑکی کھول دی جاتی ہے جس کی وجہ سے اسے طرح طرح کا عذاب شروع ہو جاتا ہے اور یہ عذاب قیامت کے عذاب کی نسبت بہت کم درجے کا ہوتا ہے ۔ قیامت کا عذاب اس سے شدید تر ہو گا۔ اسی طرح جنتی پر جو انعامات آخرت میں ہوں گے وہ قبر کے انعام سے بہت زیادہ ہوں گے۔

۲۔ اللہ ﷻ جلد حساب لینے والا ہے: قیامت کے دن اللہ ﷻ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔ یہاں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر قیامت تک آنے والے بیشمار انسانوں کا حساب وکتاب اور پھر ہر انسان کی زندگی کا پورا ریکارڈ چیک کرنا، اس کے لئے تو لمبا عرصہ درکار ہے۔ مگر اللہ ﷻ کے کاموں کو اپنے کاموں پر قیاس کرنا جہالت ہے۔ وہ قادر مطلق ہے اور ایک انسان سے حساب لیتے وقت دوسرے انسانوں سے غافل نہیں ہوتا۔ جس طرح سورج جو کہ اللہ ﷻ کی مخلوق ہے، ایک وقت میں دنیا کی ہر چیز کو اپنی روشنی سے منور کرتا ہے اسی طرح اللہ ﷻ بھی ایک وقت میں دنیا کے ہر انسان کو اپنی رحمت اور توجہ سے فیض یاب کرتا ہے۔ جب ملک الموت کو دنیا کے مختلف حصوں سے روحیں قبض کرنے میں کوئی وقت نہیں لگتا تو اللہ ﷻ جو ملک الموت کا خالق ہے وہ تمام دنیا کا حساب لینے میں کسی وقت کا محتاج نہیں ہے۔ زمان ومکان کی وسعتیں اس کی قدرت کے سامنے سمٹ جاتی ہیں اور جب وہ کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو وہ صرف اتنا فرماتا ہے کہ "ہو جا" تو وہ ہو جاتا ہے۔ (سورۃ یٰس ۳۶، آیت: ۸۲) حدیث میں آتا ہے کہ اللہ ﷻ تمام مخلوق کا حساب دنیا کے دنوں میں سے نصف دن کی مقدار میں لے لے گا۔ دوسری حدیث میں ہے کہ اللہ ﷻ تمام مخلوق کا حساب اتنی دیر میں لے گا جتنی دیر میں بکری کا دودھ دوہا جاتا ہے۔ ان احادیث میں اللہ ﷻ کی اپنی مشیت اور ارادہ کا اظہار ہے وگرنہ وہ کسی وقت کا محتاج نہیں ہے جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ ایک وقت میں اللہ ﷻ تمام لوگوں کا حساب کیسے لے گا؟ آپ نے فرمایا: جس طرح اللہ ﷻ ایک وقت میں سب انسانوں کو رزق دیتا ہے اسی طرح وہ ایک وقت میں ان کا حساب بھی لے سکتا ہے۔

آیت نمبر ۶۳: اس سورت میں اللہ ﷻ کی آفاقی نشانیوں پر غور وفکر کی دعوت دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ توحید باری تعالیٰ کا تعارف خود فطرت انسانی میں موجود ہے اس حوالہ سے فرمایا گیا ہے کہ خشکی اور سمندر کی مشکلات وحوادثات سے نجات دینے والا صرف اللہ ﷻ ہی ہے۔ سختیوں میں مبتلا ہونے پر مشرکین بھی جھوٹے معبودوں کو بھول کر اللہ ﷻ ہی کو پکارتے ہیں۔

علمی بات: مشرکین عرب کا معاملہ بڑا عجیب تھا، ایک طرف تو وہ بتوں کو خدا کا شریک بناتے اور ان کی پوجا کرتے لیکن دوسری طرف جب خشکی یا سمندر کی تاریکیوں اور مصیبتوں اور طوفانوں میں گھر جاتے اور جب سارے مادی سہارے ٹوٹ جاتے اور موت سامنے نظر آتی تو بتوں کو بھول جاتے اور بڑی عاجزی کے ساتھ خالق حقیقی کو مدد کے لئے پکارتے کہ اگر وہ انہیں اس مصیبت سے نجات دے دے تو وہ اللہ ﷻ کی نافرمانی سے باز آجائیں گے اور ہمیشہ اس کے شکر گزار بندے بن کر رہیں گے۔ چنانچہ ان دو آیات میں اللہ ﷻ نے حضور اکرم ﷺ کو فرمایا کہ ان ناقدروں کو ان کا وعدہ یاد دلائیے اور ان سے پوچھیے کہ جب تمہیں ہلاکت کا خطرہ ہو تو اللہ ﷻ کو پکارتے ہو اور جب اللہ ﷻ تمہیں اس مصیبت سے نجات دے دے تو پھر تم دوبارہ شرک کی طرف لوٹ جاتے ہو۔ یہ تو وعدہ خلافی ہے کہ تم نے عہد کیا اور اس سے مکر گئے اور ایسے ہو گئے جیسے کوئی عہد ہی نہ تھا۔

عملی پہلو: اس آیت سے معلوم ہوا کہ مصیبت کے وقت بعض کافر بھی صدق دل سے عاجزی کرتے ہوئے گڑگڑا کر اللہ ﷻ کو پکارتے ہیں، مگر مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ ہر وقت حال میں خوشی یا غم اللہ ﷻ کو یاد رکھیں اور اس کے ساتھ کیئے ہوئے وعدے نبھائیں گے کو پورا کریں۔ یاد رکھیں! ہر مسلمان کا اللہ ﷻ سے پہلا وعدہ یہ ہے کہ وہ صرف اللہ ﷻ کی عبادت کرے گا اور کسی کو شریک نہیں ٹھہرائے گا اور اپنی زندگی اس کے احکام کے

مطابق گزارے گا۔ اسی بات کو ہم سورۃ الفاتحہ کی تلاوت کرتے ہوئے بار بار دہراتے ہیں کہ "(اے اللہ!) ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔" (سورۃ الفاتحہ ۱، آیت:۴)

آیت نمبر ۶۴: اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اللہ ﷻ کُل نفع و نقصان کا مالک ہے اور وہی مشکلات کو دور کرتا ہے اور سختیوں سے نجات دلاتا ہے۔ مگر مشرکین کا حال یہ ہے کہ مصیبت ٹل جانے پر اللہ ﷻ کو بھول کر جھوٹے معبودوں کی پرستش میں لگ جاتے ہیں۔

آیت نمبر ۶۵: عذاب کی تین اقسام کا بیان: اس آیت میں عذاب کی تین قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ i۔ اوپر سے عذاب جیسے بارش کی کثرت، تیز آندھی یا پتھروں کے ذریعے عذاب جیسے پرندوں کی چھوٹی چھوٹی کنکریوں نے ابرہہ کی فوج اور ہاتھیوں کو تہس نہس کر دیا، ظالم امراء اور حکام کو مسلط کرنا۔ ii۔ نیچے سے عذاب جیسے زمین میں دھنسایا جانا، طوفان اور سیلاب اور قارون کو اس کے خزانوں سمیت زمین میں دفن کر دینا۔ فرعون اور اس کے لشکر کو پانی کی لہروں کے ذریعے غرق کرنا۔ iii۔ مختلف فرقوں میں بٹ جانا ہو اور قتل و غارت کا عام ہونا کہ قاتل کو پتہ نہ ہو کیوں قتل کیا اور نہ مقتول کو پتہ ہو کہ کس جرم میں قتل ہوا۔

علمی بات: امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ روایت کرتے ہیں:

حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ بہت لمبی نماز پڑھی، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ نے ایسی نماز پڑھی ہے جو آپ عام طور پر نہیں پڑھتے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں! اللہ سے رغبت اور اس سے خوف کی نماز تھی، میں نے اللہ ﷻ سے تین چیزوں کا سوال کیا، اس نے مجھے دو چیزیں عطا کر دیں، اور ایک سے منع فرما دیا۔ میں نے اللہ سے سوال کیا کہ میری امت کو قحط میں ہلاک نہ کرنا تو اللہ نے مجھے یہ عطا کر دیا، اور میں نے سوال کیا کہ میری امت پر ان کے مخالف کو مسلط نہ کرنا تو مجھے عطا کر دیا اور میں نے سوال کیا کہ میری امت کے بعض، بعض سے جنگ نہ کریں تو مجھے اس سے منع فرما دیا۔ (جامع ترمذی)

نیز حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ قبیلہ بنی معاویہ کی مسجد پر گذرے، وہاں آپ نے دو رکعت نماز پڑھی اور ہم نے بھی آپ کے ساتھ نماز پڑھی آپ نے لمبی دعا کی اور اس کے بعد فرمایا کہ میں نے اپنے رب سے تین چیزوں کا سوال کیا مجھے دو چیزیں عطا فرما دیں اور ایک کی قبولیت سے منع فرمایا۔ میں نے اپنے رب سے سوال کیا کہ میری امت کو قحط سے ہلاک نہ فرمانا دعا قبول ہو گئی اور میں نے یہ سوال کیا کہ میری امت کو غرق کر کے ہلاک نہ فرمانا، میری یہ دعا بھی قبول ہو گئی اور میں نے سوال کیا کہ آپس میں ان کی لڑائی نہ ہو تو اس بات کو قبول کرنے سے منع فرما دیا۔ (مشکوۃ)

عملی پہلو: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضور اکرم ﷺ کی دعا سے پہلی امتوں کی طرح اب مسلمانوں پر آسمان و زمین سے کوئی ایسا عذاب نہیں آئے گا جو پوری امت مسلمہ کو صفحہ ہستی سے مٹا دے۔ اگر بعض مقامات میں جزوی طور زلزلہ یا آندھی یا سیلاب آنے سے ان کی نفی نہیں ہے، لیکن گروہ بندی، فرقہ بندی اور آپس کے لڑائی جھگڑے عذاب کی ایسی صورتیں ہیں جو ہمارے گناہوں کی وجہ سے ہم پر مسلط کی گئی ہیں اور جب تک ہم ان گناہوں سے سچی توبہ کر کے اصلاح احوال نہیں کرینگے تو ہمارا حال اور مستقبل یونہی انحطاط کا شکار اور زوال پذیر رہے گا۔ بقول اقبال رحمۃ اللہ علیہ

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

آیت نمبر ۶۶: مشرکین مکہ کے وقوع شدہ احوال کو واقعی بیان کیا جا رہا ہے اور نبی کریم ﷺ سے فرمایا جا رہا ہے کہ آپ ﷺ کی قوم نے قرآنِ حکیم کو جھٹلا دیا، حالانکہ وہ برحق ہے اور اس میں بیان شدہ ہر بات سچی ہے۔ آپ ﷺ ان سے فرما دیجیے کہ میں تمہارا (ایمان قبول کرنے کا) ذمہ دار نہیں

ہوں، بلکہ میرا کام تمہیں حق پہنچا دینا ہے۔ ارشاد فرمایا "اور فرما دیجئے کہ یہ حق تمہارے رب کی طرف سے ہے، پھر جو چاہے سو ایمان لے آئے اور جو چاہے سو کفر کرے۔" (سورۃ الکہف ۱۸، آیت: ۲۹)

علمی بات: اس آیت میں فرمایا ہے یہی حق ہے تمہارے ربّ کی طرف سے اس میں کس چیز کو حق فرمایا ہے اس میں حسب ذیل اقوال ہیں:

1۔ کفار نے اس عذاب الٰہی کا انکار کیا 'حالانکہ اس کا نزول حق ہے۔

2۔ کفار نے اس قرآنِ حکیم کا انکار کیا 'حالانکہ یہ قرآنِ حکیم حق ہے۔

3۔ اللہ ﷻ نے الوہیت اور توحید پر بطور دلیل جو آیات نازل کی ہیں کفار نے ان دلائل کا انکار کیا 'حالانکہ یہ دلائل حق ہیں۔

اس کے بعد فرمایا آپ ﷺ کہیئے کہ میں تمہارا ذمہ دار نہیں ہوں 'یعنی اگر تم ان دلائل سے اعراض کرتے ہو اور حق کا انکار کرتے ہو تو میں تمہارا ذمہ دار نہیں ہوں 'یعنی نہ میں تم پر جبر کر کے نہ تمہیں مومن بنا سکتا ہوں اور نہ انکار کی صورت میں تمہیں سزا دے سکتا ہوں۔ میں تو تمہیں صرف آخرت کے عذاب سے ڈرانے والا ہوں۔ اس نہج پر قرآنِ حکیم میں اور بھی آیات ہیں: ہمیں خوب معلوم ہے جو یہ کہتے ہیں اور آپ ان پر جبر کرنے والے نہیں ہیں پس آپ نصیحت کیجیئے قرآنِ حکیم کے ذریعے اُسے جو میرے (عذاب کے) وعدہ سے ڈرتا ہے۔ (سورۃ ق ۵۰، آیت: ۴۵) اور سورۃ الغاشیہ ۸۸، آیات: ۲۲،۲۱ میں فرمایا گیا: پس آپ (ﷺ) نصیحت فرماتے رہیں بے شک آپ (ﷺ) تو نصیحت ہی فرمانے والے ہیں۔ آپ (ﷺ) ان پر کوئی ذمہ دار نہیں ہیں۔

آیت نمبر ۶۷: اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ ہر فیصلے کے ظہور کا ایک وقت مقرر ہے اور کفار کے لئے تنبیہ ہے کہ نافرمان عذاب کا شکار ہو کر رہے ہیں گے۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے فرمایا ہر خبر کا ایک وقت مقرر ہے 'اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ ﷻ نے جو بھی خبر دی ہے اس کا ایک وقت متعین ہے اور اس وقت میں یقیناً اس خبر کا ظہور ہو گا اور اس میں کوئی تقدیم و تاخیر نہیں ہو گی۔ اس سے یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ اللہ ﷻ نے کفار کے لئے عذاب آخرت کی جو خبر دی ہے وہ عذاب یقیناً نازل ہو گا۔ اور اس سے یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ اللہ ﷻ نے جو یہ خبر دی ہے کہ کفار کے ساتھ جنگ میں مسلمان کافروں پر غالب ہوں گے تو بغیر شک وشبہ کے اس خبر کا ظہور ہو گا۔ یہ اللہ ﷻ کی طرف سے کفار کے لئے وعید ہے 'کیونکہ وہ مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے کا انکار کرتے تھے اور دنیا میں بھی ان کے لئے وعید ہے جیسا کہ بدر وغیرہ میں وہ شکست سے دوچار ہوئے اس آیت میں مسلمانوں کے لئے عبرت اور سبق ہے اگر انہوں نے قرآنِ حکیم کے احکام پر عمل نہیں کیا 'بلکہ قرآنِ حکیم کے احکام کی خلاف ورزی کی 'تو یہ قرآن حکیم کے عملی انکار کے مترادف ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم پر اللہ ﷻ کی ناراضگی کی وجہ سے اس کا عتاب نازل نہ ہو جائے۔

آیت نمبر ۶۸: اس آیت میں ان مجلسوں میں بیٹھنے کی ممانعت کی جا رہی ہے جن میں اسلام کا مذاق بنایا جا رہا ہو۔ بعض مرتبہ ایسا ہوتا تھا کہ مسلمان اور مشرکین ایک جگہ بیٹھتے تھے۔ مشرکین کو قرآنِ حکیم کا احترام نہ تھا۔ بیٹھے بیٹھے اہل ایمان کے سامنے قرآنِ حکیم کا مذاق بنانے لگتے تھے اور امور دین پر طعن کرنے لگتے تھے۔ اللہ ﷻ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ جب تم ان ظالموں کی اس حرکت کو دیکھو تو ان سے اعراض کرو اور کنارہ کشی اختیار کرو۔ ہاں جب وہ اپنی اس بُری حرکت کو چھوڑ دیں اور دوسری باتوں میں مشغول ہو جائیں تو پھر ان کے ساتھ بیٹھ سکتے ہو۔ اگر اس استہزاء اور تمسخر کے وقت تم بھولے سے ان کے پاس بیٹھے ہو تو یاد آنے پر فوراً اٹھ جاؤ اور ظالموں کے ساتھ نہ بیٹھو۔ یہ مضمون سورۃ نساء میں بھی گزرا ہے۔ وہاں اس آیت کا حوالہ دے کر فرمایا ہے۔ "اور اس نے کتاب میں تم پر یہ حکم نازل کیا ہے کہ جب تم اللہ کی آیتوں کو سنو کہ ان کا انکار کیا جا رہا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے تو ایسے لوگوں کے ساتھ اس وقت تک مت بیٹھو جب تک وہ کسی اور بات میں مشغول نہ ہو جائیں۔" (سورۃ النسآء، آیت: ۱۴۰)

عملی پہلو: شیطان بھلا دے، یعنی بھول کر اُس مجلس میں شریک ہو گئے بایں طور کہ ایسی مجلس میں شریک ہونے کی ممانعت یاد نہ رہی، تو لہٰذا جس وقت بھی یاد آجائے کہ یہ لوگ اپنی مجلس میں اللہ ﷻ کی آیات کا انکار اور قرآن حکیم کا مذاق اُڑاتے ہیں تو فوراً اسی وقت اس مجلس سے اٹھ جانا چاہیئے، یاد آجانے کے بعد وہاں بیٹھے رہنا گناہ ہے، ایک دوسری آیت میں بھی اس کی وضاحت ہے کہ اگر تم وہاں بیٹھے رہے تو تم بھی انہی جیسے شمار

ہو گے۔ (سورۃ النساء ۴، آیت: ۱۴۰)۔ اس آیت کا اصل منشاء یہ ہے کہ ایسی مجلس اور مجلس والوں سے اعراض اور کنارہ کشی کی بہتر صورت تو یہی ہے کہ وہاں سے اٹھ جائے لیکن اگر وہ یہ موضوع چھوڑ کر کسی دوسرے شغل میں لگ جائیں، تب بیٹھنے کی گنجائش ہے مگر خواص جن کی دین میں اقتداء کی جاتی ہے ان کے لئے وہاں سے بہر حال اٹھ جانا ہی بہتر ہے۔

تاہم واضح رہے کہ یہ حکم جہاں تعلیم امت کے لئے ہے وہاں اس میں تسلی بھی ہے چونکہ سورہ انعام مکہ میں نازل ہوئی وہاں مذاق اڑانے والے قریش مکہ یعنی کفار تھے اور سورۃ النساء مدینہ منورہ میں نازل ہوئی وہاں مذاق اڑانے والے یہود یعنی اہل کتاب اور منافقین تھے اور آج کل بے دین امراء، فیشن ایبل اور مغربی تہذیب کے دلدادہ لوگوں کی مجلسوں میں دین اور دین داروں کا مذاق اڑانا بالعموم ہوتا ہے لہذا مومنین کو اس طرز عمل سے دل برداشتہ یا متاثر ہونے کے بجائے اس مجلس کا موضوع بدلنے اور قرآن وسنت کی حقانیت کی دعوت دینے کی بھرپور کوشش کی جائے۔

آیت نمبر ۶۹: جب سابقہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ اگر ان کی مجلس میں جانے کی مطلقاً ممانعت رہی تو ہم مسجد حرام میں نماز اور طواف سے بھی محروم ہو جائیں گے، کیونکہ وہ لوگ تو ہمیشہ وہاں بیٹھے رہتے ہیں، (یہ واقعہ ہجرت اور فتح مکہ سے پہلے کا ہے) اور ان کا مشغلہ ہی عیب جوئی اور بدگوئی ہے، اس پر اس کے بعد یہ والی آیت نازل ہوئی: وَمَا عَلَى الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ یعنی جو لوگ احتیاط برتنے والے ہیں وہ اگر اپنے کام سے مسجد حرام (بیت اللہ) میں جائیں تو ان کے بُرے اعمال کی ان پر کوئی ذمہ داری نہیں، ہاں اتنی بات ان کے ذمہ ہے کہ حق بات ان تک پہنچا دیں کہ شاید وہ اس سے نصیحت حاصل کر کے صحیح راستہ پر آجائیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر مسلمانوں نے قرآنِ حکیم، نبی کریم ﷺ اور دین اسلام کا تمسخر اُڑانے اور اس پر اعتراض کرنے والوں کے پاس بیٹھنے سے اجتناب کیا تو ان کے اعتراضات اور تمسخر کی مسلمانوں سے باز پرس نہیں ہو گی اور مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ ان لوگوں کو برابر نصیحت کرتے رہیں ہو سکتا ہے یہ لوگ اپنی اسلام دشمنی سے باز آجائیں۔

عملی پہلو: بعض مفسرین فرماتے ہیں جب یہ لوگ دینِ اسلام اور نبی کریم ﷺ کے خلاف ہرزہ سرائی کریں تو اس وقت مسلمانوں کا ان کی مجلس سے اٹھنا اس پر دلالت کرے گا کہ مسلمانوں کو مشرکین کی یہ باتیں ناگوار گزریں ہیں۔ اور مسلمانوں کے اس طرز عمل سے ان مشرکوں کو حیا آئے اور وہ آئندہ کے لئے مسلمانوں کے سامنے ان دل آزار باتوں سے رُکے رہیں۔

آیت نمبر ۷۰: اس آیت میں مشرکین کا دین کو کھیل تماشہ بنانے کا بیان ہے یعنی دین حق کا مذاق اڑانا اور من چاہی باتوں کو دین سمجھنا۔ اس بے باکی کی بنیادی وجہ دنیا میں مگن رہنا اور آخرت کو بھلا دینا ہے۔ قرآنِ حکیم کے ذریعہ اُن لوگوں کو نصیحت اور آخرت کی حقیقت بیان فرمائی گئی ہے۔ نیز اہل باطل کے لئے دردناک عذاب کی وعید سنائی گئی ہے اور حمایتی اور سفارش کرنے والوں کی یکسر نفی کی گئی ہے۔ آیت کے آخر میں ان کا انجام بیان کیا گیا ہے کہ کفر کے بدلہ جہنم میں کھولتا ہوا مشروب ان کا مقدر ہو گا۔

علمی بات: ۱۔ آپ ﷺ سے ارشاد فرمایا گیا کہ کو تلقین ہے کہ ان لوگوں کو چھوڑ دیجئے جنہوں نے اپنے دین کو لہو ولعب یعنی مشغلہ اور کھیل بنا رکھا ہے، اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ جو دین حق یعنی اسلام ان کے لئے بھیجا گیا ہے، اس کو لہو ولعب بنا رکھا ہے، اس کا استہزاء و تمسخر کرتے ہیں، دوسرے یہ کہ انہوں نے اصلی دین کو چھوڑ کر اپنا دین و مذہب ہی لہو ولعب کو بنا لیا ہے، دونوں معنی کا حاصل تقریباً ایک ہی ہے۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا ان کو دنیا کی چند روزہ زندگی نے دھوکہ میں ڈالا ہوا ہے، یہ ان کے مرض کا اصلی سبب بیان فرما دیا کہ ان کی اس ساری سرکشی اور نافرمانی کی وجہ دنیا کی چند روزہ زندگی کو ہی سب کچھ سمجھتے ہوئے آخرت کو بھلا بیٹھنا ہے، اگر آخرت اور قیامت کا اعتقاد ہوتا تو ہرگز وہ یہ روش اختیار نہ کرتے۔

۲۔ اس آیت میں نبی کریم ﷺ اور عام مسلمانوں کو دو حکم دیئے گئے ہیں، اول یہ کہ ایسے لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کریں جس کا بیان مذکورہ جملہ میں آچکا ہے، دوسرے یہ کہ صرف ان لوگوں سے کنارہ کشی اور اعراض بھی کافی نہیں، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ قرآنِ حکیم کے ذریعہ ان کو نصیحت بھی

کرتے رہیں اور اللہ ﷻ کے عذاب سے ڈراتے بھی رہیں۔ آخر آیت میں اس عذاب کی تفصیل اس طرح بیان فرمائی کہ اگر ان کی یہی حالت رہی تو یہ اپنے کردارِ بد کے جال میں خود پھنس جائیں گے، آیت میں اس جگہ "اُنْ تُبْسَلَ" کا لفظ استعمال فرمایا ہے، جس کے معنی قید ہو جانے اور پھنس جانے کے ہیں۔

عملی پہلو: ا۔ چونکہ دنیا میں انسان کسی غلطی یا ظلم پر اس کی سزا سے بچنے کے لئے تین قسم کے ذرائع اختیار کرتا ہے، کبھی اپنی جماعت اور جتھے کا زور اس کے خلاف استعمال کر کے بچنے کی کوشش کرتا ہے اور اگر اس سے عاجز ہو گیا تو بڑے لوگوں کی سفارش سے کام لیتا ہے اور اگر اس سے بھی کام نہ بنے تو پھر کوشش ہوتی ہے کہ اپنے آپ کو سزا سے بچانے کے لئے کچھ مال خرچ کرے۔ اللہ ﷻ نے اس آیت میں بتلا دیا کہ اللہ ﷻ کے مجرم کے لئے سزا سے بچانے والا نہ کوئی دوست عزیز ہو سکتا ہے، نہ کسی کی سفارش اللہ ﷻ کی اجازت کے بغیر چل سکتی ہے، اور نہ کوئی مال قبول کیا جا سکتا ہے، بلکہ اگر سارے جہان کا مال بھی اس کے قبضہ میں ہو اور وہ اس سب مال کو سزا کے طور پر دے تب بھی یہ فدیہ اس سے قبول نہ کیا جائے گا۔ آخر آیت میں فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے برے اعمال کی سزا میں پکڑے گئے ہیں، ان کو پینے کے لئے جہنم کا کھولتا ہوا پانی ملے گا، جس کے متعلق دوسری آیت میں ہے کہ وہ ان کی انتڑیوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کاٹ ڈالے گا (سورۃ الحج ۲۲، آیت: ۲۰) اور اس پانی کے علاوہ دوسرے بھی دردناک قسم کے عذاب ہوں گے جو ان کے کفر و انکار کے بدلے میں اُن کو دیئے جائینگے۔

۲۔ آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو لوگ آخرت سے غافل صرف دنیا کی زندگی میں مگن ہیں، ان کی صحبت بھی انسان کے لئے مہلک اور مضر ہے، اس کا انجام یہ ہے کہ ان کی صحبت میں رہنے والا بھی کہیں ان جیسا بن کر اس عذاب کا شکار نہ ہو جائے۔

۳۔ بُرے ماحول اور بُری صحبت سے بچنا ضروری ہے جو انسان کے لئے زہر قاتل ہے، قرآن و حدیث کی بیشمار نصوص کے ساتھ مشاہدہ اور تجربہ سے یہ بات ظاہر ہو گی کہ تمام برائیوں اور جرائم کی جڑ اصل بُری سوسائٹی اور بُرا ماحول ہے جس میں پھنسنے کے بعد اوّلاً انسان تو اپنے ضمیر کے خلاف جرائم کا ارتکاب کرتا ہے اور پھر جب عادت پڑ جاتی ہے تو برائی کا احساس بھی ختم ہو جاتا ہے۔

آیت نمبر ۷۱: اس آیت میں غیر اللہ کو پکارنے کی ممانعت و حرمت کا بیان ہے۔ نیز بتایا گیا ہے کہ اہل ایمان اللہ ﷻ کے سوا کسی اور کی عبادت نہیں کرتے وہ اللہ ﷻ ہی کو نفع اور نقصان کا مالک مانتے ہیں۔ اہل ایمان اللہ ﷻ ہی کے راستہ پر یقین رکھتے ہیں اور اسی پر چلتے رہتے ہیں اور اللہ ﷻ ہی کی فرماں برداری اختیار کرتے ہیں۔

علمی بات: گمراہی میں بھٹکنے والے شخص کی مثال: اللہ ﷻ نے رسول اللہ ﷺ سے فرمایا کہ آپ ﷺ ان مشرکوں سے کہیئے کہ اللہ ﷻ بزرگ و برتر جو نفع اور نقصان کا مالک ہے' کیا اس کو چھوڑ کر ہم ان بتوں کی پرستش کریں جو ہمیں نفع دینے یا نقصان پہنچانے پر قدرت نہیں رکھتے اور ہم الٹے پیر شرک اور کفر کی طرف لوٹا دیئے جائیں 'جب کہ اللہ ﷻ ہمیں اس کفر سے نجات دے کر اسلام کی طرف ہماری رہنمائی کر چکا ہے۔ پھر ہماری مثال اس شخص کی طرح ہو گی جس کو کسی جنگل یا صحراء میں شیاطین جنات نے راستہ بھٹکا دیا ہو اور اس کی عقل کام نہ کر رہی ہو کہ وہ کدھر جائے، وہ حیران و پریشان پھر رہا ہو اور اس کے دوست اور ساتھی اس کو بلا رہے ہوں کہ ہماری طرف آؤ ادھر سیدھا راستہ ہے۔

نوٹ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ ﷻ نے بتوں کی اور اللہ ﷻ کی طرف دعوت دینے والوں کی یہ مثال بیان فرمائی ہے، جیسے ایک شخص راستہ سے بھٹک گیا ہو اور اسے کوئی شخص پکارے کہ اس طرف آؤ اور اس کے خیر خواہ بھی ہوں جو اس کو بلائیں کہ اس راستہ پر آؤ تو اگر وہ پہلے بلانے والے کی پکار پر چلا جائے تو وہ اس کو ہلاکت و تباہی کے گڑھے میں گرا دے گا اور اگر وہ ہدایت کی دعوت دینے والے کے پاس چلا جائے تو سیدھا راستہ پا جائے گا اور یہ صحرا یا جنگل میں بلانے والے شیاطین جنات ہیں۔

عملی پہلو: اچھی صحبت اور اچھی مجالس کی یہ برکت ہے کہ نیک ساتھی انسان کی راہِ راست کی طرف رہنمائی کرتے رہتے ہیں اور خیر کی تلقین اور بدی سے روکتے رہتے ہیں۔ ہمیں بھی نیک لوگوں اور نیک ماحول سے جُڑے رہنا چاہیئے۔

آیت نمبر ۷۲: اقامت صلوٰۃ اور تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اقامت صلوٰۃ اس کے مسائل کا علم، ظاہری و باطنی آداب کی رعایت، وقت کی پابندی اور جماعت کے ساتھ نماز کی ادائیگی ان سب کو شامل ہے۔ نماز تقوی کے حصول کا بھی ذریعہ ہے جیسا کہ سورۃ العنکبوت ۲۹، آیت: ۴۵ میں فرمایا گیا ہے کہ "بے شک نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے۔" تقویٰ کا مطلب اللہ ﷻ کا خوف رکھنا بھی ہے اور گناہوں سے بچنا بھی۔

علمی بات: بندۂ مومن کو ہمیشہ اسی بات کو پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ میرا معاملہ میرے خالق ومالک کے ساتھ کیسا ہے اور وہ ہر اس کام سے بچنے کی فکر و کوشش کرے جو اس کی ناراضگی اور پکڑ کا باعث ہو۔ سب کو بہر حال اللہ ﷻ کے حضور حاضر ہونا ہے تاکہ نیک وبد میں تمیز ہو سکے۔ نیکوکاروں کو جنت کی ابدی اور عظیم الشان نعمتوں سے سرفرازی نصیب ہو اور بدکاروں کو ان کی زندگی بھر کی بدکاریوں کی سزا مل سکے۔ پس ہر کوئی ہمیشہ اسی بات کو پیش نظر رکھے کہ وہاں میرا معاملہ کیسا رہے گا اور اس بڑے دن کیا چیز کام آسکتی ہے۔

آیت نمبر ۷۳: اللہ ﷻ نے آسمانوں اور زمین کو کامل حکمت کے ساتھ پیدا کیا ہے نہ کہ کھیل تماشہ کے لئے۔ اللہ ﷻ زمین و آسمان اور ان میں موجود تمام مخلوقات کا مالک و منتظم ہے جس طرح کائنات کی تخلیق بامقصد ہے اسی طرح انسانوں کو بھی اللہ ﷻ نے ایک مقصد کے لئے پیدا فرمایا ہے۔ جیسا کہ سورۃ الذاریات ۵۱، آیت: ۵۶ میں بیان فرمایا گیا ہے کہ "اور ہم نے جنات اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا فرمایا ہے۔" اللہ ﷻ قیامت کے دن انھیں میدان محشر میں کلمہ "کُن" کے ذریعے جمع کرنے پر قادر ہے۔ انسان کی خواہش اس کے امر کو مؤخر نہیں کر سکتی۔ اس کا قول و حکم بہر حال نافذ اور واقع ہو گا۔ اس کے بعد اللہ ﷻ نے فرمایا کہ جس دن قیامت کا صور پھونکا جائے گا اس دن اسی کی بادشاہت ہو گی اور وہ اپنے مطیع و فرماں بردار اور عاصی و گناہ گار بندوں کے ساتھ ان کے اعمال کے مطابق برتاؤ کرے گا۔ دنیا دار العمل اور آخرت دار الجزاء ہے اور اللہ ﷻ بندوں کے ظاہر و باطن کی ہر بات سے واقف ہے۔

نوٹ: دنیا میں مجازی طور پر جن کو بادشاہ کہا جاتا تھا ان کی بادشاہت بھی ختم ہو جائے گی، جیسا کہ ارشاد فرمایا: جس دن وہ صاف ظاہر ہوں گے، ان کی کوئی چیز اللہ پر چھپی نہ ہو گی۔ آج کس کی بادشاہی ہے؟ اللہ ہی کی جو ایک ہے، بہت دبدبے والا ہے۔" (سورۃ المؤمن ۲۳، آیت: ۱۶)

علمی بات: ۱۔ سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک دیہاتی آیا اور اس نے عرض کی، اے اللہ کے رسول ﷺ! صور کیا چیز ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "اس سے مراد وہ سینگ ہے جس میں پھونکا جائے گا۔" (مسند احمد، جامع ترمذی)

۲۔ سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "قیامت کے دن اللہ ﷻ فرمائے گا، آج وہ لوگ کہاں ہیں جو دنیا میں اپنی حکومت اور بادشاہت کے دعوے دار تھے۔" (صحیح مسلم)۔

نوٹ: اس صورت کی آیات ۷۴ تا ۹۰ کی وضاحت رہنمائے اساتذہ برائے مطالعہ قرآن حکیم حصہ دوم میں قصہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تحت ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

آیت نمبر ۹۱: علمائے یہود سے خطاب فرمایا گیا ہے جو حسد اور تعصّب کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کی رسالت کے منکر ہو گئے۔ اس کے بعد ان کا قول نقل کیا گیا ہے کہ اللہ ﷻ نے کسی انسان پر کوئی کتاب نازل نہیں فرمائی۔ اس کے بعد اللہ ﷻ نے فرمایا کہ تورات بھی اللہ ﷻ ہی نے نازل فرمائی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی انسان تھے۔ نیز علمائے یہود کی خیانت کا بیان ہے کہ وہ حق چھپاتے تھے حالانکہ تورات میں نبی کریم ﷺ کے بارے میں بشارتیں موجود تھیں۔ آیت کے آخر میں ہٹ دھرمی پر قائم رہنے والوں سے اعراض کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔

شانِ نزول: سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ مالک بن صیف نام کا ایک یہودی نبی کریم ﷺ کے ساتھ بحث کر رہا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا میں تمہیں اس ذات کی قسم دیتا ہوں جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات کو نازل فرمایا، کیا تم نے تورات میں یہ نہیں پڑھا کہ اللہ ﷻ ایسے عالم کو

ناپسند کرتا ہے جس کا پیٹ بڑھا ہوا ہو اور اس کا پیٹ بڑھا ہوا تھا اس پر وہ غضب ناک ہو گیا اس نے کہا اللہ کی قسم! اللہ ﷻ نے کسی بشر پر کوئی چیز نازل نہیں کی۔ تب اللہ ﷻ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ (ابن جریر)

علمی بات: یہود اگرچہ نبوت و رسالت کے قائل تھے مگر بعض یہودیوں نے نبی کریم ﷺ کی نبوت کا انکار کیا اور بغض و عناد میں یہ تک کہہ دیا کہ اللہ ﷻ نے کسی بشر پر کوئی کتاب نازل نہیں کی اور نزول کتاب کے حوالہ سے اللہ ﷻ کی ناقدری کی۔ اس لئے فرمایا جو شخص انبیاء کرام علیہم السلام پر نزول کتاب کا قائل نہیں وہ اللہ ﷻ کا قدر شناس نہیں اور وہ اللہ ﷻ کی حقیقی معرفت سے محروم ہے۔

نوٹ: علماء یہود سے جب ان کے عوام کچھ بات پوچھنے کے لئے آتے تھے تو صندوق وغیرہ میں ہاتھ ڈال کر کوئی سا بھی ایک ورق نکال لیتے تھے اور سائل کے مطلب کے مطابق پڑھ کر سنا دیتے تھے۔ تاکہ اس سے کچھ مال مل جائے نیز تورات میں جو حضور اقدس ﷺ کی صفات بیان کی گئی تھیں جسے وہ جانتے تھے مگر عام یہودیوں سے اس کو چھپاتے تھے۔ تورات میں کے موجود احکام بھی اُن سے چھپاتے تھے اور ان کے بجائے دوسرا حکم بتا دیتے تھے۔

علمی بات: "قَرَاطِیْسَ" جمع ہے "قِرْطَاسٌ" کی۔ جس کے معنی ہیں ورق اور کاغذ، یعنی یہودی تورات کو ایک کتاب کی طرح جمع کرنے کے بجائے الگ الگ ورقوں کی صورت میں رکھتے تھے اور اپنے مطلب کا ورق نکال کر دکھا دیتے تھے۔

عملی پہلو: جاہ و مال کی محبّت میں مبتلا اور اس کے طلبگار اہل علم جان بوجھ کر صحیح مسئلہ بتانے سے گریز کرتے ہیں اور اہل حق سے مناظرہ کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں اور اپنے باطل دعوے کو جاننے کے باوجود بھی حجت بازی کرتے تاکہ عوام کی خوش فہمی اور اعتقاد قائم کریں اور قرآن و حدیث میں اپنے معانی و مطالب کے موافق تحریف کر کے استدلال کر لیتے ہیں۔

آیت نمبر ۹۲: علمی بات: ۱۔ **قرآن حکیم کا سابقہ آسمانی کتابوں کا مُصَدِّق ہونا:** یہ برکت والی کتاب ہے۔ قرآنِ حکیم کی بنیادی تعلیمات وہی ہیں جو سابقہ آسمانی کتابوں میں ہیں۔ اس آیت میں فرمایا ہے کہ یہ کتاب سابقہ آسمانی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے۔ اس تصدیق کی تفصیل یہ ہے کہ آسمانی کتابوں میں دو چیزیں بیان کی گئی ہیں۔ اصول اور فروع اصول سے مراد ہیں عقائد مثلاً اللہ ﷻ کی ذات و صفات توحید رسالت ملائکہ تقدیر قیامت مرنے کے بعد اٹھنا، جزاء و سزا اور جنت و دوزخ وغیرہ۔ اور ظاہر ہے کہ زمان و مکان کی تبدیلی اور انبیاء کرام علیہم السلام کے فرق سے ان عقائد میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ تورات، زبور اور انجیل میں جو عقائد تھے، وہی عقائد قرآنِ حکیم میں ہیں، اس لحاظ سے قرآنِ حکیم ان سابقہ کتابوں کا **مُصَدِّق** ہے اور فروع سے مراد ہیں وہ احکام شریعت جو اکثر انبیاء کرام علیہم السلام کے مخصوص حالت و واقعات رسم و رواج اور تہذیب و تمدن کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں اور یوں تو اکثر انبیاء کرام علیہم السلام کے احکامِ شریعت ایک دوسرے سے مختلف ہیں، لیکن نفس عبادت اور اطاعت رسول علیہم السلام اور اتباع شریعت میں تمام آسمانی کتابیں متفق ہیں اور اس چیز میں قرآنِ حکیم ان کا **مُصَدِّق** ہے۔ نیز ان تمام سابقہ آسمانی کتابوں میں یہ لکھا ہوا تھا کہ آخری زمانہ میں نبی آخر سیدنا محمد ﷺ کو مبعوث کیا جائے گا جو سابقہ شریعتوں کو منسوخ کر دیں گے اور سب لوگوں پر صرف ان کی شریعت کی اتباع لازم ہو گی اور جب ہمارے نبی سیدنا محمد ﷺ مبعوث ہو گئے اور قرآنِ حکیم کے ذریعہ آپ ﷺ کی شریعت نافذ ہو گئی تو سابقہ آسمانی کتابوں کی یہ بشارت پوری ہو گئی، اس لحاظ سے قرآنِ حکیم تمام سابقہ آسمانی کتابوں کا **مُصَدِّق** ہے۔

۲۔ مکہ مکرمہ کا اُمُّ القریٰ ہونا: اس آیت میں مکہ مکرمہ کو اللہ ﷻ نے اُمُّ القریٰ فرمایا ہے، اُمُّ القریٰ کا لفظی معنی ہے شہروں کی ماں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا مکہ مکرمہ کو اُمُّ القریٰ اس لئے فرمایا ہے کہ تمام زمینیں اس کے نیچے سے نکال کر پھیلائی گئی ہیں۔ تو گویا یہی اصل ہے اور باقی تمام شہر اور قصبات اس کے تابع ہیں۔ نیز تمام دنیا کے مسلمانوں کی ہر دور میں مرکزی عبادت حج ہے اور حج مکہ مکرمہ میں ہوتا ہے اور اس وجہ سے تمام مخلوق مکہ مکرمہ سے جمع ہوتی ہے، جیسے بچے ماں کے گرد جمع ہوتے ہیں۔ اس لئے اس کو اُمُّ القریٰ فرمایا، نیز حج کی وجہ سے مکہ مکرمہ میں انواع و اقسام کی

تجارت ہوتی ہے اور اس شہر میں کسب معاش کے ذرائع دوسرے شہروں کی بہ نسبت زیادہ ہیں ‘اس لئے اس کو اُمُّ القریٰ فرمایا اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اللہ ﷻ کی عبادت کا پہلا گھر مکہ مکرمہ میں بنایا گیا ‘اس لئے اس کو اُمُّ القریٰ فرمایا۔

۳۔ غافل لوگوں کو بُرے انجام سے خبردار کرنا: قرآنِ حکیم کا ایک اہم مقصد غفلت میں پڑے لوگوں کو بُرے انجام سے ڈرانا ہے۔ اس کتاب سے ہدایت صرف وہ لوگ پائیں گے جو آخرت پر ایمان رکھتے ہوں۔ اس میں یہود اور مشرکین کی ایک مشترک بیماری پر تنبیہ کی گئی ہے وہ ہے اللہ ﷻ کی آیات اور دلائل میں غور و فکر نہ کرنا، یہ اس مرض کا اثر ہے کہ وہ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، اگر وہ دلائل میں غور کریں، اور حق بات کو قبول کرنے میں جاہلانہ، آبائی رسوم ورواج کی پروانہ کریں۔ تو اس بُرے انجام سے بچ سکتے ہیں۔

۴۔ تمام عبادات میں نماز کی اہمیت: اس آیت میں فرمایا ہے کہ جو لوگ آخرت پر ایمان لاتے ہیں وہ اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں یعنی صاحب ایمان شخص کی نشانی یہ ہے کہ ایسے لوگ اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ اس جگہ یہ سوال ہوتا ہے کہ آخرت پر ایمان لانے والے تمام نیک اعمال کی حفاظت کرتے ہیں اور تمام بُرے کاموں سے بچتے ہیں تو اس آیت میں نماز کا خصوصیت کے ساتھ کیوں ذکر فرمایا ؟ اس کا جواب ہے کہ اس سے اس بات پر توجہ دلانی ہے کہ ایمان لانے کے بعد سب سے افضل اور اشرف عبادت نماز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم میں نماز پر ایمان کا اطلاق فرمایا ہے: ”وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ“۔ (سورۃ البقرہ ۲، آیت: ۱۴۳) ترجمہ: اللہ کی یہ شان نہیں کہ وہ تمہارا ایمان (نماز) ضائع کر دے۔

نوٹ: حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ ﷻ نے پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ جس شخص نے ان نمازوں کے لئے اچھی طرح وضو کیا اور ان کو اپنے اوقات میں پڑھا اور ان کا پورا پورا رکوع اور خشوع کیا تو اللہ ﷻ نے (از راہ کرم) اس کی مغفرت کرنے کا ذمہ لیا ہے اور جس نے ایسا نہیں کیا تو اللہ ﷻ پر اس کا کوئی ذمہ نہیں ہے ‘اگر وہ چاہے تو اس کو بخش دے اور وہ چاہے تو اس کو عذاب دے۔ (سنن ابو داؤد، سنن النسائی، سنن ابن ماجہ)

آیت نمبر ۹۳: سب سے زیادہ ظالم کون ہے ؟:۔ اس سے پہلی آیت میں قرآنِ حکیم اور نبی کریم ﷺ کی صفات بیان فرمائی تھیں اور اس آیت میں سب سے بڑے ظالموں کی تین اقسام بیان فرمائی ہیں ایک وہ جس نے کوئی بات تو خود تراشی ہو اور اللہ ﷻ کے ذمے لگا دے کہ یہ اللہ ﷻ کا حکم ہے۔ اس میں وہ تمام لوگ شامل ہیں جو شرک و بدعات کی مختلف اقسام کو ایجاد تو خود کرتے ہیں پھر انہیں شریعت سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اس طرح ان رسوم و بدعات پر مذہبی تقدس کا خول چڑھا دیتے ہیں اس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو اللہ ﷻ کی آیات کا غلط مطلب نکال کر اور ان کی غلط تاویل کر کے اس کے عوض عارضی فوائد حاصل کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جھوٹے نبی جنہوں نے آپ کے بعد اپنی نبوت کا دعویٰ کیا ہے یا کریں گے حالانکہ آپ خاتم النبیین ہیں جیسے مسیلمہ کذاب، اسود عنسی، مرزا غلام احمد قادیانی اور ایسے ہی دوسرے لوگ اور آپ نے فرمایا ہے کہ میرے بعد تیس کے لگ بھگ ایسے کذاب اور دجال پیدا ہوں گے جو اپنی نبوت کا دعویٰ کریں گے (مسلم۔ کتاب الفتن۔ باب قولہ ان بین یدی الساعۃ کذابین قریبا من ثلاثین) اور تیسرے وہ لوگ جو یہ دعویٰ کریں کہ ہم بھی قرآن جیسی چیز بنا سکتے ہیں۔ جیسا کہ ایک دفعہ کفار مکہ نے بھی کہا تھا کہ (لَوْ نَشَاءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ 31) 8۔ الانفال: 31) حالانکہ جب قرآن نے ان کو ایسی ایک ہی سورت بنا لانے کا چیلنج کیا تو وہ اپنی بھرپور اور اجتماعی کوششوں کے باوجود اس کی نظیر لانے پر قادر نہ ہو سکے تھے۔

علمی بات: ۲۔ ظالموں کی تین اقسام کا بیان: i۔ جس نے کوئی بات خود گھڑی ہو اور کہے کہ یہ اللہ ﷻ کا حکم ہے۔

ii۔ نبوت کا جھوٹا دعوے کرنے والا۔ iii۔ جو شخص یہ دعویٰ کرے میں بھی قرآن کی طرح کچھ نازل کر سکتا ہوں (معاذ اللہ)۔

ظالموں کی غلط بیانی اور تکبر کی پاداش میں فرشتوں کا سختی سے ان کی روحوں کو قبض کرنے کا بیان ہے۔

۳۔عذاب جہنم سے پہلے عذاب کا ذکر عذاب برزخ کی دلیل ہے: آج سے مراد وہ دن ہے جس میں ان کی روح قبض کی جائے گی اور عذاب قبر کی ابتدا ہو گی۔ اس آیت میں عذاب قبر کی طرف واضح اشارہ ہے، کیونکہ قیامت تو جب اللہ ﷻ چاہے گا قائم ہو گی، درمیان کا وقفہ یعنی برزخ ہم سے پردے میں ہے۔ انسان کا کوئی جز کسی بھی جگہ میں ہو یا راکھ بن جائے، وہی اس کی قبر ہے اسے اسی جگہ وہی عذابِ قبر ہو گا۔

آیت نمبر ۹۴: میدان حشر کے منظر کا بیان ہے لوگوں کو اللہ ﷻ کے سامنے اکیلے اور خالی ہاتھ پیش ہونا ہو گا جیسا کہ سورۃ مریم ۱۹، آیت: ۹۵ میں بھی فرمایا کہ "ان میں سے ہر ایک قیامت کے دن اس کے پاس اکیلا آئے گا"۔

نوٹ: ۱۔ پہلی تخلیق سے مراد عالم ارواح میں روحوں کا پیدا کیا جانا۔ جیسا کہ سورۃ الاعراف ۷، آیت: ۱۷۲ میں ذکر ہے۔

۲۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "ہر انسان کے ساتھ قبر تک تین چیزیں جاتی ہیں، مال، اولاد اور عمل، اولاد اور مال تو اس کو قبر تک چھوڑ کر لوٹ آنے والی چیزیں ہیں، سوا کیلا عمل ہی اس کے ساتھ رہنے والی چیز ہے۔" (صحیح بخاری)

۳۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ دنیا اس کا گھر ہے جس کا کوئی گھر نہیں اور اس کا مال ہے جس کا کوئی مال نہیں اور دنیا کے لئے وہ شخص جمع کرتا ہے جس کو عقل نہیں۔ (مسند احمد، بیہقی)

علمی بات: روز قیامت شرک کرنے والوں کو ان کے خود ساختہ معبودوں کی سفارش اور موجودگی کی نفی کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ ظالم جو خود نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ایسی وحی تو ہم بھی اتار سکتے ہیں ان کی حالت قیامت کے دن دیکھنے کے قابل ہو گی۔ تن تنہا بے یار و مدد گار بارگاہ رب ذوالجلال میں پیش کیئے جائیں گے اور وہ جھوٹے خدا جن کی وہ عمر بھر پرستش کرتے رہے ان کا وہاں نام و نشان تک نہ ہو گا وہ گہری وابستگی، عقیدت اور بڑی بڑی توقعات سب ختم ہو کر رہ جائیں گی۔

آیت نمبر ۹۵: اللہ ﷻ کی قدرت کاملہ کے وہ کرشمے جن کا ہم ہر وقت مشاہدہ کرتے ہیں ان میں غور و فکر کی دعوت دی جا رہی ہے اور پوچھا جا رہا ہے کہ اے عقل کے دشمنو! یہ بتاؤ کہ عبادت کے لائق وہ ذات ہے جس کی قدرت کے یہ کرشمے ہیں کہ وہ خشک دانے اور سخت گٹھلی کو چیر کر اس سے سرسبز پودے اور بلند و بالا درخت اگاتا ہے۔ یا وہ بے جان پتھر کے بے بس بُت جنہیں اپنی بھی خبر نہیں۔ گندم کے دانے کا دل چیر کر کس طرح گندم کا پودا نکلتا ہے جس کی کئی بالیں ہوتی ہیں اور ہر بال پر الگ الگ خوشہ ہوتا ہے جس میں سینکڑوں دانے مضبوط غلافوں میں لپٹے ہوئے کس نے پیدا کئے۔ یہ اس چھوٹے سے دانے میں سے سینکڑوں کئی دانے کس نے بنا کر نکالے۔ آم کی چھوٹی سی گٹھلی سے اتنا تناور درخت کس نے بنایا۔ اگر انسان اسی میں غور و فکر کرے تو حقیقت روشن اور عیاں ہو جاتی ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے فرمایا وہی زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے نکالنے والا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا وہ نطفہ سے زندہ بشر پیدا فرماتا ہے اور زندہ بشر سے نطفہ پیدا کرتا ہے 'اسی طرح بے جان انڈے سے چوزہ نکالتا ہے اور مرغی سے بے جان انڈا نکالتا ہے اور متضاد چیزوں کا باہم خروج دعوتِ غور و فکر دے رہا ہے کہ یہ سب کچھ محض طبعی تقاضوں سے نہیں ہو رہا 'بلکہ ایک زبردست مدبر اور علیم کی قدرت سے ہو رہا ہے۔ اس کا یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ ایک بے جان بیج سے سرسبز کونپل نکل آتی ہے 'اور سرسبز درخت سے بے جان بیج نکل آتے ہیں 'اسی طرح کافر کے ہاں مومن اور مومن کے ہاں کافر پیدا ہوتا ہے 'اور عالم کے ہاں جاہل اور جاہل کے ہاں عالم پیدا ہوتا ہے۔

نوٹ: سیدنا ابو رزین عقیلی رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! اللہ ﷻ مردوں کو دوبارہ کس طرح زندہ کرے گا؟ رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا: "کیا تم کبھی بنجر زمین سے گزرے ہو؟" ابو رزین رضی اللہ عنہ نے عرض کی، جی! آپ ﷺ نے دوبارہ دریافت فرمایا: "پھر کبھی اسے سرسبز و شاداب بھی دیکھا ہے؟" ابو رزین رضی اللہ عنہ نے کہا، جی! تو آپ ﷺ نے فرمایا: "اسی طرح اللہ ﷻ موت کے بعد زندہ کرے گا۔" (سنن ابو داؤد)

آیت نمبر ۹۶: علمی بات: ۱۔ اللہ ﷻ ہی ہے جو رات کی تاریکی کا پردہ سمیٹ کر صبح کا دلفریب منظر ظاہر فرماتا ہے۔ رات کا وقت آرام و راحت کے لئے متعین ہونا ایک مستقل نعمتِ خداوندی ہے مگر یہ نعمت روزانہ بے مانگے مل جاتی ہے، اس لئے انسان کا دھیان بھی کبھی نہیں جاتا کہ یہ کتنا بڑا احسان وانعام ہے، غور کیجئے کہ اگر ہر شخص اپنے اختیار و ارادہ سے اپنے آرام کا وقت معین کرتا تو کوئی صبح آٹھ بجے سونے کا ارادہ کرتا، تو کوئی رات کو آٹھ بجے، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ کاروبار زندگی معطل ہو جاتا اور انسان کے آرام میں بھی خلل آتا اور کام کرنے والوں کے کام میں بھی، اللہ ﷻ کی چمکانہ قدرت قاہرہ نے صرف انسان پر نہیں بلکہ ہر جان دار پر رات کے وقت نیند کا غلبہ مسلط کر دیا کہ وہ ہر کام چھوڑ کر سو جانے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے، شام ہوتے ہی انسان، چرند پرندہ، درندہ، اور چوپائے اپنے اپنے گھر اور ٹھکانے کا رخ کرتے ہیں، اور تمام انسان پر کام چھوڑ کر آرام کرنے کی فکر میں لگ جاتے ہیں، پوری دنیا میں ایک سناٹا چھا جاتا ہے، رات کی تاریکی نیند اور آرام میں معین و مددگار ثابت ہوتی ہے، کیونکہ عام طور پر روشنی میں نیند نہیں آتی۔ غور کیجئے کہ اگر ساری دنیا کی حکومتیں اور عوام مل کر بین الاقوامی معاہدوں کے ذریعہ سونے کا کوئی ایک وقت مقرر کرنا چاہتے تو اولاً اس میں دشواریاں کتنی ہوتیں، ثانیاً اگر سارے انسان کسی معاہدہ کے پابند ہو کر ایک معین وقت سویا کرتے تو جانوروں کو اس معاہدہ کا پابند کون بناتا اور وہ کھلے پھرتے تو سونے والے انسانوں اور ان کے سامانوں کا کیا حشر ہوتا؟ یہ اللہ ﷻ ہی کی حکیم ذات ہے جس نے ہر جان دار پر ایک معین وقت میں نیند مسلط کر کے ان بین الاقوامی معاہدوں کی ضرورت سے بے نیاز کر دیا۔

۲۔ سورج اور چاند کے ذریعہ دنوں مہینوں اور سالوں کا حساب کتاب اللہ ﷻ کی حیرت انگیز قدرت کا مظہر ہے۔ یعنی سورج اور چاند کی گردش کے لئے ایک سالانہ اور ماہانہ نصاب مقرر کر دیا ہے۔ گرمیوں میں دن کا بڑا ہونا اور سردیوں میں دن کا چھوٹا ہونا اسی مقررہ نصاب اور نظامِ حکمت کی وجہ سے وجود میں آتا ہے اور سورج کے طلوع اور غروب میں اور زوال کے بعد ڈھل جانے میں نمازوں کے اوقات، ماہ رمضان میں سحری و افطاری کے اوقات ہیں اور چاند کے گھٹنے بڑھنے کی علامتوں سے مہینوں کا تعین، نیز ماہ رمضان عید الفطر عید الاضحیٰ اور حج کی عبادات انجام دی جاتی ہیں۔ اس آیت میں اللہ ﷻ نے تین نشانیاں بیان فرمائی ہیں۔ i۔ رات کو چیر کر صبح کو پیدا کیا۔ ii۔ رات کو آرام کے لئے بنایا۔ iii۔ سورج اور چاند کو حساب کے لئے بنایا۔

۳۔ حدیثِ مبارک میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اللہ ﷻ کی ان صفات کے ساتھ ثناء کر کے دعا کی ہے۔ اے اللہ (رات کی تاریکی سے) صبح کو چیر کر نکالنے والے اور رات کو آرام کے لئے بنانے والے سورج اور چاند کو حساب کے لئے بنانے والے میری طرف سے قرض کو ادا کر دے اور مجھے فقر سے غنی کر دے اور میری سماعت اور بصارت اور میری طاقت سے مجھے اپنے راستہ میں نفع عطا فرما۔ (موطا امام مالک)

آیت نمبر ۹۷: اس آیت میں ستاروں کے فوائد میں ذکر کیئے جا رہے ہیں کہ بحری و بری سفر کے دوران سمتوں کے تعین میں ان سے مدد ملتی ہے۔ ان میں اللہ ﷻ کے قدرت کے حسن و جمیل بھی نظارے موجود ہیں۔ اللہ ﷻ نے ستاروں کو پیدا کیا جن کے ذریعے مسافر رات کی تاریکیوں میں راستہ پہچانتے ہیں۔ ستاروں کی تخلیق کا ایک مقصد تو یہ ہے جو یہاں بیان ہوا تاہم، اس کے علاوہ ان کے دو مقصد اور ہیں جو دوسرے مقام پر بیان کیئے گئے، یعنی آسمان کی زینت اور شیطانوں کو مار بھگانا جس کا ذکر سورۃ الصّٰفّٰت ۳۷، آیات: ۶ تا ۱۰ میں ہے۔ ستاروں کے ان تین فوائد کے علاوہ اگر کوئی شخص ان کے بارے میں ایسی بات کہے جس کا تعلق ایمان و عقیدہ اور انسانی تقدیر سے ہو تو وہ گمراہی پر ہے اور اللہ ﷻ پر جھوٹ باندھتا ہے۔

آیت نمبر ۹۸: نفس واحد سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں جن سے تمام نسل انسانی وجود میں آئی۔ سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اللہ ﷻ نے آدم علیہ السلام کو مٹھی بھر مٹی سے پیدا کیا، جو ساری زمین سے لی گئی تھی، اسی لئے بنی آدم کی زمین کی طرح مختلف قسمیں ہیں، (رنگت کے اعتبار سے) کوئی سرخی مائل، کوئی گورا اور کوئی کالا ہے اور اسی طرح (طبیعت کے اعتبار سے) کوئی خوش مزاج، کوئی اکھڑ مزاج اور کوئی برا اور کوئی اچھا ہے۔" (جامع ترمذی، سنن ابو داؤد)

نوٹ: سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے کے بعد اللہ ﷻ نے ان کی پشت سے ان روحوں کو نکالا جو قیامت تک پیدا ہونے والی ہیں اور وہ روحیں آدم علیہ السلام کو دکھا کر فرمایا کہ یہ تمھاری وہ اولاد ہے جو سلسلہ در سلسلہ قیامت تک پیدا ہوں گی۔ "(جامع ترمذی)

علمی بات: مستقر اور مستودع کے بارے میں مفسرین کے اقوال: ماں کا بطن، دنیاوی زندگی، قبر، عارضی ٹھکانہ ہیں۔ انسان کا مستقل ٹھکانا آخرت ہے۔ ایک رائے یہ ہے کہ مستقر آخرت ہے اور مستودع دنیا ہے۔ دنیا میں جو وقت ہم گزار رہے ہیں یہ آخرت کے مقابلے میں بہت ہی قلیل ہے۔

نوٹ: تمام دلائل کھول کر بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ عقل و فہم رکھنے والے اللہ ﷻ کی نشانیوں میں غور و فکر کے بعد اللہ ﷻ کو پہچانیں اور اس کی وحدانیت اور قدرتِ کاملہ کا اقرار کریں۔

آیت نمبر ۹۹: اس آیت میں اللہ ﷻ کی قدرت کے نظاروں کا بیان کیا جارہا ہے۔ اللہ ﷻ بارش کے ذریعے اناج پیدا فرماتا ہے جس کے دانے تہ بہ تہ ہیں۔ اسی بارش کے پانی سے کھجوریں پیدا فرماتا ہے جن کے گچھے لٹک رہے ہوتے ہیں۔ اسی نے انگوروں کے باغات، زیتون اور انار پیدا فرمائے ہیں۔ پھل ایسے پیدا فرمائے ہیں جو ملتے جلتے ہیں اور ایسے پھل بھی جو مختلف ہیں۔ ایمان والے ان نشانیوں سے اللہ ﷻ کو پہچانتے ہیں اور ان کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔

نوٹ: پھل اپنے خواص، رنگ، مٹھاس، ذائقہ اور لذت وغیرہ میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ حالانکہ یہ ایک ہی زمین میں پیدا ہوتے ہیں۔ ایک ہی پانی سے ان سب کو سیراب کیا جاتا ہے۔ سب کے لئے آب و ہوا بھی ایک ہی ہے۔ ایک ہی سورج کی شعاعیں پڑنے کے باوجود یہ اختلاف اور تنوع آخر کس کی قدرت و حکمت کا نتیجہ ہے؟ سو وہی ہے اللہ ﷻ جو اس ساری کائنات کا خالق و مالک اور اس میں حاکم و متصرف ہے۔ پس وہی اللہ ﷻ معبود برحق ہے اور اس کی عبادت و بندگی میں کسی اور کو شریک کرنا شرک ہے جو کہ ظلم عظیم ہے۔

آیت ۱۰۰: عرب میں بعض گروہ ایسے بھی تھے جو جنات اور خبیث شیطانوں کی عبادت کرتے تھے اور مصیبت کے وقت ان کے نام کی دہائی دیتے اور کائنات میں ان کا تصرف مانتے تھے۔ ان سب کی اس آیت میں تردید فرمائی کہ بغیر سمجھ بوجھ کے انہوں نے جنوں کو اللہ ﷻ کا شریک ٹھہرالیا اور اس کے لئے بیٹے اور بیٹیاں گھڑ لیں۔ عرب کے مشرکین فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہا کرتے تھے۔ فرمایا، اللہ ان گھڑی ہوئی باتوں سے پاک ہے۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ آیت مجوسیوں کے بارے میں نازل ہوئی جو اللہ کو انسانوں، جانوروں اور ہر اچھی چیز کا خالق سمجھتے اور اسے "یزداں" کہتے تھے اور شیطان (ابلیس) کو درندوں، سانپوں اور ہر قسم کے شر کا خالق سمجھتے تھے اور اسے "اہرمن" کہتے تھے اور ان دونوں کو کائنات کے پیدا کرنے میں اللہ ﷻ کا شریک بناتے تھے، حالانکہ ان سمیت ہر چیز کا خالق اللہ ﷻ ہی ہے۔

آیت نمبر ۱۰۱: "بدیع" کے معنی عدم سے وجود میں لانے والا ہے۔ بدیع اس پیدا کرنے والے کو کہا جاتا ہے جس نے کوئی نمونہ سامنے رکھے بغیر کسی چیز کو پیدا کیا ہو اور یہ اللہ ﷻ کی صفت ہے کیونکہ اسی نے آسمان اور زمین کو بغیر کسی سابقہ مثال اور نمونہ کے تخلیق فرمایا۔ وہ ہر چیز کا خالق ہے اور ہر چیز اس کی مخلوق ہے۔ خالق اور مخلوق کے درمیان صرف عبودیت اور بندگی کا ہی رشتہ ہے۔ فرزندی یا قرابت کا کوئی رشتہ نہیں۔ کیوں کہ جس نے محض اپنی قدرت سے زمین اور آسمان کو پیدا کر دیا وہ صمد ذات ہے بیٹوں اور رشتہ داروں سے بے نیاز ہے اور اگر تم اپنی جہالت کی وجہ سے اولاد بنانے پر مصر ہو تو پہلے یہ بتاؤ کہ اس کی بیوی کون ہے جس کے بطن سے اس کی یہ اولاد ہوئی اور جب اس کی بیوی ہی نہیں تو اولاد کہاں سے آگئی۔ اس طرح مشرکین کے ساتھ یہود و نصاریٰ کے عقائد کا بھی رد کیا گیا ہے۔

آیت نمبر ۱۰۲: اس کائنات کا کارساز مطلق اور مقتدر اعلیٰ ایک اللہ ﷻ وحدہ لاشریک ہے۔ اگر اس کائنات کے صانع اور مدبر دو یا دو سے زائد ہوتے تو اس کا نظام بھی فاسد ہو جاتا اور جس طرح کسی مملکت کے دو صدر نہیں ہو سکتے، کیونکہ دونوں صدور کے باہمی اختلاف کی صورت میں اُس ملک میں

انتشار اور فساد پھیلے گا اسی طرح اس کائنات کے دو خالق نہیں ہوسکتے ورنہ ایک بارش کا حکم دیتا تو دوسرا روک دیتا وغیرہ وغیرہ اور نظامِ کائنات درہم برہم ہو جاتا۔ بہر حال ہر چیز کا خالق اللہ ﷻ ہی ہے اور معبود حقیقی بھی وہی ہے اور ہر قسم کی فعلی ، قولی اور بدنی عبادت کے لائق بھی وہی ہے۔

آیت نمبر ۱۰۳: ساری کائنات میں کسی بھی مخلوق کی نگاہ اللہ ﷻ کی ذات کا احاطہ نہیں کر سکتی جبکہ اللہ ﷻ کی نظر ساری کائنات پر محیط ہے، کائنات کا کوئی ذرہ اس کی نظر سے چھپا ہوا نہیں۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر جہان کے سارے انسان، جنّات، فرشتے اور شیطان جب سے پیدا ہوئے اور جب تک پیدا ہوتے رہیں گے وہ سب کے سب مل کر ایک صف میں کھڑے ہو جائیں تو سب مل کر بھی اس کی ذات کا اپنی نگاہ میں احاطہ نہیں کر سکتے۔ (ابن ابی حاتم)

نوٹ: ۱۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جب اہل جنت، جنت میں داخل ہو جائیں گے تو اللہ ﷻ ان سے فرمائیں گے کہ جو نعمتیں جنت میں مل چکی ہوں ان سے زائد اور کچھ چاہیئے تو بتلاؤ کہ ہم وہ بھی دیدیں، یہ لوگ عرض کریں گے، یا اللہ! آپ نے ہمیں دوزخ سے نجات دی، جنت میں داخل فرمایا، اس سے زیادہ ہم اور کیا چاہیں؟ اس وقت حجاب درمیان سے اٹھا دیا جائے گا اور سب کو اللہ ﷻ کی زیارت ہو گی اور جنت کی ساری نعمتوں سے بڑھ کر یہ نعمت ہو گی۔ (صحیح مسلم)۔

۲۔ رسول اللہ ﷺ ایک رات چاند کی چاندنی میں تشریف فرما تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مجمع تھا، آپ ﷺ نے چاند کی طرف نظر فرمائی اور پھر فرمایا کہ (آخرت میں) تم اپنے رب کو اسی طرح سامنے سے دیکھو گے جیسے اس چاند کو دیکھ رہے ہو۔ (صحیح بخاری)

۳۔ اللہ ﷻ جن لوگوں کو جنت میں خاص درجہ عطا فرمائیں گے ان کو روزانہ صبح و شام اللہ ﷻ کی زیارت نصیب ہو گی۔ (ترمذی، مسند احمد)

آیت نمبر ۱۰۴: آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ ان لوگوں کے طرف نبی کریم ﷺ کے ذریعے دین اور نشانیاں بھیجی ہیں جو ان کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہیں اور جنہوں نے انھیں دیکھ کر دینِ حق قبول کیا تو اُس کا فائدہ اسی کو ہو گا اور جو جان بوجھ کر اندھا بن گیا تو اس کا نقصان اسے ہی ہو گا۔ اللہ ﷻ کا اس میں کوئی نقصان نہیں ہے اور یہ کہ دین حق کو قبول کرنے پر میں تم پر نگہبان اور ذمّہ دار نہیں ہوں کیونکہ میں تو صرف رہنما ہوں ہدایت دینا اللہ ﷻ کا کام ہے۔

نوٹ: نبی کریم ﷺ پر یہ ذمہ داری نہیں کہ ان لوگوں کو جبراً حق اور اس کی اتباع پر مجبور کر دیں اور ناشائستہ کاموں سے روک ہی دیں، جیسے نگران اور محافظ کا کام ہوتا ہے، بلکہ رسول کا منصبی فریضہ صرف احکام کا پہنچا دینا اور سمجھا دینا ہے، پھر کوئی بھی اپنے اختیار سے ان کا اتباع کرے گا تو اس کو فائدہ پہنچے گا اور جو انکار کریگا اس کا وبال اسی پر ہو گا۔

آیت نمبر ۱۰۵: اللہ ﷻ کا توحید کے دلائل کو مختلف طریقوں سے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ:

i۔ جامع اور واضح دلائل سن کر مشرکین ازراہ تعصب یہ کہیں کہ رسول ﷺ نے یہ سب کس سے سیکھا؟

ii۔ ایمان والوں کو ایمان میں مزید تقویت نصیب ہوں۔

علمی بات: ۱۔ اگر ہم اپنی توحید کے دلائل کو صرف ایک ہی بار بیان کرتے تو کوئی سنتا کوئی نہ سنتا، کوئی سمجھتا اور کوئی نہ سمجھتا اور ایک ہی آیت کے بار بار تکرار سے اُکتاہٹ ہو جاتی اس لئے ہم ان دلائل کو مختلف اسلوب اور طریقوں سے بیان کرتے ہیں تا کہ آپ ﷺ کے مخاطب یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہو جائیں کہ واقعی آپ ﷺ جو دلائل مختلف طریقوں سے بار بار ہمیں بتا اور سنا رہے ہیں کسی کے سکھانے سے آپ ﷺ نے سیکھے ہیں۔

۲۔ ہٹ دھرم قسم کے کافروں کو بھی یہ کہتے ہوئے شرم آتی تھی کہ یہ کلام خود نبی کریم ﷺ نے گھڑ لیا ہے کیونکہ وہ آپ ﷺ کے اسلوب بیان سے اچھی طرح واقف تھے اور انھیں علم تھا کہ آپ ﷺ اُمی ہیں اور کسی کتاب سے خود پڑھ کر یہ کلام نہیں بنا سکتے، لہذا وہ قرآنِ حکیم کے بارے میں

یہ کہا کرتے تھے کہ نبی کریم ﷺ نے یہ کلام کسی سے سیکھا ہے اور اسے اللہ ﷻ کا کلام قرار دے کر لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ (معاذ اللہ) لیکن کس سے سیکھا ہے وہ بھی نہیں بتاسکتے تھے۔

آیت نمبر ۱۰۶: رسول ﷺ اور آپ ﷺ کے ذریعہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اللہ ﷻ کی طرف سے نازل کردہ کلام کی پیروی کرنے کی ہدایت کی جارہی ہے نیز توحید کی دعوت سے اعراض کرنے والوں کو ان کے حال پر چھوڑ دینے کی تلقین کی گئی ہے۔ اعراض کرنے کا یہ حکم مکی دور میں تھا جبکہ مدنی دور میں تو کفار سے جنگ کی اجازت اور حکم بھی دیا گیا ہے۔

علمی بات: کفار کی دل آزار باتوں پر نبی کریم ﷺ کو تسلی دینا: اس سے پہلی آیت میں یہ بتلایا تھا کہ کفار آپ ﷺ پر یہ بہتان باندھتے ہیں کہ (معاذ اللہ) آپ ﷺ نے کچھ علماء سے چند مضامین سیکھ لیئے ہیں اور ان کو آپ ﷻ اپنے الفاظ کے پیرائے میں ڈھال کر پیش کر دیتے ہیں اور پھر اس کو اللہ ﷻ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں اس کے بعد اللہ ﷻ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ آپ ﷺ اپنے رب کی نازل کی ہوئی وحی کی پیروی کیجئے تاکہ ان کی طعن آمیز باتوں سے آپ ﷺ کی دعوت اور تبلیغ متاثر نہ ہو۔ اس آیت سے مقصود اس رنج وملال کو دور کرنا ہے جو کفار کے شک وشبہ اور طعن وتشنیع سے آپ ﷺ کو ہوا ہے' اور یہ کہ آپ ﷺ کے دل کو تقویت حاصل ہو۔ پھر فرمایا اس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے۔ اس قول میں اس طرف توجہ مبذول فرمائی کہ آپ ﷺ صرف اپنے ربّ کی اطاعت کیجئے اور ان کی جہالت کی وجہ سے اپنے مشن کو متاثر نہ ہونے دیں اور مشرکین سے اعراض کیجیئے۔

آیت نمبر ۱۰۷: اللہ ﷻ سب کو ہدایت دینے پر قادر ہے لیکن زبردستی کسی کو ہدایت دینا اللہ ﷻ کی حکمت کے خلاف ہے۔ آپ ﷺ کو داعی اور مبلغ بنایا گیا ہے۔ آپ ﷺ کا کام لوگوں کے سامنے اس روشنی کو پیش کرنا اور اظہار حق کا حق ادا کرنے میں اپنی حد تک بھرپور کوشش کرنا ہے۔ اب اگر کوئی اس حق کو قبول نہیں کرتا تو نہ کرے۔ وہ اپنے انجام کے خود ذمہ دار ہیں۔

آیت نمبر ۱۰۸: مشرکوں کے شرک اور مخالفوں کے رد عمل میں مسلمانوں کو اخلاق کا دامن نہ چھوڑنے کی ہدایت۔ اس آیت مبارکہ میں مومنوں کو تعلیم دی گئی ہے کہ وہ ہر لحاظ سے اللہ ﷻ کا ادب واحترام ملحوظ رکھیں۔ چنانچہ اسی ضمن میں انہیں دعوت وتبلیغ کے آداب سکھاتے ہوئے مشرکین کے جھوٹے اور خود ساختہ معبودوں کو بھی برا کہنے سے اس لئے منع کیا گیا ہے کہیں مشرکین غصہ میں آکر بے سوچے سمجھے اللہ ﷻ کی شان اقدس میں نازیبا الفاظ استعمال کرنے لگیں۔ لہذا حق بات کرنے اور دین کی دعوت دینے میں بھی رسول اللہ ﷺ کے اعلی اخلاق کی پیروی کی جائے۔

نیز علماء کرام نے اس سے یہ مسئلہ بھی اخذ کیا ہے کہ جو کام خود کرنا جائز نہیں اس کا سبب بننا بھی جائز نہیں، چنانچہ حدیث مبارک ہے

فرمان نبوی ﷺ: حضرت عبد اللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کبیرہ گناہوں میں سے یہ گناہ بہت بڑا ہے کہ کوئی شخص اپنے والدین پر لعنت کرے۔ آپ سے پوچھا گیا اے اللہ کے رسول! آدمی اپنے والدین پر کیسے لعنت کر سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا: کوئی شخص (دوسرے) شخص کے باپ کو برا کہے تو (جواب میں) وہ اس کے باپ کو برا کہے اور وہ اس کی ماں کو برا کہے تو (جواب میں) وہ اس کی ماں کو برا کہے۔ (اس طرح سے وہ اپنے ماں باپ کو گالی دینے والا بن جائے گا) (صحیح بخاری)

نوٹ: رہا یہ معاملہ کہ قرآنِ حکیم کی بہت سی آیات میں بُتوں کا تذکرہ سخت الفاظ میں آیا ہے، اور وہ آیات منسوخ بھی نہیں، ان کی تلاوت اب بھی ہوتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آیات قرآنی میں جہاں کہیں ایسے الفاظ آئے ہیں وہ بطور مناظرہ کسی حقیقت کو واضح کرنے کے لئے وارد ہوئے ہیں وہاں کسی کی دل آزاری مقصود نہیں کیونکہ ان کے بُتوں کو بُرا بھلا کہنے سے فائدہ تو کچھ نہ ہوگا البتہ جواب میں وہ اللہ ﷻ کی توہین وتنقیص کریں گے۔ اس آیت کے آخر میں بتایا گیا ہے کہ اہل باطل اپنے باطل عقائد ہی کو حق سمجھ رہے ہیں۔ روزِ آخرت تمام حقائق کھل کر سامنے آجائیں گے۔

آیت نمبر ۱۰۹: شانِ نزول: قریش نے رسول اللہ ﷺ سے کہا اے محمد (ﷺ)! آپ ہمیں یہ خبر دیتے ہیں کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے پاس ایک لاٹھی تھی جس کو انہوں نے پتھر پر مارا تو اس سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے' اور آپ خبر دیتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) مردوں کو زندہ کرتے تھے اور

آپ خبر دیتے ہیں کہ ثمود کے پاس ایک اونٹنی تھی تو آپ بھی ان معجزات میں سے کوئی معجزہ پیش کریں ‘تاکہ ہم آپ کی تصدیق کریں ‘نبی کریم ﷺ نے فرمایا تم کیا چاہتے ہو کہ میں تمہیں کس قسم کا معجزہ دکھاؤں؟ انہوں نے کہا آپ ہمارے لئے صفا پہاڑ سونے کا بنادیں۔ آپ نے پوچھا اگر میں نے ایسا کر دیا تو تم میری تصدیق کروگے؟ انہوں نے کہا ہاں! بخدا اگر آپ نے ایسا کر دیا تو ہم سب آپ کی اتباع کریں گے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے دعا کی تو حضرت جبرائیل علیہ السلام آئے اور فرمایا آپ ﷺ کو اختیار ہے اگر آپ ﷺ چاہیں تو صبح کو یہ پہاڑ سونے کا ہو جائے گا اور اگر اس کے معجزہ پیش کرنے کے بعد بھی ایمان نہیں لائے تو ہم ان سب کو عذاب دیں گے اور اگر آپ ﷺ چاہیں تو آپ ﷺ ان کو چھوڑ دیں ‘حتی کہ ان میں سے توبہ کرنے والے کی توبہ قبول کرلی جائے گی۔ آپ ﷺ نے فرمایا بلکہ ان میں سے توبہ کرنے والے کی توبہ قبول کرلی جائے۔ تب اللہ ﷻ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

علمی بات: آپ ﷺ کا کام دین حق پر خود قائم رہنا اور دوسروں کو دینِ حق کی دعوت پہنچا دینا ہے، پھر بھی اگر وہ ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کریں گے تو ان کے بارے میں زیادہ فکر کی ضرورت نہیں ہیں کیونکہ آپ ﷺ کسی کو جبراً مسلمان نہیں بنا سکتے اگر جبراً سب کو مسلمان بنانا ہوتا تو اللہ ﷻ ہی سب کو مسلمان بنادیتے، اور ان آیات میں مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لئے یہ بھی بتلا دیا کہ اگر ہم ان کے مانگے ہوئے معجزات کو پیش کر دیں یہ تب بھی ایمان نہ لائیں گے، کیونکہ ان کا انکار کسی غلط فہمی یا ناواقفیت کی بنا پر نہیں، بلکہ ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے ہے۔

آیت نمبر ۱۱۰: اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ چونکہ کفار پہلی بار حق آجانے پر جان بوجھ کر جھٹلاتے رہے اور محض ہٹ دھرمی اور ضد کی وجہ سے اللہ ﷻ کی نشانیوں اور قرآن حکیم جیسے عظیم معجزے پر ایمان نہیں لائے لہذا اس مسلسل ہٹ دھرمی کی وجہ سے کفار کے دلوں اور نگاہوں کو پھیر دیں گے جس کی وجہ سے وہ آئندہ بھی ایمان سے محروم رہیں گے۔ اللہ ﷻ مشرکین کو ڈھیل دے رہے ہیں اور وہ سرکشی میں بڑھتے چلے جارہے ہیں۔

علمی بات: کفار کا یہ کہنا درست نہیں کہ آج تک انہیں کوئی نشانی اور معجزہ نہیں دکھایا گیا کہ جسے دیکھ کر وہ ایمان لاتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سے قبل بھی انہوں نے قدرتِ خداوندی کی نشانیاں اور معجزات دیکھے لیکن محض ہٹ دھرمی اور عناد کی وجہ سے انہوں نے اسلام قبول نہیں کیا۔ جیسے قرآن حکیم جیسا سب سے بڑا معجزہ ان کے پاس آیا اور انہوں نے انکار کیا۔ نبی کریم ﷺ کے اور بہت سے معجزات دیکھنے کے بعد انکار کیا اسی طرح جو معجزات یہ طلب کر رہے ہیں اس کو بھی دیکھ کر انکار کریں گے لہٰذا ان کی سرکشی کے باعث اللہ ﷻ سزا کے طور پر ان کے قلوب اور نگاہوں کو حق سے پھیر دیں گے ان کو گمراہی اور ضلالت کی تاریکیوں میں بھٹکتا چھوڑ دیں گے۔ پھر انہیں حق کے سمجھنے اور دیکھنے کی توفیق نہ ملے گی۔

آیت نمبر ۱۱۱: مشرکین کے مطالبات کے جواب میں یہ ارشاد فرمایا گیا کہ فرشتے نازل ہو کر رسول ﷺ کی تصدیق کریں، مُردے زندہ ہو کر ان سے ہم کلام ہوں، ان کی فرمائش کے مطابق ہر شے حاضر کر دی جائے تب بھی وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ ان کا معجزہ دکھانے کا مطالبہ جہالت اور ہٹ دھرمی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

جبری ایمان نہ مفید ہے نہ مطلوب: ارشاد فرمایا گیا کہ یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے مگر یہ کہ اللہ ﷻ چاہے کیونکہ وہ قادر مطلق سب کچھ کر سکتا ہے۔ مگر اس کا اپنا فرمان یہ ہے کہ وہ ایسا کوئی کام نہیں کرے گا جو اس کی حکمت اور عدل کے خلاف ہو۔ اس لیے وہ جبری ایمان چاہتا ہی نہیں بلکہ وہ یہ چاہتا ہے کہ انسان اپنی مرضی اور اپنے ارادہ و اختیار سے ایمان لائے تاکہ وہ اس کی رحمتوں اور عنایتوں سے مالا مال ہو سکے۔ وہ اگر چاہتا تو روئے زمین کے تمام انسانوں کو ایمان کی دولت عطا فرماتا۔ جیسا سورۃ یونس میں ارشاد باری تعالیٰ ہے "اور اگر آپ کا رب چاہتا تو وہ لوگ جو زمین میں ہیں سب ضرور ایمان لے آتے" (سورۃ یونس ۱۰، آیت:۹۹)۔ اللہ ﷻ ہدایت کی نعمت سے انہی کو نوازتا ہے جو اس کے طالب اور قدر دان ہوتے ہیں اور وہ اس کے لئے اس کی ودیعت کی ہوئی صلاحیتوں کو صحیح طور پر استعمال کرتے ہیں۔ بہر کیف اللہ ﷻ کے یہاں ایمان وہی معتبر اور مقبول ہے جو انسان اپنی مرضی اور اختیار سے قبول کرے کیونکہ اس میں رضامندی ہوتی ہے بخلاف جبر و اکراہ کے کہ اُس میں زبان سے اقرار تو کرلے گا مگر تصدیق قلب نہیں کریگا جس کی وجہ سے وہ ایمان معتبر نہ ہو گا۔

آیت نمبر ۱۱۲: "زخرف" اس چیز کو کہتے ہیں جس کا ظاہر اچھا اور باطن خراب ہو۔ معرکہ حق و باطل ہمیشہ سے جاری و ساری ہے یہ دشمنِ خدا ایک دوسرے کو ایسی ایسی باتیں سمجھاتے ہیں جو بظاہر بہت اچھی معلوم ہوتی تھیں۔ جیسے کسی بد صورت چیز پر ملمع سازی کر کے بظاہر خوب صورت بنادی جائے یہ لوگ ایسی باتیں سامنے لا کر اپنے لوگوں کو دھوکہ دیتے تھے تا کہ ایمان قبول نہ کریں۔ تاہم اس حوالہ سے رسول ﷺ اور آپ ﷺ کے ذریعہ اہل ایمان کو مشرکین کی ہٹ دھرمی کو خاطر میں نہ لانے کی تلقین کی گئی ہے۔ سابقہ انبیاء کرام علیہم السلام کے دشمنوں کا جو بھی حال تھا وہی ان لوگوں کا حال ہے جو آپ ﷺ کی مخالفت کر رہے ہیں۔ آپ ﷺ ان کی فتنہ پرور باتوں سے فکر مند نہ ہوں کہ یہ لوگ مخالفت میں لگے ہوئے ہیں۔

سوچنے اور غور کرنے کا مقام ہے: انبیاء کرام علیہم السلام کو تو مدد کی ضرورت تھی؟ 'اللہ ﷻ نے شیاطین کو بھی ان کے خلاف کیوں کھڑا کر دیا؟ یہ اللہ ﷻ کا قانون ہے کہ حق و باطل میں اس نوعیت کی کشاکش نہیں ہو گی تو پھر کھرے اور کھوٹے کی پہچان بھی نہیں ہو سکے گی۔ کیسے معلوم ہو گا کہ کون واقعی حق پرست ہے اور کون باطل پرست۔ یہ دنیا تو آزمائش کے لئے بنائی گئی ہے۔ پھر یہاں اگر شر کا وجود ہی نہ ہو تو خیر کے طلبگاروں کی آزمائش کیسے ہو گی؟ لہٰذا فرمایا کہ یہ کشمکش کی فضا ہم خود پیدا کرتے ہیں۔ ہم خود حق پر چلنے والوں کو امتحان میں ڈال کر ان کی استقامت کو پرکھتے ہیں اور پھر ثابت قدم رہنے والوں کو نوازتے ہیں۔ اس میدان میں جو جتنا آزمایا جاتا ہے اتنا ہی اس کا مرتبہ بلند ہوتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ راہ حق کے مسافروں کو مطمئن رہنا چاہیئے کہ ان کی قربانی رائیگاں نہیں جائیگی بلکہ ان کے درجات کی ترقی کا سبب بنیں گی۔

علمی بات: درحقیقت روحیں دو قسم کی ہوتی ہیں 'ایک طیب اور طاہر ہوتی ہیں یہ فرشتے ہیں 'اور دوسری ناپاک اور شریر ہوتی ہیں یہ شیاطین ہیں۔ ارواح طیبہ جس طرح لوگوں کو نیکی کا حکم دیتی ہیں اسی طرح ایک دوسرے کو بھی نیکی کا حکم دیتی ہیں اور ارواح خبیثہ جس طرح لوگوں کو برائی کا حکم دیتی ہیں اسی طرح ایک دوسرے کو بھی برائی کا حکم دیتی ہیں۔ پھر انسانوں میں جن کی سرشت نیک ہوتی ہے اور ان پر پاکیزگی اور خیر کا غلبہ ہوتا ہے ان کی فرشتوں کے ساتھ مناسبت ہوتی ہے اور ان پر الہام ہوتا ہے اور جن کی سرشت خبیث ہوتی ہے اور ان پر برائی کا غلبہ ہوتا ہے 'ان کی شیطانوں کے ساتھ مناسبت ہوتی ہے اور ان کے دلوں میں شیطان وسوسے ڈالتے رہتے ہیں۔ پھر انسانوں میں جو زیادہ خبیث اور سرکش ہوتے ہیں وہ برائیوں کو خوش نما بنا کر دوسرے لوگوں کو دھوکے میں ڈالتے ہیں اور لوگوں کو برائیوں اور گناہوں کی طرف راغب کرتے ہیں۔ اس آیت میں یہی بتایا ہے کہ شیطان جن اور شیطان انسان لوگوں کو دھوکے میں ڈالنے کے لیے برائیوں کو خوش نما بنا کر بیان کرتے ہیں اور اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے شیاطین خواہ انسانوں میں سے ہوں یا جنوں میں سے ان کے شر سے اللہ ﷻ کی پناہ طلب کرتے رہنے کا حکم دیا ہے۔

آیت نمبر ۱۱۳: آخرت کے محاسبے پر یقین نہ رکھنے والے ہر فریب کاری اور خوشنما باتوں کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ ان کو اپنے حال پر چھوڑ دینے کی ہدایت کی گئی ہے۔ بالآخر قیامت کے دن ان کی ساری کمائی سامنے آجائے گی۔ اس فلسفے کو ایک مثال سے سمجھیئے۔ پانی کا electrolysis کریں تو negative اور positive چارج والے آئنز (ions) الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اللہ ﷻ نے دنیا میں حق و باطل کے بیچ جو کشاکش رکھی ہے 'اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کھرے اور کھوٹے کی ionization ہو جاتی ہے۔ انسانی معاشرے میں اچھے اور برے کی تمیز ہو جاتی ہے۔ جیسے کہ سورۃ آل عمران ۳، آیت: ۱۷۹ میں بیان ہوا ہے "تا کہ وہ ناپاک کو پاک سے الگ کر دے"۔ معاشرے کے اندر عام طور پر پاک اور ناپاک عناصر ملے جلے ہوتے ہیں لیکن جب آزمائشیں اور تکالیف آتی ہیں تو منافق علیحدہ اور اہل ایمان علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ زیر نظر آیت میں یہی فلسفہ بیان ہوا ہے کہ شیاطین انس و جن کو کھل کر کھیلنے کی مہلت اسی حکمت کے تحت دی جاتی ہے اور منکرین آخرت کو بھی پورا موقع دیا جاتا ہے کہ وہ ان شیاطین کی طرف سے پھیلائے ہوئے باطل نظریات کی طرف مائل ہونا چاہیں تو بے شک ہو جائیں۔

آیت نمبر ۱۱۴: اللہ ﷻ نے جو مفصل کتاب نازل فرمائی ہے وہ آپ ﷺ کی نبوت کے سچا ہونے پر بطورِ دلیل کے کافی ہے۔ کفار مکہ یہ چاہتے تھے کہ ان کے اور نبی ﷺ کے درمیان جو مخالفت ہے اس کے بارے میں اہل کتاب یا کسی اور کو ثالث اور حکم بنالیا جائے، پھر جو فیصلہ وہ دیں اسے تسلیم کرلیا جائے، اس آیت میں ان کی اس تجویز کو رد کیا جارہا ہے کہ کیا میں اللہ ﷻ کے علاوہ کوئی اور منصف تلاش کروں۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے اپنے نبی ﷺ کو حکم دیا ہے کہ اللہ ﷻ کے ساتھ شرک کرنے والوں اور بُتوں کے پجاریوں سے کہہ دیں کہ میں کیسے اللہ ﷻ کے علاوہ کسی اور کو اپنے اور تمہارے درمیان فیصلہ کرنے والا مان لوں؟ دراصل یہ کفار قریش کے سوال کا جواب تھا کہ اے محمد (ﷺ)! ہم اپنے بتوں پر تمہاری بار بار کی تنقید سے تنگ آچکے ہیں، اس لئے کوئی تیسرا فیصلہ کرنے والا منتخب کرلو جو ہمارے درمیان فیصلہ کرے۔ تو اللہ ﷻ نے اپنے نبی سے کہا، آپ انہیں جواب دیں کہ میں اللہ ﷻ کے علاوہ کسی طاغوت کو اپنا حکم مان لوں، جب کہ اللہ ﷻ نے تمہاری ہدایت کے لئے وہ قرآنِ حکیم اتارا ہے جس میں حق و باطل اور حلال و حرام سب کچھ بیان کر دیا گیا ہے اور اہل کتاب تو خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ کتاب اللہ ﷻ کی طرف سے نازل کردہ ہے۔ اس لئے کہ تمام گزشتہ انبیاء کرام علیہم السلام نے اس قرآنِ حکیم کی بشارت دی ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ قرآنِ حکیم سابقہ کتابوں یعنی تورات ،زبور اور انجیل کی تصدیق کرتا ہے۔

آیت نمبر ۱۱۵: قرآنِ حکیم کے کلام الٰہی اور حق ہونے کے ثبوت میں مزید دو صفات کا بیان ہے کہ اللہ ﷻ کا کلام کامل ہے (خبر کے لحاظ سے) سچا اور (احکام کے لحاظ سے) عادل کلام ہے۔ اس کلام میں تبدیلی کرنے پر کوئی قادر نہیں۔ نیز اللہ ﷻ بندوں کے اقوال کو سننے اور سب حالات کو خوب جاننے والا ہے۔

علمی بات: کلمات سے وہ مضامین مراد ہیں جو قرآنِ حکیم میں مذکور ہیں۔ قرآنِ حکیم میں بہت سے احکام ہیں جو تفصیل سے بتا دیئے ہیں اور بہت سے احکام رسول اللہ ﷺ کو تفویض کر دیئے ہیں۔ آپ ﷺ کا بتانا اللہ ﷻ کا بتانا ہے، آپ ﷺ کی اطاعت اللہ ﷻ ہی کی اطاعت ہے۔ یہ سب احکام سچے ہیں اور عدل پر مبنی ہیں ان میں انصاف ہے، کسی پر ظلم و زیادتی اور کسی کی حق تلفی ان احکام میں روا نہیں رکھی گئی اور بعض حضرات نے عدل کو اعتدال کے معنی میں لیا ہے جس کا معنی یہ ہے کہ اللہ ﷻ کے احکام میں اعتدال ہے۔ نہ ہر چیز مباح ہے اور نہ ہر چیز حرام اور ممنوع ہے۔ کچھ مکروہات بھی ہیں ایسا بھی نہیں کہ سارا دین لوگوں کی خواہش کے مطابق ہو اور ایسا بھی نہیں کہ انسانوں کی خواہشوں اور نفس کے تقاضوں کا بالکل ہی لحاظ نہ کیا گیا ہو۔ اللہ ﷻ کے دین میں بنی آدم کے نفسوں کے تقاضوں کی بھی رعایت ہے اور کچھ ممنوعات بھی ہیں۔ جس میں بنی آدم کے لئے خیر پوشیدہ ہے پھر جو احکام ہیں ان میں استطاعت کی قید ہے۔ جیسا کہ سورۃ التغابن ۶۴، آیت:۱۶ میں ہے کہ "پس اللہ سے ڈرتے رہو جتنی تمہاری استطاعت ہے" اور سورۃ البقرہ ۲، آیت:۲۸۶ میں یہ بھی بتا دیا گیا کہ "اللہ کسی شخص پر اس کی طاقت سے زیادہ ذمہ داری نہیں ڈالتا۔"

آیت نمبر ۱۱۶: کفار کی اکثریت سے مرعوب نہ ہونے کی تلقین کی گئی ہے۔ کیوں کہ ہر دور میں اکثریت گمراہی کے راستے پر گامزن رہی ہے۔ چنانچہ حق و باطل کے سلسلے میں انسانوں کی کثرت و قلت معیار نہیں ہے۔ لوگوں کی اکثریت کا حال تو یہ ہے کہ وہ محض گمان اور جھوٹ کی پیروی میں مشغول ہوتے ہیں۔ حق کو قبول کرکے اُس کی پیروی کرنے سے دور رہتے ہیں۔ بیشتر لوگ جو دنیا میں بستے ہیں علم یقینی کے بجائے قیاس و گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور ان کے عقائد و فلسفے اور اصول زندگی اور اس کے قوانین سب قیاس آرائیوں پر مبنی ہیں۔ بخلاف اس کے جو اللہ ﷻ کا راستہ ہے، یعنی دنیا میں زندگی بسر کرنے کا وہ طریقہ جو اللہ ﷻ کی رضا کے عین مطابق ہے، اور وہ صرف ایک راستہ ہے جو اللہ ﷻ نے خود متعین کر دیا ہے۔ لہٰذا کسی طالب حق کو یہ نہ دیکھنا چاہیئے کہ دنیا کے بیشتر انسان کس راستہ پر جارہے ہیں بلکہ اسے پوری ثابت قدمی کے ساتھ اس راہ پر چلنا چاہیئے جو اللہ ﷻ نے بتائی ہے، چاہے اس راستہ پر دنیا میں اکیلا ہی رہ جائے۔

جدید جمہوری نظام جو کہ مغرب کا شاخسانہ ہے اوراب یہ فلسفہ نظام حکومت چہار سورائج ونافذ ہے اس کی نفی کے لئے یہ بڑی اہم آیت ہے۔ جمہوریت میں اصابتِ رائے (یعنی درست رائے) کے بجائے کثرتِ تعداد کو دیکھا جاتا ہے۔ بقول اقبال رحمۃ اللہ علیہ:

جمہوریت اک طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں، تولا نہیں کرتے!

اس حوالے سے قرآنِ حکیم کا یہ حکم بہت واضح ہے کہ اگر زمین میں بسنے والوں کی اکثریت کی بات مانو گے تو وہ تمہیں گمراہ کر دیں گے۔ دنیا میں اکثریت تو ہمیشہ باطل پرستوں کی رہی ہے۔ عہدِ نبوی ﷺ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعداد کا دنیا کی پوری آبادی سے موازنہ کیا جائے تو کیا تناسب بنتا ہے۔ اس لئے اکثریت کو انسانوں کے لئے قوانین بنانے کا اختیار دے دیا جائے تو اس صورت میں کسی خیر کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ انسانوں کے حق میں بہترین قوانین بنانے کا اختیار اور اقتدارِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ ہی کو حاصل ہے تاہم انسان فقط اس کے دئے ہوئے قوانین کو نافذ کرنے کے پابند اور اس کے عطا کردہ نظام خلافت وحکومت کے امین وپاسدار ہیں۔

آیت نمبر ۱۱۷: بے شک اللہ تعالیٰ ان کو خوب جانتا ہے جو اس کی راہ سے بہکے اور بھٹکے ہوئے ہیں اور وہ ان کو بھی خوب جانتا ہے جو سیدھی راہ پر ہیں۔ سو اللہ تعالیٰ ہر کسی کو پوری طرح جانتا ہے۔ اس لئے دنیا والوں کو اپنی دینداری کے مظاہر دکھانے کی بجائے اس وحدہٗ لاشریک کے حضور اپنی جواب دہی کی فکر کرنی چاہیئے اور اس سے اپنا معاملہ صاف اور صحیح رکھنا چاہیئے اس سے قبل کہ عمر رواں کی یہ فرصت محدود ان کے ہاتھ سے نکل جائے اور ہمیشہ کے لئے افسوس اور پچھتاوے سے دوچار ہونا پڑے۔

علمی بات: اس آیت کی تفسیر میں دو قول ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ جب آپ کو معلوم ہو گیا کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے، تو پھر آپ ان مخالفین کے درپے نہ ہوں، بلکہ ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیں۔ اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ کون ہدایت یافتہ ہے اور کون گمراہ ہے؟ وہ ہر شخص کو اس کے عقیدہ اور عمل کے اعتبار سے جزا دے گا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ کافر اگرچہ بہت یقین کے ساتھ یہ دعوی کرتے ہیں کہ وہ حق پر ہیں لیکن وہ جھوٹے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کے احوال پر مطلع ہے، اس کو معلوم ہے کہ یہ گمراہی کے راستہ میں بھٹک رہے ہیں اور جہالت کی وادیوں میں سرگرداں ہیں۔

آیت نمبر ۱۱۸: اس آیت میں مشرکین کے جاہلانہ نظریات اور توہمات کا رد کیا گیا ہے۔ وہ محض خیالی اندازوں پر اپنے دین کی بنیاد رکھے ہوئے تھے، اسی وجہ سے وہ اہل ایمان پر مختلف اعتراضات کرتے رہتے تھے۔ ان کی اس گمراہی کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا ہے اس کو یہ حرام کہتے ہیں اور جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے حرام کہا ہے اسے حلال سمجھتے ہیں۔

شانِ نزول: حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے پاس کچھ لوگوں نے آکر کہا یا رسول اللہ ﷺ کیا ہم اس چیز کو کھالیں جس کو ہم نے قتل کیا ہے اور اس کو نہ کھائیں جس کو اللہ تعالیٰ نے قتل کیا ہے؟ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی "اگر تم اللہ کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہو تو اس ذبیحہ سے کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو"۔ (جامع ترمذی، سنن ابو داؤد، سنن نسائی)

علمی بات: بعض چیزوں کو مشرکین نے بذاتِ خود حلال قرار دے دیا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ حرام ہیں۔ اور بعض چیزیں انہوں نے خود حرام ٹھہرالیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں حلال کیا ہے۔ خاص طور پر سب سے زیادہ جاہلانہ بات جس پر پہلے بھی بعض گروہ مُصر تھے اور آج بھی دنیا کے بعض گروہ اس پر بضد ہیں، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا نام لے کر جو جانور ذبح کیا جائے وہ تو ان کے نزدیک حرام ہے اور اللہ تعالیٰ کے نام کے بغیر جسے ذبح کیا جائے وہ حلال اور اس کا کھانا جائز ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ اس کی تردید کر کے مسلمانوں سے فرمارہا ہے کہ اگر تم حقیقت میں اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے ہو اور اس کے احکام کو مانتے ہو تو ان تمام اوہام اور تعصبات کو چھوڑ دو جو کفار ومشرکین میں پائے جاتے ہیں، صرف اسی چیز کو حرام سمجھو جسے اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے اور حلال اسی کو ٹھہراؤ جس کو اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا ہے۔

نوٹ: حلال جانور کا گوشت کھانے کی دو شرائط بیان کی گئی ہیں۔

i۔ اسے ذبح کیا جائے۔ ii۔ ذبح کرتے وقت اللہ ﷻ کا نام لیا جائے۔

علمی بات: حلال ذبیحہ کا فائدہ جو اب طبی تحقیق کے بعد کسی طور پر پوشیدہ نہیں کہ جس جانور کو شرعی طریقہ سے ذبح کیا جاتا ہے اس کا خون جسم سے اچھی طرح بہہ کر نکل جاتا ہے، اور جو جانور خود مر جاتا ہے یا غیر شرعی طریقہ سے ذبح کر دیا جائے مثلاً جھٹکا دے کر تو اس کا خون جسم ہی میں رہ جاتا ہے جس سے پورا گوشت خراب اور نقصان دہ ہو جاتا ہے، لیکن اللہ ﷻ نے یہ حکمت بیان فرمانے کے بجائے یہ کہنے پر اکتفا فرمایا کہ جو چیزیں حرام ہیں وہ اللہ ﷻ نے خود بیان فرما دی ہیں، لہٰذا اس کے احکام کے مقابلے میں خیالی گھوڑے دوڑانا مومن کا کام نہیں، کیونکہ اللہ ﷻ کے ہر حکم میں یقیناً کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے لیکن مسلمان کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ اپنی اطاعت اس مصلحت کے سمجھنے پر موقوف رکھے بلکہ اس کا فریضہ ہے کہ جب اللہ ﷻ کا کوئی حکم آجائے تو بے چون وچرا اس کی تعمیل کرے چاہے اس کی مصلحت اس کی سمجھ میں آئے یا اس کی سمجھ سے بالاتر ہو۔

آیت نمبر ۱۱۹: اہل ایمان کے لئے حلال و حرام کی تمیز کرنے میں کوئی مشکل نہیں۔ حرام کردہ اشیاء کی تفصیل بیان کر دی گئی۔ جبکہ سخت مجبوری کی حالت میں (کہ جان پر بنی ہو) تو بقدر ضرورت حرام جانور کا گوشت استعمال کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ واضح کیا گیا ہے کہ درست روش شریعت کی پیروی ہے نہ کہ اُن لوگوں کی جن کے نفس خواہشات کے تابع بھی اور اللہ ﷻ حد سے تجاوز کرنے والوں کو خوب جانتا ہے۔ حد سے گزر جانے والوں'' سے مراد علما یہود ہیں جنھوں نے مشرکین کو اس اعتراض پر اکسایا تھا۔ ایسے لوگوں سے باخبر ہونے اور ان کی گرفت کرنے کا بیان ہے۔

علمی و عملی بات: یہ بحیرہ 'سائبہ 'وصیلہ اور حام وغیرہ (بحوالہ سورۃ المائدۃ: ۱۰۳) کے بارے میں تمہارے تمام عقیدے من گھڑت ہیں۔ اللہ ﷻ نے ایسی کوئی پابندیاں اپنے بندوں پر نہیں لگائیں۔ لہٰذا حلال جانوروں کو اللہ ﷻ کا نام لے کر ذبح کیا کرو اور بلا کراہت ان کا گوشت کھایا کرو۔ مجبور ولاچار کے لئے رعایت کا ذکر و بیان ہے کہ اگر کوئی مجبور ہو جائے اور اس بناء پر ان میں سے بقدر ضرورت کچھ کھالے تو اس میں کوئی گناہ نہیں مگر ضرورت سے زیادہ نہیں کھانا چاہیئے کیونکہ شرعی قاعدہ یہی ہے کہ ضرورت کو ضرورت کی حد تک ہی رکھا جائے۔ "الضَّرُوْرَۃُ تُتَقَدَّرُ بِقَدْرِھَا" اور یہ شریعت مقدسہ کے اس عظیم الشان اور جامع اصول پر مبنی ہے کہ "الضُّرُوْرَاتُ تُبِیْحُ الْمَحْذُوْرَاتِ" یعنی "ضرورت کی بناء پر ممنوع چیزوں میں بھی اباحت اور جواز پیدا ہو جاتا ہے"۔ بہر کیف اس استثناء سے واضح فرما دیا گیا کہ مضطر اور مجبور انسان کے لئے بقدرِ ضرورت حرام چیزیں بھی مباح ہو جاتی ہیں جو رب العالمین کی غایت شفقت کا مظہر ہے۔

آیت نمبر ۱۲۰: اس آیت میں ظاہری اور باطنی ہر قسم کے گناہوں کو چھوڑ دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ پہلی قسم ظاہری گناہ ہیں جن سے مراد وہ گناہ ہیں جو اعلانیہ اور کھلم کھلا کیئے جائیں اور دوسری قسم باطنی یعنی پوشیدہ گناہ ہیں جن سے مراد وہ گناہ ہیں جو چھپ کر کیئے جاتے ہیں۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ ظاہری گناہ سے مراد وہ گناہ ہیں جو ظاہری اعضاء سے کئے جائیں اور پوشیدہ گناہ سے مراد وہ گناہ ہیں جو دل سے کئے جائیں۔ مثلاً تکبر، حسد، خود پسندی، مسلمانوں کا بُرا چاہنا، حرام کاموں کا ارادہ کرنا، بدگمانی کرنا، بے حیائی کے کاموں سے محبت کرنا، حلال کو حرام اور حرام کو حلال سمجھنا۔ گویا حلال و حرام صرف کھانے کی چیزوں میں منحصر نہیں ہے، بلکہ اللہ ﷻ کی رضا حاصل کرنے کے لئے ظاہر و پوشیدہ ہر طرح کے گناہوں کو چھوڑنا ضروری ہے۔

علمی و عملی بات: پہلی ہر قسم کے گناہوں کا بیان اور ان کے دنیاوی و اخروی نقصانات اور ان کو چھوڑنے کی صورت میں حاصل ہونے والے فوائد وفضائل قرآن حکیم، احادیث مبارکہ اور فقہ و تزکیہ نفوس کی کتابوں میں تفصیل سے ذکر کئے گئے ہیں اور ان کی تعلیم و تربیت علماء و اولیائے کرام اور فقہائے عظام سے حاصل کی جاسکتی ہے لہٰذا ہمیں ہر قسم کے گناہ اور باطنی برائیوں سے بچنے اور اپنی اصلاح و تربیت کے لئے نیک صحبت اور متقی و متبع سنت اہل اللہ کی اصلاحی مجالس اختیار کرنی چاہئیں، نیز روزانہ کی بنیاد پر بھی اپنا محاسبہ و فکر آخرت کرتے رہنا چاہیئے۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اللہ ﷻ سے زیادہ کوئی غیرت والا نہیں، اسی لئے اس نے تمام ظاہر اور پوشیدہ بے حیائی کے کاموں کو حرام کر دیا ہے۔" (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

آیت نمبر ۱۲۱: ذبح کرتے وقت جس جانور پر اللہ ﷻ کا نام عمداً نہ لیا گیا ہو یا غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو، اسے کھانے کی ممانعت ہے۔ ایسے کھانے کو "فسق" قرار دیا گیا ہے اور فسق کا مطلب ہے اطاعت سے نکل جانا۔

حلال کو حرام کرنے یا حرام کو حلال کرنے کا شرعی حکم: اس کے بعد اللہ ﷻ نے فرمایا بے شک شیطان اپنے دوستوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا رہتا ہے تاکہ وہ تم سے بحث کریں۔ اس وسوسہ کا بیان اس حدیثِ مبارک میں ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔ مشرکین یہ کہتے تھے کہ جس پر اللہ ﷻ کا نام لیا جائے اس کو نہ کھاؤ اور جس پر اللہ ﷻ کا نام نہ لیا جائے اس کو کھالو۔ (سنن ابن ماجہ، سنن ابو داؤد) وہ بحث یہ کرتے تھے کہ یہ کیا بات ہے جس کو اللہ ﷻ نے مارا ہے (یعنی مردار) اس کو تم نہیں کھاتے اور جس کو تم نے قتل کیا ہے (یعنی ذبیحہ) اس کو کھالیتے ہو۔ اس کے بعد فرمایا اگر تم نے ان کی اطاعت کی تو تم مشرک ہو جاؤ گے۔ اور اگر بھولے سے "بسم اللہ" نہ پڑھی جائے تو ذبیحہ کے حلال ہونے پر یہ حدیث دلالت کرتی ہے: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ مسلمانوں نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ کچھ لوگ ہمارے پاس گوشت لے کر آتے ہیں ہمیں پتا نہیں کہ انہوں نے ذبح کے وقت اللہ ﷻ کا نام لیا ہے یا نہیں! آپ ﷺ نے فرمایا تم اس پر "بسم اللہ" پڑھ کر کھالو، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا اس وقت لوگ نئے نئے کفر سے نکلے تھے۔ (صحیح بخاری، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ)

علمی و عملی بات: اللہ ﷻ کے حلال بتائے ہوئے کو حرام اور حرام بتائے ہوئے کو حلال سمجھنا بھی شرک ہے۔ یعنی ایک طرف اللہ ﷻ کی معبودیت کا اقرار کرنا اور دوسری طرف اللہ ﷻ کے نافرمان لوگوں کی وہ باتیں مان کر چلنا اور ان کے مقرر کیے ہوئے اُن طریقوں کی پابندی کرنا، جو شریعت کے متضاد ہوں شرک ہے۔ توحید یہ ہے کہ زندگی مکمل طور پر اللہ ﷻ کی اطاعت میں بسر کی جائے۔

آیت نمبر ۱۲۲: مُردہ اور زندہ کا موازنہ کرکے ہدایت یافتہ اور گمراہ شخص کے برابر نہ ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایمان کو نور اور کفر کو ظلمت قرار دیا گیا ہے۔ اللہ ﷻ مومن کو نورِ ایمان کے ذریعے زندہ فرما دیتا ہے۔ مومن کو وحی کے علم سے روشنی عطا ہوتی ہے جس کے مطابق وہ زندگی بسر کرتا ہے۔ جبکہ کافر، کفر و شرک کی تاریکیوں میں بھٹکتا پھرتا ہے اور جہالت کی تاریکی ہی اسے ہدایت کی روشنی معلوم ہوتی ہے۔

علمی بات: ۱۔ اللہ ﷻ نے کائناتِ عالم کی ہر چیز کو بامقصد پیدا فرما کر اور اس تک پہنچنے کی اس کو پوری ہدایت اور رہنمائی عطا فرمائی۔ جن کے تحت ہر مخلوق اپنی مقرر شدہ ذمہ داری بخوبی نبھا رہی ہے، اس کائنات میں زمین، پانی، ہوا اور آگ، اسی طرح آسمانی مخلوقات چاند، سورج، ستارے اور سیّارے اپنی اپنی ڈیوٹی پوری طرح ادا کر رہے ہیں، اور فرائض کی ادائیگی ان میں سے ہر چیز کی زندگی کا ثبوت ہے، اسی طرح اہلِ ایمان کا بامقصد زندگی گذارنا اُن کی زندگی کا ثبوت ہے اور اہلِ کفر و شرک کا بے مقصد زندگی گذارنا ان کے مردہ ہونے کی دلیل ہے۔

۲۔ تمام کائنات میں غور و فکر کرنے کے بعد ایک عقل مند انسان اس بات کو بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ انسان کی زندگی کا مقصد کیا ہے اور اس کی ذمّہ داری کیا ہے، اور یہ کہ اگر وہ ایمان و اعمال والی بامقصد زندگی گذار رہا ہے، تو وہ زندہ کہلانے کا مستحق ہے، اور اگر کفر و شرک اور بد عملی پر کاربند ہے تو وہ ایک مردہ لاش سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

آیت نمبر ۱۲۳: اہل مکہ نے مکہ کے اطراف میں ہر راستہ پر چار چار آدمی بٹھا دیئے تھے۔ تاکہ وہ لوگوں کو سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے سے روکتے رہیں۔ جو شخص باہر سے آتا اور مکہ میں داخل ہونا چاہتا تھا۔ اس سے یہ لوگ کہتے تھے کہ دیکھنا اس شخص سے بچ کر رہنا کیونکہ وہ جادوگر ہے جھوٹا ہے۔ درحقیقت ہر بستی اور علاقہ کے ظالم و فاسق اہل اقتدار اور اہلِ ثروت ہی نہ خود ہدایت قبول کرتے ہیں نہ ہی اپنے عوام کو حق قبول کرنے

دیتے ہیں۔ اس وقت پوری دنیا میں اس کا مظاہرہ دیکھا جاسکتا ہے کہ کس طرح اہلِ اقتدار اور ظالم مالدار لوگ دینِ حق کے لئے کیسے مشکلات پیدا کرتے ہیں۔

علمی بات: ان بستیوں کے مجرم سرداروں کو انبیاء علیہم السلام کا مخالف اس لئے بنایا کہ عہد شکنی ،مکر و فریب اور جھوٹی باتیں اور باطل رسومات کو لوگوں میں رائج کرنا ان ہی لوگوں کی قدرت اور اختیار میں تھا۔ نیز مال اور منصب کی قوت انسان کو ان کی حفاظت اور بقا پر اُبھارتی ہے پھر انسان ہر قسم کے جائز اور ناجائز حیلے اختیار کرتا ہے اور جھوٹ عہد شکنی اور دغابازی سے کام لیتا ہے۔ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ جس طرح اہل مکہ کے بُرے اعمال ان کے لیے مزین کر دیئے گئے ہیں اسی طرح انسانی معاشرہ میں اللہ ﷻ کی سنت جاریہ یہ ہے کہ ہر بستی میں اس کے فاسق سرداروں کو انبیاء اور ان کے متبعین کے مخالف بنا دیتا ہے اور اس وجہ سے حق اور باطل کے درمیان کشمکش جاری رہتی ہے۔ ان بستیوں کے مجرموں کے لیڈر اور فاسق سردار انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کے پیروکاروں کو مختلف طریقوں سے تنگ کرتے ہیں۔ اور ان کے خلاف فریب سے کام لیتے ہیں ،لیکن درحقیقت اس فریب کا نقصان ان ہی کو پہنچتا ہے۔ کیونکہ اس وجہ سے آخرت میں ان کو سخت عذاب دیا جائے گا۔ دنیا میں فاسقوں اور مجرموں کو غلبہ دینے کی حکمت یہ ہے کہ مسلمانوں کو آزمائش میں مبتلا کیا جائے اور جو مسلمان اس امتحان میں کامیاب اور سرخرو ہوں ان کو دنیا کی خلافت اور آخرت میں بلند درجات دیئے جائیں۔

آیت نمبر ۱۲۴: ولید بن مغیرہ نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ اگر نبوت واقعی کوئی چیز ہے تو میں تم سے زیادہ اس کا اہل ہوں کیونکہ میری عمر بھی تم سے زیادہ ہے اور میرا مال بھی کثیر ہے اور دوسرا سبب نزول یہ نقل کیا ہے کہ ابو جہل نے کہا کہ بنو عبد مناف نے شرافت کے سلسلے میں ہم سے مقابلہ بازی کی یہاں تک کہ ہم گھُڑ دوڑ کے گھوڑے بن کر رہ گئے۔ اب وہ کہہ رہے ہیں کہ ہم میں ایک اللہ ﷻ کے نبی ﷺ ہے جس کی طرف وحی کی جاتی ہے اللہ ﷻ کی قسم ہم اس مدعی نبوت پر ایمان نہ لائیں گے۔ جب تک ہمارے پاس بھی اسی طرح وحی نہ آجائے جیسی اس کے پاس آتی ہے۔ اس پر اللہ ﷻ نے آیت بالا نازل فرمائی جس میں ولید بن مغیرہ کا بھی جواب ہوا اور ابو جہل کا بھی۔ اللہ ﷻ نے جواب عطا فرمایا ہے کہ وحی کا نزول اللہ ﷻ کی مرضی کے مطابق اس کے چنے ہوئے بندوں پر ہوتا ہے۔ جب کہ منکرین حق کے لئے دنیا و آخرت میں ذلت و رسوائی اور سخت عذاب کی وعید سنائی گئی ہے۔

آیت نمبر ۱۲۵: اللہ ﷻ کی طرف سے ہدایت پانے والے اور گمراہ طبقہ کی علامات کا بیان ہے۔ سینہ کھول دینے سے مراد ہے فراخدلی سے حق قبول کرنا اور اس پر دلی اطمینان نصیب ہونا جب کہ سینے میں تنگی سے مراد ہے اسلام کی دعوت سے دل میں گھٹن پیدا ہونا اور اسے بوجھ سمجھنا۔ جس طرح زور لگا کر آسمان پر چڑھنا ممکن نہیں اسی طرح تنگ سینہ کے ساتھ ایمان کا حصول ممکن نہیں۔ ایسے شخص کو "رجس" میں مبتلا کر دیا جاتا ہے جس سے مراد عذاب یا شیطان کا اس پر تسلط ہے۔ ایسے شخص کے بارے میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب وہ اللہ ﷻ کا ذکر سنتا ہے تو اُسے وحشت ہونے لگتی ہے، اور جب کفر و شرک کی باتیں سنتا ہے تو اس کا جی لگتا ہے یعنی وہ اس کے من کو بھاتی ہیں۔

ترجمہ "اس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے" جب یہ آیت اتری تو رسول اللہ ﷺ سے شرح صدر کی تشریح دریافت کی گئی، تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا "مؤمن کے دل کے اندر اللہ ﷻ ایک نور ڈال دیتا ہے جس کی وجہ سے اس کا دل کشادہ اور وسیع ہو جاتا ہے ۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کیا اس کی کوئی علامت ہوتی ہے فرمایا ہاں غیر فانی گھر (یعنی آخرت) کی طرف میلان قلب ،اس فریب خانہ (یعنی دنیا) سے طبیعت کا اچاٹ ہونا اور موت آنے سے پہلے موت کی تیاری۔ (مستدرک الحاکم، بیہقی)

آیت نمبر ۱۲۶: اللہ ﷻ کا راستہ وہی ہے جس پر رسول اللہ ﷺ اور اہل ایمان چل رہے ہیں۔ اللہ ﷻ نے نصیحت حاصل کرنے والوں کے لئے تفصیل کے ساتھ نشانیاں اور احکام بیان فرما دیئے ہیں۔ یعنی جو حق کے طالب ہیں ان کی ہدایت کے سامان کے لئے تفصیل سے کتاب و سنت میں احکاماتِ شریعت بیان کر دیئے گئے ہیں۔

علمی بات: اس آیت کا معنی ہے یہ اسلام جس کے لیے اللہ ﷻ مومنوں کا سینہ کھول دیتا ہے 'یہی رب کا وہ طریقہ ہے جس کو اس نے لوگوں کے لیے پسند کر لیا ہے اور یہی طریق مستقیم ہے کیونکہ اللہ ﷻ کا بیان کیا ہوا راستہ مستقیم ہی ہوتا ہے جیسا کہ اس حدیث میں قرآنِ حکیم کے متعلق بیان ہوا ہے: حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ قرآن حکیم اللہ ﷻ کی مضبوط رسی ہے اور یہ ذکر حکیم ہے اور یہ صراط مستقیم ہے۔ (ترمذی) یعنی اس کی تعلیمات اور احکامات پر چلنے والا کبھی راہِ حق سے نہیں ہٹ سکتا۔

نوٹ: ایک حدیث شریف میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "لوگو! یاد رکھو، قرآن ہی کی طرح ایک اور چیز (یعنی حدیث) مجھے اللہ ﷻ کی طرف سے دی گئی ہے۔ خبر دار! ایک وقت آئے گا کہ ایک پیٹ بھرا (یعنی متکبر شخص) اپنی مسند پر تکیہ لگائے بیٹھا ہو گا اور کہے گا، لوگو! تمہارے لیے یہ قرآن ہی کافی ہے۔ اس میں جو چیز حلال ہے بس وہی حلال ہے اور جو چیز حرام ہے بس وہی حرام ہے۔ "(سنن ابو داؤد)

آیت نمبر ۱۲۷: فرماں بردار بندوں کے لئے اللہ ﷻ کی طرف سے "دارالسلام" کی بشارت اور وعدہ ہے۔ فرماں برداروں کے نیک اعمال کی وجہ سے اللہ ﷻ ان کا دوست، مددگار اور کارساز ہے۔

علمی بات: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "سلام" اللہ ﷻ کا نام ہے، اور دار السلام کے معنی ہیں اللہ ﷻ کا گھر اور ظاہر ہے کہ اللہ ﷻ کا گھر امن و سلامتی کی جگہ ہوتی ہے، اس لئے اس کے معنی ہوئے کہ وہ گھر جس میں ہر طرح کا امن و سکون اور سلامتی و اطمینان ہو۔ جنت کو دار السلام فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ جنت ہی صرف وہ جگہ ہے جہاں انسان کو ہر قسم کی تکلیف، پریشانی سے مکمل اور دائمی سلامتی حاصل ہو گی۔ دنیائے فانی ایسی مکمل اور دائمی راحت کا مقام ہی نہیں۔ جنت کو دارالسلام کہنے کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ اہلِ جنّت کو جنت میں دخول کے وقت سلام کیا جائے گا اللہ ﷻ کی طرف سے فرشتوں کی طرف سے اور اہل اعراف کی طرف سے ان کو سلام پیش کیا جائے گا اور جنتی بھی ایک دوسرے کو سلام کریں گے۔

آیت نمبر ۱۲۸: میدان حشر میں انسانوں اور جنات کو جمع کرنے کے بعد اللہ ﷻ ان سے سوال کریں گے۔ جنوں سے مراد یہاں شیطان جن ہیں۔ ان کا بہت سے انسانوں کو اپنا بنا لینے کا مطلب انھیں گمراہ کر کے اپنے راستے پر لگا لینا ہے اور جنّات کا انسانوں سے فائدہ اٹھانا یہ ہے کہ جنّات نے ان کو گمراہی کی دعوت دی اور انسانوں نے اسے قبول کر لیا اور ان کی تعظیم و تکریم کی اور مصیبتوں کے وقت ان کو پکارنا شروع کر دیا اور یہی شیاطین کی کامیابی ہے اور انسانوں کا جنّات سے فائدہ اٹھانے سے مراد ان سے آسمان دنیا سے سنی ہوئی خبر میں سو جھوٹ ملا کر لوگوں کو بتانا تاکہ لوگ ان کے معتقد رہیں اور ان کی دوکانداری چلتی رہی اور اس کے ذریعے وہ دنیا میں مال و دولت اور ناموری حاصل کریں۔

علمی بات: ا۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ انسانوں کا جنات سے نفع حاصل کرنا یوں تھا کہ جب ان میں سے کوئی شخص سفر پر جاتا اور جنات کا خوف ہوتا تو جس منزل پر اترنا ہوتا تو یوں کہتے کہ اَعُوْذُ بِسَیِّدِ ھٰذَا الوَادِی (کہ میں اس وادی کے سردار کی پناہ لیتا ہوں) یعنی اللہ ﷻ کی پناہ لینے کی بجائے شیاطین کی پناہ لیتے تھے۔ اور شیاطین کا انسانوں سے نفع حاصل کرنا یہ تھا کہ جب یہ لوگ اَعُوْذُ بِسَیِّدِ ھٰذَا الوَادِی کہتے تھے تو جنات خوش ہوتے اور کہتے تھے کہ دیکھو انہوں نے ہمیں کو پناہ دینے پر قادر سمجھا اور جو پناہ اللہ ﷻ سے مانگنی چاہیئے تھی وہ ہم سے مانگی۔

۲۔ ان دونوں گروہوں کے لئے دوزخ کی سزا مقرر ہے۔ سزا اور جزا کا فیصلہ اللہ ﷻ کی حکمت پر مبنی ہوتا ہے اور اس کے احاطہ علم سے کوئی چیز باہر نہیں۔

آیت نمبر ۱۲۹: اس آیت کے دو مفہوم ہیں i: ۔ دنیا کی طرح جہنم میں بھی ایک دوسرے کے ساتھی ہوں گے۔ ii۔ جیسے انسان اور جن ایک دوسرے کے ساتھی تھے اسی طرح ظالموں کے دوست بھی ویسے ہی ظالم ہوں گے۔ ان کے یہ دوست بُرے اعمال میں ان کی مدد کرتے تھے۔

دنیا میں بھی اعمال و اخلاق کا اجتماعی معاملات پر اثر: موجودہ رشتوں، ناطوں کا کٹ جانا روز قیامت میں تو واضح اور مکمل طور پر سب کے سامنے آ ہی جائے گا مگر دنیا میں بھی اس کا ایک ادنیٰ سا نمونہ ہر جگہ پایا جاتا ہے کہ نیک آدمی کو نیکوں سے مناسبت ہوتی ہے انہی کی جماعت اور سوسائٹی سے وابستہ ہوتا ہے اور اس طرح نیک کاموں میں اس کے لئے راستے کھلتے نظر آتے ہیں، اور ارادہ مضبوط ہوتا جاتا ہے، اسی طرح بد کردار کو اپنے ہی جیسے بد کرداروں سے

تعلق اور انس ہوتا ہے وہ ان ہی میں اٹھتا بیٹھتا ہے، اور ان کی صحبت سے اس کی بد عملی و بد خُلقی میں روز نیا اضافہ ہوتا رہتا ہے اور نیکی کے راستے اس کے سامنے سے بند ہوتے جاتے ہیں، یہ اس کے برے عمل کی نقد سزا اسی دنیا میں ملتی ہے۔

علمی بات: ۱۔ نیک و بد اعمال کی ایک جزاء سزاء تو آخرت میں ملے گی اور ایک جزاء سزا نقد اسی دنیا میں اس طرح مل جاتی ہے کہ نیک آدمی کو نیک اور دیانتدار رفقاء نصیب ہو جاتے ہیں جو اس کے کام میں معاون بن کر دینی و دنیوی ترقی کا سبب بنتے ہیں، اور برے اور بدنیت آدمی کو رفقاء کار بھی اسی جیسے ملتے ہیں جو بُرے کاموں میں اس کے معاون بن کر راہِ حق اور اچھے اعمال سے دور کر دیتے ہیں نتیجتاً وہ خسر الدنیا والآخرہ کا مصداق بن جاتا ہے۔

۲۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اللہ ﷻ بعض ظالموں کو بعض پر مسلط کر دے گا اور اس آیت میں ہر قسم کے ظالم داخل ہیں۔ وہ شخص جو معصیت کر کے اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے اور جو حاکم اور افسر اپنے ماتحت لوگوں پر ظلم کرتا ہے اور ایسے ہی وہ تاجر جو جعلی اور ملاوٹ والی چیزیں فروخت کر کے خریداروں پر ظلم کرتا ہے اسی طرح جو چور اور ڈاکو مسافروں اور شہریوں سے لوٹ مار کر کے ظلم کرتے ہیں اور سیاسی عہدہ دار اور عوامی نمائندے عوام کے خون پسینے کی کمائی اپنی دنیاوی عیش و عشرت پر لٹاتے ہیں نتیجتاً ان سب ظالموں پر اللہ ﷻ ان سے بڑا ظالم مسلط کر دیتا ہے۔

نوٹ: ایک حدیث شریف میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے، "جیسے تم ہو گے ویسے ہی حکام تم پر مسلط ہوں گے" (بیہقی)، یعنی تم ظالم و بدکار ہو گے تو تمہارے حاکم بھی ظالم و بدکار ہی ہوں گے اور تم نیک عمل و نیک کردار ہو گے تو اللہ ﷻ تمہارے حُکّام نیک، رحم دل اور منصف مزاج لوگوں کو بنا دے گا۔

آیت نمبر ۱۳۰: علمی بات: سورہ جن کی ابتدائی آیات میں جنّات کا قرآن حکیم سننا اور ایمان لانے کا ذکر صراحتاً موجود ہے جس کے بعد اس میں کوئی تردد کی گنجائش نہیں ہے کہ آپ ﷺ جن و انس کے لئے مبعوث کئے گئے تھے۔ روز آخرت اللہ ﷻ کا انسان اور جنات دونوں سے خطاب کا ذکر ہے۔ اُن سے رسولوں کی دعوت حق لانے کے متعلق سوال ہو گا کیوں کہ یہ دو مخلوقات اللہ ﷻ کے احکام کی مکلّف ہیں۔ دونوں گروہوں کے کفار اور فاسق لوگ اپنی غلطیوں کا اعتراف کریں گے۔ یہ وہ لوگ تھے جو آخرت سے غافل تھے اور دنیا کی زندگی کے دھوکہ میں مبتلا تھے۔

انسانوں میں تو پیغمبروں کا تشریف لانا واضح ہے، اس آیت میں بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جنات میں بھی رسول مبعوث ہوتے رہے ہیں۔ چنانچہ اسی بنا پر بعض علماء کا کہنا ہے کہ جنات میں بھی آنحضرت ﷺ سے پہلے پیغمبر آتے رہے اور دوسرے حضرات کا کہنا یہ ہے کہ باقاعدہ پیغمبر تو جنات میں نہیں آئے؛ لیکن انسانوں میں جو پیغمبر بھیجے گئے وہی جنات کو تبلیغ کرتے تھے اور جو جنات مسلمان ہو جاتے وہ پھر انبیاء کرام کے نمائندے بن کر دوسرے جنات کو بھی تبلیغ کرتے تھے، جیسا کہ سورۃ جن میں تفصیل سے مذکور ہے، آیت کی رو سے دونوں احتمال ممکن ہیں؛ کیونکہ آیت کا مقصد یہ ہے کہ انسانوں اور جنات دونوں کو تبلیغ کا حق ادا کر دیا گیا اور وہ دونوں طرح ممکن ہے۔

آیت نمبر ۱۳۱: رسولوں کے ذریعے اتمام حجت کا بیان فرمایا گیا ہے کہ اللہ ﷻ کسی قوم کو خبردار کیئے بغیر عذاب میں مبتلا نہیں فرماتا۔ جب کوئی بستی گمراہی اور فسق و فجور میں منہمک ہو جاتی ہے تو اچانک اس پر عذاب نازل نہیں کیا جاتا بلکہ سنت الٰہی یہ ہے پہلے ان کی طرف اللہ ﷻ کا پیغام سنانے والے بھیجے جاتے ہیں جو ان کو سمجھاتے ہیں اور اس گمراہی اور بدکاری سے باز آجانے کی نصیحت کرتے ہیں۔ اگر پھر بھی وہ گمراہی اور بد اعمالیوں پر بضد رہیں تو عذاب الٰہی نازل ہوتا ہے جو انہیں نیست و نابود کر دیتا ہے۔

آیت نمبر ۱۳۲: اللہ ﷻ ہر ایک کے اعمال سے باخبر ہے۔ یعنی اہل ایمان کو ان کے اعمال کے مطابق درجات اور مرتبے عطا فرمائے گا اور اللہ ﷻ تکذیب کرنے والوں سے بھی بے خبر اور غافل نہیں ہے اُن کی بد عملیوں کی سزا ان کو ضرور ملے گی۔

عملی پہلو: درجات و مراتب کا انحصار انسان و جنات کے اپنے عمل و کردار پر ہے ہر کسی کے درجات و مراتب کا مدار اس کے عمل و کردار پر ہو گا۔ جیسا کسی کا عمل ہو گا، ویسا ہی وہ اس کا صلہ اور بدلہ پائے گا۔ مدار بہر حال اپنے عقیدہ و عمل اور اخلاق و کردار پر ہو گا نہ کہ رنگ و نسل وغیرہ کے امتیازات پر جو کہ اہل دنیا نے از خود گھڑ رکھے ہیں۔

آیت نمبر ۱۳۳: اللہ ﷻ غنی، بے نیاز، صاحب رحمت اور قدرت کاملہ کا مالک ہے۔ اللہ ﷻ ہی ہدایت عطا فرماتا ہے اور اصلاح کے لئے مہلت بھی۔ اللہ ﷻ قادر ہے کہ مشرکین کے جرائم کی پاداش میں انہیں فنا کر کے دوسری قوم لے آئے۔

عملی پہلو: یعنی جس طرح اس نے پہلی قوموں کو ختم کر کے بعد کے لوگوں کو دیانتداری عطا کی اور اپنا نائب و امین بنایا۔ یہ اس بات کی واضح دلیل اور گواہی ہے کہ وہ قادر مطلق تمہاری جگہ دوسروں کو لا کر بسانے کی بھی پوری قدرت رکھتا ہے۔ پس تمہیں اگر آج محنتِ عمل کا موقع ملا ہوا ہے تو اس کو غنیمت سمجھو کہ یہ کبھی بھی چھن سکتا ہے۔ نیز تمہیں اگر دین کی خدمت کا کوئی موقع ملتا ہے تو اس کو اپنی خوش نصیبی جانو ورنہ نہ وہ تمہارا محتاج ہے نہ اس کا دین۔

غنی ہونے کے باوجود اللہ ﷻ اپنے مخلوق کے لئے رحیم بھی ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اللہ ﷻ کی سو رحمتیں ہیں، ایک رحمت اس نے جنوں، آدمیوں، جانوروں اور کیڑوں مکوڑوں میں اتاری ہے، وہ اسی ایک رحمت کی وجہ سے ایک دوسرے پر مہربانی اور رحم کرتے ہیں اور اسی ایک رحمت کی وجہ سے وحشی جانور اپنے بچوں سے محبت کرتے ہیں اور ننانویں رحمتیں اللہ ﷻ نے اٹھا رکھی ہیں جو وہ اپنے بندوں پر قیامت کے دن کرے گا۔" (صحیح مسلم)

وہ بے نیاز ہے، نہ اپنی مخلوقات کا محتاج ہے نہ ان کی عبادتوں کا ضرورت مند۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ: سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اللہ ﷻ فرماتا ہے کہ اگر تمہارے اگلے اور پچھلے، تمہارے آدمی اور جن، سب ایسے ہو جائیں جیسے تم میں بڑا پرہیز گار شخص ہو تو اس سے میری سلطنت میں کچھ اضافہ نہیں ہو گا اور اگر تمہارے اگلے اور پچھلے، تمہارے آدمی اور جن، سب ایسے ہو جائیں جیسے تم میں سب سے بڑا بدکار شخص ہو تو اس سے میری سلطنت میں سے کچھ کم نہیں ہو گا۔" (صحیح مسلم)

آیت نمبر ۱۳۴: اللہ ﷻ کا وعدہ بہر حال پورا ہو کر رہے گا: روز جزاء کا وقوع اور اعمال کا بدلہ جزا و سزا کوئی مانے یا نہ مانے، بہر حال ہو کر رہے گا۔ تاکہ عدل و انصاف کے تقاضے مکمل طور پر پورے ہو سکیں۔ اور ہر کسی کو اسکی زندگی بھر کے اعمال کا پورا پورا صلہ اور بدلہ مل سکے۔ اور اس کائنات کے وجود اور مقصد تخلیق کی تکمیل ہو سکے۔ پس رسولوں کی تکذیب اور حق و ہدایت سے انکار پر اس خالق و مالک نے عذاب کا جو وعدہ تم لوگوں سے فرما رکھا ہے وہ بہر حال پورا ہو کر رہنا ہے خواہ وہ دنیا کے جلدی عذاب کی شکل میں آئے یا یوم الحساب کے عذاب اخروی کی صورت میں ملے۔ اس کو روکنے یا ٹالنے کی محال اور طاقت کسی میں نہیں۔ پس عقل و فہم کا تقاضا یہ ہے کہ منکر لوگ اسے جلدی مانگنے کے بجائے اس کے عذاب سے بچنے کی فکر کریں کہ جب وہ آ گیا- اعاذنا اللہ من ذٰلک العیاذ باللہ تو پھر اس سے بچنے کی کوئی صورت ممکن نہ ہو گی اللہ ﷻ ہمیں فکر و عمل کی ہر قسم کی کوتاہی اور ہر قسم کی بے راہ روی سے ہمیشہ محفوظ رکھے آمین ثم آمین۔

آیت نمبر ۱۳۵: مشرکین کو دوٹوک انداز میں بُرے انجام سے خبردار کیا گیا ہے۔ انہیں بتا دیا گیا ہے کہ ظالم یعنی مشرک کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔

علمی بات: دارالآخرت سے پہلے دار دنیا میں بھی فلاح و کامیابی بالآخر اللہ ﷻ کے نیک بندوں ہی کو حاصل ہوتی ہے، جیسا کہ رسول کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے کے حالات اس پر شاہد ہیں کہ بہت تھوڑے عرصہ میں قوت و اقتدار کے مالک تمام مخالفین ان کے سامنے ذلیل ہوئے، ان کے ملک ان کے ہاتھوں فتح ہوئے، خود عہد رسالت ﷺ میں تمام جزیرہ عرب آپ ﷺ کے زیر نگین آ چکا تھا، یمن اور بحرین سے لے کر حدود شام تک آپ ﷺ کی حکومت پھیل گئی، پھر آپ ﷺ کے خلفاء راشدین اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہاتھوں تقریباً پوری دنیا اسلام کے جھنڈے تلے آ گئی، اور اللہ ﷻ کا یہ وعدہ پورا ہوا جیسا کہ سورۃ المجادلہ ۵۸، آیت: ۲۱ میں ارشاد ہوا ہے کہ "اللہ ﷻ نے لکھ دیا ہے کہ میں غالب آؤں گا اور میرے رسول غالب آئیں گے۔"

آیت نمبر ۱۳۶: مشرکین زمینی پیداوار اور مویشیوں میں سے ایک حصہ اللہ ﷻ کے نام اور دوسرا حصہ خود ساختہ معبودوں کے لئے مقرر کرتے تھے۔

شانِ نزول: مشرکوں کا دستور تھا کہ اپنی کھیتیوں، باغات کے پھلوں، مویشیوں کے بچوں اور تمام مالوں میں ایک حصہ اللہ ﷻ کا اور ایک حصہ بتوں کا مقرر کرتے تھے۔ اللہ ﷻ کا حصہ تو مہمانوں اور مسکینوں پر صرف کرتے تھے اور بتوں کا حصہ نوکروں چاکروں اور خدمت گاروں کے صرف میں

لاتے تھے اور اللہ ﷻ کے حصہ میں سے اگر کچھ بتوں کے حصہ میں شامل ہو جاتا تو پروا نہیں کرتے تھے اور کہتے تھے اللہ ﷻ محتاج نہیں اس کو اس کی کوئی ضرورت نہیں لیکن اگر بتوں کے حصہ میں سے کچھ اللہ ﷻ کے حصہ میں شامل ہو جاتا تو فوراً نکال کر بتوں کے حصہ میں ملا دیتے اور کہہ دیتے یہ حاجت مند ہیں پھر اللہ ﷻ کے حصہ کی اگر کوئی چیز تلف یا کم ہو جاتی تو ان کو پروانہ بھی نہ ہوتی اور بتوں کے حصہ کی کوئی چیز تلف یا کم ہو جاتی تو فوراً اس کے عوض پوری کر دیتے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

نوٹ: بتوں کے لئے مخصوص حصّہ مجاور وغیرہ کے پاس جاتا تھا چنانچہ وہ اسی وجہ سے ان مشرکین سے بتوں کا حصّہ کم نہ ہونے دیتے تھے کیوں کہ خود ان کی جیبیں ان سے بھرتی تھیں۔

آیت نمبر ۱۳۷: زمانہ جاہلیت کے عرب اپنے آپ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کا پیرو کار سمجھتے تھے اور اس بنا پر ان کا خیال یہ تھا کہ جس مذہب (دین) کی وہ اتباع کر رہے ہیں وہ اللہ ﷻ کا پسندیدہ مذہب (دین) ہے۔ لیکن جو دین اس زمانے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام سے سیکھا تھا اس کے اندر بعد میں آنے والے مذہبی پیشوا، قبائل کے سردار، خاندانوں کے بڑے بوڑھے مختلف طرح کے عقائد اور رسوم و رواج کا اضافہ کرتے چلے گئے جنھیں بعد میں آنے والی نسلوں نے اصل مذہب کا حصّہ سمجھا اور نہایت عقیدت مندی کے ساتھ ان کی پیروی کی۔ چونکہ کسی کتاب، یا تاریخ میں ایسا کوئی ریکارڈ محفوظ نہ تھا جس سے معلوم ہوتا کہ اصل مذہب کیا تھا اور بعد میں کس نے کس طرح تحریفات اور اضافہ کیا، اس وجہ سے اہل عرب کے لئے ان کا پورا دین مشتبہ ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ کسی چیز کے متعلق یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے تھے کہ یہ اصل دین کا جزء ہے جو اللہ ﷻ کی طرف سے آیا تھا، اور یہ بدعات اور غلط رسوم و رواج ہیں جو بعد میں لوگوں میں پروان چڑھی ہیں۔ آج کے مشرکین کے بارے میں بھی اس طرح کے واقعات سننے میں آتے ہیں کہ کسی نے اپنے بچے کو دیوی کی بھینٹ چڑھا دیا۔

آیت نمبر ۱۳۸: اس آیت میں مشرکین کے باطل عقائد و نظریات کی مزید تین صورتوں کا بیان ہے۔

i۔ منت اور نذر کے مخصوص جانور یا کھیتی کی بعض پیداوار کا عام استعمال ممنوع تھا۔ ان کے استعمال کی اجازت صرف بتوں کے خادم اور مجاورین کے لئے ہوتی تھی۔

ii۔ مختلف قسم کے جانوروں کو بتوں کے نام آزاد چھوڑ دیتے اور انہیں مقدس سمجھتے ہوئے ان سے بار برداری یا سواری کا کام نہ لیتے تھے۔

iii۔ بعض جانوروں کو ذبح کرتے وقت صرف بتوں کا نام لیتے تاکہ اس بت کی نذر و نیاز میں اللہ ﷻ کی شراکت نہ ہونے پائے۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل عرب کے ہاں بعض مخصوص منتوں اور نذروں کے جانور ایسے ہوتے تھے جن پر اللہ ﷻ کا نام لینا جائز نہ سمجھا جاتا تھا۔ ان پر سوار ہو کر حج کرنا ممنوع تھا، کیونکہ حج کے لیے تلبیہ لَبَّیْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّیْكَ کہنا پڑتا تھا۔ اسی طرح ان کا دودھ دوہتے وقت، یا ان پر سوار ہونے کی حالت میں، یا ان کو ذبح کرتے ہوئے، اس چیز کا اہتمام کیا جاتا تھا کہ اللہ ﷻ کا نام زبان پر نہ آئے۔

یہ طور طریقے پر گزر اللہ ﷻ کے مقرر کردہ نہیں تھے، مگر وہ ان کو اللہ ﷻ کے مقرر کردہ سمجھ کر ان کی پیروی کرتے تھے ان طور طریقوں کے لئے ان کے پاس اللہ ﷻ کی طرف سے کوئی سند نہیں تھی بلکہ صرف یہی کہنا تھا کہ ان کے باپ دادا سے یونہی ہوتا چلا آرہا ہے۔ انہیں عنقریب سزا دیئے جانے کا ذکر ہے۔ ان کو ڈرایا گیا ہے کہ اللہ ﷻ کی پکڑ سے بچنے کا واحد راستہ صراط مستقیم پر چلنا ہے۔

آیت نمبر ۱۳۹: کفار کی ایک مروّجہ جہالت یہ بھی تھی کہ بعض جانوروں (سائبہ اور بحیرہ) کے متعلق ان کا یہ عقیدہ تھا کہ ان کے پیٹ میں (دودھ یا بچہ) جو کچھ ہے اس کا استعمال مردوں کے لئے حلال ہے اور عورتوں کے لئے حرام اور اگر اسی جانور کے شکم سے مردہ بچہ پیدا ہو تو وہ مرد و زن سب کے لئے یکساں طور پر حلال ہے۔ اللہ ﷻ فرماتا ہے کہ عنقریب انہیں ان خرافات کی سزا دی جائے گی۔

عملی بات: قرآن حکیم چونکہ نصیحت ہے اور حکیم ہے یعنی ہر بات حکمت پر مبنی ہے اب غور طلب بات یہ ہے کہ اللہ ﷻ کی طرف سے مشرکین کی ان خرافات کے بیان میں کیا حکمت و نصیحت ہو سکتی ہے سوائے اس کے کہ ہم اپنے معاشرے میں رائج خرافات کی پیروی کرنے کے بجائے کتاب و سنت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بیان کردہ معاشرت کو اپنائیں اور ان کی طرف سے واضح کردہ راستوں پر گامزن ہوں۔

آیت نمبر ۱۴۰: اللہ ﷻ کی عطا کردہ اولاد (خصوصاً بیٹیوں) کو ہلاک کرنے والے اور جانوروں کو اپنے اوپر حرام کرنے والے اللہ ﷻ کی ناشکری کے مرتکب ہیں۔ نیز ان مشرکانہ افعال کو اللہ ﷻ کی طرف منسوب کرنا اللہ ﷻ پر جھوٹ باندھنا ہے۔ ایسے لوگ گمراہ اور ہدایت سے دور ہیں۔

علمی بات: ایک حدیث کے مفہوم کے مطابق ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کے سامنے زمانہ جاہلیت میں اپنی بیٹی کو قتل کرنے کا واقعہ بیان کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا اگر میں کسی شخص کو زمانہ جاہلیت کے فعل پر سزا دیتا تو تمہیں دیتا۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قبول اسلام گناہوں کی معافی کا ذریعہ ہے کیونکہ ایسا شخص جو سابقہ گناہوں سے سچے دل سے توبہ کر کے اسلام قبول کرتا ہے۔ تو اللہ ﷻ ایسے شخص کی توبہ قبول کر کے اس کے پہلے کے تمام گناہوں کو معاف کر دیتا ہے۔

آیت نمبر ۱۴۱: نباتات اور درختوں کی مختلف اقسام کی تخلیق میں اللہ ﷻ کی قدرت کی نشانیاں ہیں۔ باغات میں پیدا ہونے والے درختوں کی دو اقسام کا ذکر ہے۔ ایک وہ ہیں جن کو سہارا دے کر چھتریوں پر چڑھایا جاتا ہے مثلاً انگور کی بیل۔ دوسرے وہ ہیں جن کو ایسے سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی مثلاً آم کا درخت۔ پھلوں میں بھی رنگا رنگی ہے اور ملتے جلتے رنگ بھی ہیں۔

علمی بات: فصل کی کٹائی کے حق سے مراد عشر ہے۔ اللہ ﷻ نے ارشاد فرمایا ہے جب فصل کی کٹائی کا دن آئے تو اس کا حق ادا کرو۔ کھیتی کاٹنے یا پھل توڑتے وقت اللہ ﷻ کا حق عشر ادا کیا جائے۔ فصل کی کٹائی کے وقت اس حق کو ادا کرنا واجب ہے اور روایت میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے رات کے وقت کھجور توڑنے اور فصل کاٹنے سے منع فرمایا ہے۔ یہ ممانعت اس لئے ہے تاکہ دن میں کٹائی کے وقت مساکین آسکیں۔ جب فصل کاٹی جائے یا کھجوریں اُتاری جائیں تو اس میں سے مساکین کو اُن کا حصّہ دیا جائے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو باغ یا کھیت بارش سے یا چشموں سے یا بارش کے جمع شدہ پانی سے سیراب کیا گیا ہو ‘اس میں عشر ہے اور جن کو کنوئیں سے پانی حاصل کر کے سراب کیا گیا ہو ‘اس میں نصف عشر ہے۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

نوٹ: کھانے پینے اور دیگر ضروریات زندگی میں فضول خرچی کی ممانعت ہے۔ اپنی ضرورت کے مطابق ہی خرچ کیا جائے۔ تاکہ اللہ ﷻ کی نعمت ضایع ہونے سے بچ سکے نیز صدقہ دیتے ہوئے یہ بھی خیال رکھا جائے کہ بندہ صدقہ دینے کے بعد خود محتاج نہ ہو جائے بلکہ اعتدال سے کام لیا جائے۔

آیت نمبر ۱۴۲: اللہ ﷻ کے خاص انعام کا ذکر ہے جو اُس نے انسانوں پر مویشیوں کے ذریعہ فرمایا ہے اول تو یہ فرمایا کہ اللہ ﷻ نے کچھ جانور ایسے پیدا فرمائے جو "حمولۃ" ہیں یعنی بار برداری کا کام کرتے ہیں اور ان کے قد بھی بڑے ہیں۔ مثلاً اونٹ اور بیل وغیرہ۔ اور دوسری قسم کے جانور وہ ہیں جن کے قد چھوٹے ہیں گویا کہ وہ زمین پر بچھے ہوئے ہیں ان پر بوجھ نہیں لادا جا سکتا جیسے کہ بھیڑ بکری اور دنبہ، ان چھوٹے قسم کے جانوروں پر سامان تو نہیں لادا جا سکتا لیکن ان کے دوسرے فائدے ہیں۔ ان کا دودھ پیا جاتا ہے گوشت کھایا جاتا ہے اور بڑے جانوروں کی نسبت ان کا گوشت عمدہ ہوتا ہے اور ان کے بالوں سے پہننے اور اوڑھنے بچھونے کے کپڑے تیار کئے جاتے ہیں۔

عملی پہلو: ذرا سوچیئے کہ اس خالق کل اور مالک مطلق نے ہم پر کیسے کیسے انعام و احسان فرمائے اور ہماری ضروریاتِ زندگی کے لئے کیسے کیسے سامان و اسباب پیدا فرمائے۔ اس نے کس طرح جانوروں میں سے کچھ کو ہماری بار برداری کیلئے اور کچھ کو ہماری دوسری ضرورتوں کے پورا کرنے میں لگا دیا۔ اور ہر ایک کے لئے اسی کے مطابق جسم، طاقت اور حفاظت کا سامان پیدا کیا اور ان طاقت ور جانوروں کو اس طرح مسخر کر دیا کہ یہ سب بلا چون وچرا کے ہماری ایسی خدمات انجام دیئے جا رہے ہیں۔ اس کے باوجود اپنے اس خالق و مالک سے منہ موڑنا کس قدر بے انصافی اور اس کی نعمتوں کی کس

قدر ناشکری ہے۔ سو یہ مختلف انواع کی نعمتیں واضح دلیل نہیں کہ انسان کو اللہ ﷻ کے سامنے جھکے اور صرف اسی کو معبود برحق مانے، اور اللہ ﷻ کی حلال کردہ چیز کو حرام یا حرام کو حلال کرنا، یا باطل معبودوں کے نام منسوب کرنا شیطان کی پیروی ہے۔

آیت نمبر ۱۴۳: وہ مویشی جو لمبے اور چھوٹے قد کے ہیں ان میں آٹھ اقسام کے جوڑوں کو بیان فرمایا ہے۔ اِن میں سے ایک اونٹ اور اونٹنی کا جوڑا ہے، دوسرا بیل اور گائے کا، تیسرا مینڈھا اور بھیڑ کا، اور چوتھا بکرے اور بکری کا جوڑا ہے۔

مشرکین عرب نے مویشیوں میں سے بحیرہ 'سائبہ 'وصیلہ اور حام بنا رکھے تھے اور عام لوگوں کے لئے ان پر سواری کرنا' بار برداری کرنا، انہیں کھانا اور ان کا دودھ پینا حرام کر دیا تھا۔ اللہ ﷻ فرماتا ہے اے رسول مکرم ﷺ! آپ ان سے پوچھیے کیا اللہ ﷻ نے ان میں سے دو نر حرام کیئے ہیں 'اگر اللہ ﷻ نے نر کی صنف حرام کر دی ہے تو پھر نر جانور کیوں کھاتے ہو اور اگر اللہ ﷻ نے مادہ کی صنف حرام کر دی ہے تو پھر مادہ جانور کیوں کھاتے ہو اور اگر اللہ ﷻ نے دونوں حرام کر دیئے ہیں تو پھر تم نر اور مادہ دونوں کیوں کھاتے ہو؟ مگر در حقیقت اللہ ﷻ نے ان میں سے کسی صنف کو حرام نہیں کیا۔ یہ حرمت کا اعتقاد محض جھوٹ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ پھر اللہ ﷻ نے مزید تاکید کے لئے فرمایا کیا تم اس وقت اللہ ﷻ کے سامنے حاضر تھے جب اللہ ﷻ نے ان جانوروں کو حرام کرنے کی وصیت فرمائی تھی؟ سو یہ محض تمہارا جھوٹ گھڑا ہوا ہے اور اگر تم سچے ہو تو بتاؤ اللہ ﷻ نے کس نبی علیہ السلام کی کتاب میں ان جانوروں کی تحریم نازل کی تھی یا کس نبی علیہ السلام پر وحی آئی تھی؟ اگر تمہارے پاس کوئی دلیل ہے تو پیش کرو 'ان آیتوں میں اظہارِ حق کے لئے علمی مباحثہ اور مناظرہ کرنے کے جواز پر دلیل بھی ہے اور قیاس کے اصل کا ثبوت بھی ہے کہ اگر اللہ ﷻ نے مذکر کو حرام کیا ہے تو ہر مذکر حرام ہے اور اگر مؤنث کو حرام کیا ہے تو ہر مؤنث حرام ہے۔

آیت نمبر ۱۴۴: اللہ ﷻ نے اونٹ اور گائے کے نر اور مادہ میں سے کسی کی حرمت بیان نہیں کی۔ اسی طرح مادہ کے پیٹ سے پیدا ہونے والے بچے کی حرمت کی نفی فرمائی ہے۔ مشرکین سے از خود بعض جانوروں کو حرام کر دینے کی دلیل پیش کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ دلیل کے بغیر حلال و حرام کے قانون کی کوئی حیثیت نہیں اور نہ ہی ان مشرکین کے پاس خود ساختہ حرمت کی کوئی دلیل ہے۔ ان مشرکانہ افعال کو اللہ ﷻ سے منسوب کرنا در حقیقت لوگوں کو بغیر علم گمراہ کرنے کے مترادف ہے۔ بہتان تراشی کرنے والے ظالموں کو کبھی ہدایت نصیب نہ ہو گی۔

نوٹ: ایک حدیث قدسی میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اللہ ﷻ فرماتا ہے، میں نے اپنے بندوں کو دین حنیف پر پیدا کیا، لیکن شیطانوں نے انہیں بہکایا اور ان پر ان چیزوں کو حرام کر دیا جن کو میں نے حلال کیا تھا اور انھیں حکم دیا کہ وہ میرے ساتھ ان کو شریک ٹھہرائیں جن کے شریک ٹھہرانے کی میں نے ہرگز کوئی سند نازل نہیں کی۔" (صحیح مسلم)

آیت نمبر ۱۴۵: چار چیزوں کی حرمت کا بیان ہے۔

۱۔ مردار یعنی وہ حلال جانور جو ذبح کئے بغیر طبعی موت مرا ہو۔

۲۔ بہتا ہوا خون یعنی ذبح کرتے وقت جانور کی رگوں سے نکلنے والا خون۔

۳۔ خنزیر کا گوشت۔ جس کے جسم کا کوئی حصہ حلال نہیں۔

۴۔ وہ ذبیحہ جس پر اللہ ﷻ کے سوا کسی دوسرے کا نام پکارا گیا ہو۔

مگر دو شرائط کے ساتھ ان اشیا میں سے کوئی چیز کھا کر جان بچائی جا سکتی ہے جس پر مواخذہ نہیں، ۱۔ نہ کھانے کی صورت میں ہلاکت کا ڈر ہو۔

۲۔ زیادتی نہ کرے، صرف اتنا کھائے جس سے جان بچ سکے اس سے زائد کھانے کی اجازت نہ ہو گی۔

علمی بات: یہاں ایک چیز وضاحت طلب ہے وہ یہ کہ ظاہر آیت سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ ﷻ نے صرف ان چار چیزوں کو حرام فرمایا ہے۔ ان کے علاوہ اور کوئی چیز حرام نہیں۔ حالانکہ ان کے علاوہ بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو حرام ہیں مثلاً شراب، درندے وغیرہ۔ اس ضمن میں مفسرین کرام نے بڑی طویل ابحاث ذکر کی ہیں۔ ان کا حاصل یہ ہے کہ یہ آیت اکثر مفسرین کے نزدیک مکی ہے اور دوسری اشیاء کی حرمت مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی۔ تو اس آیت کا مطلب یہ ہوا کہ اس وقت تک جو وحی نازل ہوئی۔ اس میں صرف ان چار چیزوں کی حرمت کا حکم دیا گیا ہے۔ اور اس کے بعد وحی کا سلسلہ جاری

رہا اور مختلف اوقات میں حکم الٰہی سے اور چیزیں حرام ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ حضور ﷺ نے کچل کے دانت سے چیر کر کھانے والے ہر شکاری جانور اور پنجوں سے نوچ کر کھانے والے شکاری پرندے کو حرام کر دیا۔ (صحیح مسلم)

نوٹ: سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ زمانۂ جاہلیت کے لوگ کچھ چیزیں تو کھا لیتے تھے اور کچھ سے نفرت کرتے ہوئے نہیں کھاتے تھے تو اللہ ﷻ نے اپنے نبی علیہ السلام کو بھیجا، اپنی کتاب کو نازل فرمایا اور حلال کو حلال اور حرام کو حرام قرار دے دیا، پس جسے اللہ ﷻ نے حلال قرار دیا وہی حلال ہے اور جسے اس نے حرام قرار دیا وہ حرام ہے اور جس سے اس نے سکوت فرمایا وہ قابل معافی ہے۔ پھر انہوں نے یہ آیت کریمہ پڑھی " قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗٓ " (مستدرک حاکم، ابو داؤد)

آیت نمبر ۱۴۶: یہودیوں پر بعض حلال اشیا کو وقتی طور پر حرام کر دینے کا بیان ہے۔

i۔ ہر ناخن والا جانور سے مراد جس کے پاؤں پنجے کی شکل میں ہوں اور الگ الگ نہ ہوں (اُونٹ، شتر مرغ، بطخ وغیرہ) کا کھانا ان پر حرام تھا۔

ii۔ گائے، بیل، بھیڑ، بکری کی پشتوں، آنتوں اور ہڈیوں کے ساتھ لگی ہوئی چربی کے علاوہ باقی ساری چربی اُن پر حرام تھی۔

اللہ ﷻ نے ان جانوروں کو بنی اسرائیل پر ان کی سرکشی کی وجہ سے بطور سزا حرام کیا تھا۔ کیونکہ وہ انبیاء کرام علیہم السلام کو ناحق قتل کرتے تھے اور لوگوں کو اللہ ﷻ کے راستے سے روکتے تھے اور سود یا سود کھاتے تھے اور دیگر ناجائز اور حرام طریقوں سے لوگوں کا مال کھاتے تھے ' اور یہ اس لئے ذکر فرمایا ہے کہ یہود یہ کہتے تھے کہ اللہ ﷻ نے ان پر کسی چیز کو حرام نہیں کیا ماسوا اس کے جس کو حضرت یعقوب علیہ السلام نے خود اپنے نفس پر حرام کیا تھا ' اور چونکہ اللہ ﷻ نے یہ ماضی کی خبر دی تھی جس کا کسی کو علم نہیں تھا ' اس لئے اللہ ﷻ نے فرمایا بے شک ہم اس خبر میں ضرور سچے ہیں اور یہ سیدنا محمد ﷺ کی نبوت کی دلیل ہے کہ آپ ﷺ نے یہود کو ماضی کی ایسی بات کی خبر دی جس کا کسی کو علم نہیں تھا اور جس کو جاننے کے لئے وحی کے سوا اور کوئی ذریعہ نہیں تھا۔

آیت نمبر ۱۴۷: اللہ ﷻ کی صفت "رحمت" کا ذکر ہے۔ یہ بھی اللہ ﷻ کی رحمت ہے کہ مجرمین کا مواخذہ فوری نہیں کیا جاتا بلکہ توبہ اور حق قبول کرنے کی مہلت دی جاتی ہے۔ البتہ مہلت کے باوجود حق کا انکار کرنے والے اللہ ﷻ کی گرفت سے بچ نہیں سکتے۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "پس اگر کافر کو وہ تمام رحمت معلوم ہو جائے جو اللہ ﷻ کے پاس ہے تو وہ جنت سے ناامید نہ ہو اور اگر مومن کو وہ تمام عذاب معلوم ہو جائیں جو اللہ ﷻ کے پاس ہیں تو وہ جہنم سے کبھی بے خوف نہ ہو۔" (صحیح بخاری)

آیت نمبر ۱۴۸: مشرکین کے بارے میں ذکر ہے کہ وہ مشرکین یوں کہیں گے کہ اگر اللہ ﷻ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا۔ اور نہ ہی ہم از خود کسی چیز کو حرام ٹھہراتے۔ یعنی اپنی کٹ حجتی کے لئے ایسے لوگ تقدیر کا سہارا لیتے ہیں اور مجرموں کا ہمیشہ یہی وطیرہ رہا ہے۔ حالانکہ مشیت اور رضا الگ الگ چیز ہے بہر حال یہ لوگ اسی کے مکلف ہیں کہ اچھائیاں کریں اور برائیوں سے رکیں۔ ورنہ مشیت کو بطورِ بہانہ ہر مجرم اور ہر گناہ گار پیش کر سکتا ہے۔ بہر کیف اس ارشاد سے مشرکین کے آخری اعتراض کو نقل کر کے اس کا رد فرمایا گیا ہے کہ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ اگر ہم نے شرک کا ارتکاب کیا اور اللہ ﷻ کی مرضی کے خلاف کسی چیز کو حرام قرار دے دیا تو اللہ ﷻ نے ہمیں اس نافرمانی سے روکا کیوں نہیں؟ سو ان لوگوں کا یہ اعتراض ایک بالکل احمقانہ ہے۔ انسانوں کو کسی قول یا فعل کی آزادی ملنا اس بات کی دلیل نہیں بن سکتا کہ وہ اللہ ﷻ کے یہاں صحیح ہے ورنہ ہر مجرم اس بہانے کا سہارا لے سکتا ہے۔ چنانچہ ہر انسان کو اس دنیا میں آزادی اور اختیار سے نوازا گیا ہے اور اسی میں اس کا امتحان ہے۔ اور یہی حکمت کا تقاضا بھی ہے ورنہ کل قیامت کے دن انسان مجبور محض ہونے کو بہانہ بناتا کہ اُسے تو کوئی آزادی اور کسی قسم کا اختیار حاصل نہ تھا۔

عملی پہلو: اللہ ﷻ نے انسانوں کو دنیا میں آزمائش اور امتحان کے لئے بھیجا اور امتحان اسی صورت میں ہو سکتا ہے جبکہ مکلفین کو احکام الٰہی اور اوامر و نواہی بتا کر ان کو عمل کرنے میں اختیار بھی دیا جائے اگر انسان کو مجبور کر دیا جاتا کہ فلاں عمل ضرور ہی کرے تو اس کی آزمائش اور امتحان کیسے ہوتا؟

علمی بات: اللہ ﷻ کی حکمت کا تقاضا ہے کہ اس نے انسان کو عقل اور فہم اور عمل کی قوت دی اور کرنے نہ کرنے کا اختیار بھی دے دیا۔ اب جو شخص شرک اختیار کرتا ہے اور از خود کسی شے کو حلال یا حرام کرتا ہے تو اپنے اس اختیار کی وجہ سے اس کا مؤاخذہ ہو گا۔ یہ سب کچھ تو اللہ ﷻ کی مشیت و ارادہ سے ہوتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسان کے قول و فعل سے اللہ ﷻ راضی بھی ہے۔ اللہ ﷻ ان اعمال سے راضی ہے جن کے بارے میں اپنی کتابوں اور رسولوں کے ذریعہ صاف صاف بتا دیا کہ یہ عقائد اور اعمال میری رضا کے ہیں اور غلط عقائد اور ممنوع افعال سے وہ راضی نہیں ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں دوسرے مقام پر اللہ ﷻ نے صراحۃ ارشاد فرمایا کہ "اگر تم ناشکری کرو گے تو بے شک اللہ تم سے بے نیاز ہے اور وہ اپنے بندوں کے لئے ناشکری پسند نہیں کرتا اور اگر تم شکر کرو (تو) تمہارے لئے اسے پسند فرماتا ہے اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے (کے گناہوں) کا بوجھ نہیں اٹھائے گا پھر تمہیں اپنے رب ہی کی طرف واپس جانا ہے تو وہ تمہیں بتا دے گا جو کچھ تم کیا کرتے تھے بے شک وہ سینوں کے رازوں کو بھی خوب جاننے والا ہے"۔ اور کفر و شکر دونوں کے اسباب مہیا کر دینا فقط اس واسطے ہے کہ جانچنے اور امتحان سے گزارے جانے کی تکمیل ہو چنانچہ روزِ آخرت انہی اسباب کو اختیار کرنے کا سوال اور انہی پر نتیجہ مرتب ہو گا۔

آیت نمبر ۱۴۹: مشرکین کے جرائم کو بے نقاب کر کے اللہ ﷻ نے حجت پوری فرما دی۔ اللہ ﷻ چاہے تو سب کو ہدایت دے لیکن جبری ہدایت دینا اللہ ﷻ کی حکمت کے خلاف ہے۔

جبریہ کا رد اور ابطال: ایسی دلیل جو تمام شکوک و شبہات کو جڑ سے اکھاڑ دے 'صرف اللہ ﷻ ہی کے پاس ہے۔ اس آیت میں یہ تنبیہ ہے کہ اللہ ﷻ واحد ہے 'اس نے رسولوں کو دلائل اور معجزات دے کر بھیجا اور ہر مکلف پر اپنے احکام کو لازم کیا ہے اللہ ﷻ نے ان کو کوئی بھی کام کرنے یا نہ کرنے کا اختیار دیا ہے اور اللہ ﷻ کی حکمت یہی ہے کہ بندے اپنے اختیار سے اس پر ایمان لائیں اور اس کے احکام کی تعمیل کریں 'ورنہ اگر وہ چاہتا تو جبراً سب انسانوں کو مومن بنا دیتا 'لیکن یہ اللہ ﷻ کی حکمت کے خلاف ہے۔ اس لئے ان کا یہ کہنا بالکل لغو بات ہے کہ اگر اللہ ﷻ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے، نہ ہمارے باپ دادا 'نہ ہم جانوروں کو حرام قرار دیتے 'کیونکہ اس قسم کا ایمان اللہ ﷻ کا مطلوب نہیں ہے۔ اللہ ﷻ یہ چاہتا ہے کہ لوگ اپنی عقل سے کام لیں 'حق اور باطل کو جانچیں اور اپنے اختیار سے ایمان قبول کریں۔ انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات اور شیطانی وسوسوں میں فرق محسوس کریں اور اپنے اختیار سے برے کاموں اور بری باتوں کو ترک کریں اور شیطان کا انکار کر کے اللہ ﷻ پر ایمان لانے کو اختیار کریں 'ان آیتوں میں یہ دلیل بھی ہے کہ اللہ ﷻ نے انسان کو مجبور محض نہیں بنایا بلکہ عمل کا اختیار اور موقع دیا گیا ہے۔

نوٹ: مشرکین کی اس کٹ حجتی کے مقابلے میں حقیقت تک پہنچی ہوئی حجت صرف اللہ ﷻ کی ہے۔ اس نے ہر طرح سے ان پر اتمام حجت کر دی ہے 'ان کی ہر نامعقول بات کو معقول طریقے سے رد کر دیا ہے 'مختلف انداز سے انہیں ہر بات سمجھا دی ہے۔

آیت نمبر ۱۵۰: اہل ایمان کو مشرکین کی خوشنما باتوں سے متاثر نہ ہونے کی تلقین کی گئی ہے۔ بتایا گیا ہے کہ اگر یہ مشرکین گواہی کی اہمیت اور ذمہ داری سمجھتے تو اس بات کی شہادت دیتے جس کا انہیں قطعی طور پر علم ہوتا لیکن اگر یہ لوگ شہادت کی اہمیت اور ذمہ داری کو خاطر میں لائے بغیر اتنی ڈھٹائی پر اتر آئیں کہ اللہ ﷻ کا نام لے کر جھوٹی شہادت دینے میں بھی تامل نہ کریں، تو ان کے اس جھوٹ میں تم ان کے ساتھی نہ بننا۔ اس سے شہادت کی غرض صرف اتنی ہے کہ ان میں سے جن لوگوں کے اندر کچھ بھی راست بازی موجود ہے ان سے جب کہا جائے گا کہ کیا واقعی تم سچائی کے ساتھ اس بات کی شہادت دے سکتے ہو کہ یہ قواعد و ضوابط اللہ ﷻ ہی کے مقرر کردہ ہیں تو وہ اُن رسوم و رواج کی حقیقت پر غور کریں گے اور جب ان کا اللہ ﷻ کی طرف سے ہونے کا کوئی ثبوت نہ پائیں گے تو ان فضول رسموں پر عمل درآمد سے باز آجائیں گے۔

علمی بات: مشرکین سے شہادت طلب کیئے جانے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ان کے عقل و فہم رکھنے والے طبقہ پر ان کی جاہلانہ رسموں کی حقیقت آشکارا کی جائے۔ کیونکہ جب ان سے ان رسول ﷺ کی صداقت کے لئے شہادت طلب کی جائے گی تو شہادت دینے سے پہلے احساس ذمہ داری کی وجہ سے وہ ان

باطل امور میں بڑی سنجیدگی سے غور فکر کریں گے۔ جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ان پر رسوم ورواج کی بے ہودگی آشکارا ہو جائے گی اور وہ ان سے خود بخود باز آجائیں گے۔ لیکن اگر وہ شرافت ودیانت کو پس پشت ڈال کر اُن لغو اور باطل رسومات پر جان بوجھ کر جھوٹی شہادت دینے پر تلے ہوئے ہیں تو ان کی شہادت آپ کے لئے حجت نہیں۔ اس طرح آپ ﷺ کے ذریعہ امت کو حق کا انکار کرنے والے، منکرین قیامت اور مشرکوں کی اتباع کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔

آیت نمبر ۱۵۱: اس آیت میں پانچ باتوں کا حکم ہے: ۱۔ اللہ ﷻ کی ذات، صفات وعبادات واستعانت میں کسی اور کو اللہ ﷻ کے ساتھ شریک کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ حدیث مبارک کے مطابق سات ہلاک کرنے والے گناہوں میں سے شرک پہلے نمبر پر ہے۔ (صحیح بخاری)

۲۔ اللہ ﷻ کی توحید اور اطاعت کے بعد والدین کے ساتھ حسن سلوک اور احسان کا حکم ہے۔ والدین کے حقوق کے حوالے سے قرآنِ حکیم کا یہ تیسرا مقام ہے۔ حدیث مبارک کے مطابق والدین کی نافرمانی بڑے بڑے گناہوں میں شامل ہے۔ (صحیح بخاری)

۳۔ مفلسی کے ڈر سے اپنی اولاد کو قتل کرنے کی ممانعت ہے۔ اولاد کا قتل صرف اللہ ﷻ پر عدم توکل اور عدم اعتماد کی دلیل نہیں بلکہ اس کی صفت "رزاق" کا انکار ہے۔ حدیث کی رو سے بڑے بڑے گناہوں میں اولاد کا قتل بھی شامل ہے۔ (صحیح بخاری)

۴۔ ظاہری اور پوشیدہ بے حیائی سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یعنی ایسے وسائل اختیار کرنے کی ممانعت کی گئی ہے جو بے حیائی کے کاموں کے قریب لے جائیں۔ مثلاً بے حیائی پر مبنی میگزین، ڈرامے فلمیں اور نامحرم سے بے جا گفتگو وغیرہ۔

۵۔ کسی جان کو ناحق قتل کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ قرآنِ حکیم کی رو سے درج ذیل تین صورتوں میں قتل کرنا جائز ہے۔

۱۔ قتلِ عمد کے قصاص کی صورت میں۔ ۲۔ میدان جنگ میں کفار کا قتل۔

۳۔ اسلامی مملکت میں بدامنی پھیلانے اور اسلامی حکومت سے بغاوت کرنے والے کا قتل۔

سنت کی رو سے مزید قتل کرنے کی صورتیں:

۱۔ وہ شادی شدہ جو زنا کرے۔ ۲۔ جو اسلام سے مرتد ہو جائے۔ ۳۔ کسی رسول علیہ السلام کی شان میں گستاخی کرنے والا۔

البتہ اس سزا کا نفاذ حکومت کی ذمہ داری ہے عام لوگوں کو اس کی اجازت نہیں۔

نوٹ: یہ آیات رسول اللہ ﷺ کا وصیت نامہ ہیں۔ تفسیر ابن کثیر میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کا ایسا وصیت نامہ دیکھنا چاہے جس پر آپ ﷺ کی مہر لگی ہو تو وہ ان آیات کو پڑھ لے، ان میں وہ وصیت موجود ہے جو رسول اللہ ﷺ نے بحکم خداوندی اُمّت کو دی ہے۔

علمی بات: حاکم نے بروایت حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو خطاب کر کے فرمایا: "کون ہے جو مجھ سے تین آیتوں پر بیعت کرے"۔ پھر یہی تین آیتیں تلاوت فرما کر ارشاد فرمایا کہ: "جو شخص اس بیعت کو پورا کرے گا تو اس کا اجر اللہ ﷻ کے ذمہ ہو گیا"۔

عملی پہلو: فواحش ان اعمال اور اقوال کو کہتے ہیں جو حد درجہ قبیح ہوں۔ (مفردات) یہاں کسی ایک برائی سے منع نہیں کیا گیا بلکہ فواحش جمع کا لفظ ذکر کر کے ہر قسم کی قولی اور فعلی برائیوں کے ارتکاب سے ہی نہیں بلکہ ان کے قریب تک پھٹکنے سے بھی منع کر دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ تمام وہ چیزیں جو دل میں گناہوں کی تحریک پیدا کرتی ہیں مثلاً فحش گانے، عریاں تصویریں اور غلیظ لٹریچر، ناجائز تعلقات سب سے دور رہنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ اور مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ کے کلمات سے اس حکم کو اور وسیع کر دیا کہ فواحش کا ارتکاب ظاہر اور باطن، جلوت اور خلوت ہر حالت میں ممنوع ہے۔

آیت نمبر ۱۵۲: معاشرتی احکامات کے ضمن میں مزید چار احکامات دیئے گئے ہیں۔

۱۔ کسی یتیم کی کفالت کی ذمہ داری پر، اس کی خیر خواہی کرنے کا حکم اور اس کے مال میں ناجائز تصرف کی ممانعت کی گئی ہے۔ مال کی اس وقت تک حفاظت کی جائے جب تک یتیم شعور کی عمر تک نہ پہنچ جائے۔ حدیث مبارک کے مطابق یتیم کا مال کھانا سات بڑے گناہوں میں شامل ہے۔ (صحیح بخاری)

۲۔ ناپ اور تول کو عدل کے ساتھ پورا کیا جائے تاہم بغیر ارادے کے کمی بیشی ہونے پر گرفت نہیں۔ نیز اس بات کی نفی کی گئی ہے اللہ ﷻ کسی کو اس کی طاقت سے بڑھ کر پابند و مکلف نہیں کرتا۔

۳۔ ناانصافی کی ممانعت کی گئی ہے۔ 'قول'' سے مراد فیصلہ بھی ہے اور شہادت بھی۔ کسی معاملے میں ثالث مقرر کیئے جانے پر حق اور انصاف پر مبنی بات پر فیصلہ کرنا چاہیئے۔ شہادت درکار ہونے پر ہمیشہ عدل کی بات کی جائے اور جانبداری نہ برتی جائے چاہے وہ قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔

۴۔ عہد کی خلاف ورزی کی ممانعت کی گئی ہے۔ عہد سے مراد ''عہد الست'' یعنی اللہ ﷻ کے رب ہونے کا اقرار (سورۃ الاعراف ۷، آیت: ۱۷۲) اور اسی طرح روزمرہ کے معمولات میں بندوں کا آپس میں کیئے گئے وعدوں کو پورا کرنا بھی شامل ہے۔

آیت نمبر ۱۵۳: ''صراط مستقیم'' سے مراد وہ راستہ جو اللہ ﷻ کی طرف لے جاتا ہے۔ اس سے مراد اللہ ﷻ کے احکامات پر عمل کرنا ہے جس سے انسان اللہ ﷻ کی رضا اور جنت کی نعمتیں حاصل کر سکتا ہے۔

نوٹ: ۱۔ حدیث مبارکہ میں ہے کہ ''قرآن حکیم میں سیدھا راستہ ہے'' (ترمذی) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے کہ رسول ﷺ کے اخلاق تو قرآن حکیم ہیں۔ (مسند احمد) گویا قرآن حکیم اور نبی کریم ﷺ کی اتباع صراط مستقیم ہے۔

۲۔ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے ایک سیدھی لکیر کھینچی۔ پھر اس کے دائیں بائیں بہت سی لکیریں کھینچیں اور فرمایا: یہ سیدھی لکیر اللہ ﷻ کی راہ ہے اور باقی لکیریں شیطان کی راہیں ہیں۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی۔ (سنن نسائی)

علمی بات: قرآنِ حکیم نازل کرنے اور رسول کریم ﷺ کے بھیجنے کا منشاء تو یہ ہے کہ لوگ اپنے طرزِ معاشرت اور طرزِ معیشت کو کو قرآن و سنت کے تابع کریں، اور اپنی زندگیوں کو قرآن و سنّت کے سانچہ میں ڈھالیں، لیکن ہو یہ رہا ہے کہ بعض لوگ جانے یا انجانے طور پر قرآن و سنت کو اپنے خیالات اور تجاویز کے تحت ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں کہ، جو آیت یا حدیث اپنے مطلب کے خلاف نظر آئی اس میں تاویل کر کے اپنی خواہش کے مطابق بنالی، اسی سے فتنے اور گمراہی کے راستے نکلتے ہیں، جو چیزیں بدعات اور شکوک و شبہات پیدا کرتی ہیں ان سے بچنے کے لئے اس آیت میں ہدایت کی گئی ہے۔

آیت نمبر ۱۵۴: مشرکین مکہ کے لئے رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی دلیل کے طور پر ذکر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات عطا کی گئی تھی۔ نبوت کا یہ سلسلہ ماضی میں بھی موجود تھا۔ تورات کا نزول اللہ ﷻ کی طرف سے اتمام نعمت تھا۔ وہ اپنے دور کی ایک جامع کتاب تھی جو ہدایت و رحمت کا باعث تھی۔ تورات کی تعلیمات کا بھی ایک مقصد آخرت پر ایمان رکھنے کی تعلیم دینا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے نزدیک سورۃ بنی اسرائیل کے تیسرے اور چوتھے رکوع میں جو احکام ہیں وہ تورات کے احکام عشر (Ten Commandments) کا ہی خلاصہ ہے۔

عملی پہلو: رب کی ملاقات پر ایمان لانے سے مراد اپنے آپ کو اللہ ﷻ کے سامنے جواب دہ سمجھنا اور اطاعت والی زندگی بسر کرنا ہے۔ یہاں اس ارشاد کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ خود بنی اسرائیل میں اس کتاب کی حکیمانہ تعلیمات سے ذمہ داری کا احساس بیدار ہو جائے۔ دوسرے یہ کہ عام لوگوں میں اس معیاری نظام زندگی کا مطالعہ کر کے اور نیکوکار انسانوں میں اس نعمت ہدایت کے اثرات دیکھ کر یہ شعور بیدار ہو جائے کہ آخرت کے انکار و سرکشی کے ساتھ گزاری جانے والی زندگی کے مقابلے میں وہ زندگی ہر اعتبار سے بہتر ہے جو اللہ ﷻ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت میں بسر کی جائے اور اس طرح مشاہدہ اور غور و فکر انہیں انکارِ آخرت سے کھینچ کر ایمان کی طرف لے آئے گا۔

آیت نمبر ۱۵۵: ارشاد ہوا ہے کہ یہ قرآنِ حکیم جس کو ہم نے اپنے نبی محمد ﷺ پر نازل کیا ہے 'یہ برکت والی کتاب ہے۔ تم اس کی پیروی کرو 'یعنی اس کتاب کو اپنا امام بنالو اور اس میں جو عقائد مذکور ہیں ان کو مانو 'اور جو احکام مذکور ہیں ان پر عمل کرو 'اور ڈرتے رہو 'یعنی اپنے دلوں میں اللہ ﷻ سے ڈرو اور اس کے خلاف عمل نہ کرو اور اس کی حدود سے تجاوز نہ کرو اور اس کی حرام کردہ چیزوں کو حلال نہ کرو۔

علمی بات: قرآن حکیم کے اتارے جانے کا اصل مقصد اسکی اتباع و پیروی ہے۔ پس تم لوگ اس کی مقدس تعلیمات کو اپناؤ اور ان ہی کے مطابق اپنا عقیدہ بھی بناؤ اور عمل بھی سنوارو۔ اور اس راہ راست پر چلو جو اس کتاب مبارک نے اپنی حکمتوں بھری تعلیمات کے ذریعے تمہیں دکھائی ہے کہ یہی اس کتاب حکیم کے اتارنے کا مقصد ہے اور اسی میں تمہارا بھلا اور فائدہ ہے۔ اسی میں تمہاری اس فانی زندگی کا میابی کا راز مضمر ہے اور آخرت کی حقیقی و ابدی زندگی کا بھی۔ سو اس برکتوں بھری اور عظیم الشان کتاب کی عظمتوں اور برکتوں کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو صدق دل سے اپنایا جائے اور اس کی تعلیمات مقدسہ کی پیروی کی جائے تاکہ اس کے اتارنے والے رب ذوالجلال کی رحمت سے سرفرازی نصیب ہو اور اس کے غضب سے بچا جا سکے۔

آیت نمبر ۱۵۶: اللہ ﷻ نے فرمایا کہ ہم نے یہ کتاب نازل کی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ تم یوں نہ کہنے لگو کہ ہم سے پہلے دو جماعتوں پر کتاب نازل ہوئی تھی (یعنی یہود و نصاریٰ پر) اور ہم ان کے پڑھنے پڑھانے سے غافل تھے، کیونکہ وہ ہماری زبان میں نہ تھی لہٰذا ہم اس سے استفادہ نہیں کر سکتے تھے اللہ ﷻ نے قرآنِ حکیم نازل فرما کر اس عذر کو ختم کر دیا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ تم یوں کہتے کہ ہمیں کتاب نہیں دی گئی اگر ہم پر کتاب نازل ہوتی تو ہم خوب اچھی طرح عمل کرتے اور ہم سے پہلے جن لوگوں کو کتاب دی گئی عمل کرنے میں ان سے سبقت کر جاتے۔ اور ان کے مقابلہ میں زیادہ ہدایت یافتہ ہوتے۔

آیت نمبر ۱۵۷: اللہ ﷻ نے قرآن حکیم نازل فرما کر مشرکین پر حجت تمام کر دی کہ وہ یہ عذر پیش نہ کر سکیں کہ اگر ان پر کتاب کا نزول ہوتا تو وہ مسابقت میں یہود و نصاری سے زیادہ ہدایت یافتہ ہوتے۔ قرآنِ حکیم ہدایت و رحمت کا منبع ہے۔ قرآنِ حکیم سے اعراض برتنے پر بُرے عذاب کا بدلہ دیا جائے گا۔

علمی بات: اگر قرآن حکیم مشرکینِ مکہ کی طرف نازل نہ کیا جاتا تو وہ بہت شور مچاتے اور کہتے جس طرح یہود و نصاریٰ کو کتابیں دی گئیں اسی طرح اگر ہمیں بھی کوئی کتاب دی جاتی تو دنیا دیکھتی کہ ہم اس کو کس طرح سینہ سے لگاتے۔ کس طرح اس کی ہدایت کے مطابق عمل کرتے۔ ان سے کہا جا رہا ہے کہ لو اب وہ کتاب آگئی ہے جو روشن دلائل پر مشتمل ہے۔ جو سراپا ہدایت ہے۔ اب اس پر عمل کر کے دکھاؤ۔ آیات قرآنی سے اعراض کرنے والے مشرکین کو بڑے عذاب کی وعید سنائی گئی ہے۔

علمی بات: روشن دلیل سے مراد قرآن مجید ہے، جو صرف ہدایت اور رحمت ہی نہیں بلکہ اپنے سچے ہونے کی واضح اور روشن دلیل بھی ہے اور اللہ ﷻ نے قرآن حکیم کو رہتی دنیا تک تمام انسانیت کے لئے رہبر و رہنما بنا کر نازل فرمایا ہے اور جو صرف عربوں کے لیے ہی نہیں بلکہ تمام اقوام کے لیے ہے اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ قرآنِ حکیم تو عربی زبان میں نازل ہوا ہے چنانچہ اہل عرب پر تو حجت تمام ہو گئی لیکن عجم یعنی غیر عرب اس سے کس طرح استفادہ کر سکتے ہیں تو اس کا جواب انتہائی آسان ہے کہ اللہ ﷻ کے فضل و کرم سے ہر زبان بولنے والوں میں کچھ اہل علم اور علمائے کرام ہوتے ہیں جو اپنی اپنی زبانوں میں اس عالمگیر پیغام کا ترجمہ و تشریح کر کے لوگوں تک ان کے رب کی طرف سے نازل کردہ احکامات سہل انداز میں پہنچا کر تبلیغ کا فریضہ سرانجام دے رہے ہوتے ہیں لہٰذا اقوام عالم پر لازم ہے کہ اس کے احکام کو سیکھیں۔ قرآن مجید پڑھیں اور پڑھائیں دنیا جہاں کے تمام انسان خواہ کسی زبان و قوم سے تعلق رکھتے ہوں ان پر قرآن حکیم کے ذریعے دنیا و آخرت میں کامیابی کے لئے رہنمائی حاصل کرنا لازم بھی ہے اور ان کی ضرورت بھی اور یہ کچھ مشکل و عجب نہیں کیونکہ جب خود اللہ ﷻ جس نے اس ہدایت کے مجموعہ کو اپنے محبوب ﷺ کے ذریعے ہم تک پہنچایا واضح طور پر فرماتا ہے "ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان فرما دیا ہے۔

آیت نمبر ۱۵۸: اتمام حجت قائم ہونے کے بعد بھی مشرکین مکہ گمراہی سے باز نہ آئے۔ گویا وہ اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ اُن کے پاس فرشتے آئیں یا آپ ﷺ کا ربّ اُن کے پاس آئے یا قیامت کی بڑی نشانی (جیسے سورج کا مغرب سے طلوع ہونے) کا وقوع ہو، اللہ ﷻ نے اُنہیں خبردار فرمایا ہے۔ بڑی نشانی آنے کے بعد توبہ کا دروازہ بند ہو جائے گا تو اس وقت کافر اپنے کفر اور فاسق اپنے فسق سے توبہ کرے گا تو اس کی توبہ قبول نہ ہو گی کیونکہ حقیقتِ حال کا مشاہدہ ہونے پر کافر اپنے کفر یا فاسق اپنے فسق سے توبہ پر آمادہ ہو ہی جائے گا لہٰذا بعد از مشاہدہ ایمان اور توبہ قابلِ قبول نہیں ہے۔ کیونکہ ایمان کی شرط ہی بنا دیکھے اقرار اور قولِ رسول کی تصدیق ہے۔

آیت نمبر ۱۵۹: "شیعا" سے مراد فرقے اور گروہ ہیں۔ اس آیت میں ہر وہ گروہ مراد ہے جو دین اسلام اور رسول ﷺ کے راستے کو چھوڑ کر دوسرے دین یا طریقے اختیار کرے۔ سیدھے راستے سے منحرف ہونے والوں کا معاملہ اللہ ﷻ کے حوالے ہے اور وہی انہیں ان کے اعمال کی سزا دے گا۔

علمی بات: آپس میں مختلف گروہ بننے سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی غرض و خواہش کی وجہ سے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور وہ مختلف گروہوں میں بٹ گئے یعنی دین کے اصول و مبادی میں اختلاف کر کے۔ پس حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ائمہ کرام کا اختلاف اس میں داخل نہیں کہ وہ اختلاف اصولی اور بنیادی نہیں بلکہ فروعی (یعنی ضمنی) ہے۔ اور ان فرقوں میں یہود و نصاریٰ اور اسلام کے دعویدار وہ سب فرقے داخل ہیں جو اہل حق سے بنیادی اختلافات رکھتے ہیں۔ جیسے خوارج اور منکرین حدیث وغیرہ۔ بہر کیف اس بارے میں نبی کریم ﷺ کو ہدایت فرمائی گئی کہ جو لوگ اپنے دین کو ٹکڑوں میں بانٹ کر خود مختلف فرقوں میں بٹ گئے ان سے آپ ﷺ کو کوئی سروکار نہیں۔ آپ ﷺ کا کام تو تبلیغ حق ہے اور بس۔ جو کہ آپ کر چکے۔ اب ان لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیجئے اور ان کا معاملہ اللہ ﷻ کے حوالے کر دیجئے۔ وہی ان سے حساب لے گا اور حق و انصاف کے تمام تقاضوں کو پورے کرنے کے بعد اُن کو سزا دے گا سو ایسے ہٹ دھرموں سے منہ موڑ لیجئے۔

فرقہ بندی کی مذمت: اس آیت کی تفسیر کے حوالے سے مفسرین کا ایک قول یہ ہے کہ اس سے مشرکین کے فرقے مراد ہیں۔ بعض مشرکین فرشتوں کو اللہ ﷻ کی بیٹیاں کہتے تھے، بعض مشرکین بتوں کو اللہ ﷻ کا شریک کہتے تھے اور بعض مشرکین ستاروں کو۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد یہود اور نصاریٰ ہیں۔ حضرت محمد ﷺ کی بعثت سے پہلے وہ ایک دوسرے سے اختلاف کرتے تھے اور بعد میں مختلف فرقوں میں بٹ گئے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ بعض لوگ قرآنِ حکیم کی بعض آیتوں کو مانتے تھے اور بعض کا انکار کرتے تھے اور چوتھا قول یہ ہے کہ اس سے مراد اس امت کے بدعتی اور گمراہ فرقے ہیں۔

آیت نمبر ۱۶۰: اس آیت میں قیامت کے دن اللہ ﷻ کے عدل و انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ نیکی کرنے کے بعد اس نیکی کو محفوظ رکھتے ہوئے اللہ ﷻ کی بارگاہ میں حاضر ہونے والے کے لئے بشارت دی گئی ہے۔ نیز بتایا گیا ہے کہ ہر نیکی کا اجر دس گنا بڑھا کر دیا جائے گا اور یہ کم سے کم اجر ہے۔ اس کے برعکس برائی کرنے والے کو برائی کے برابر ہی سزا دی جائے گی۔

سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اللہ ﷻ فرماتا ہے، بے شک تمھارا رب رحم فرمانے والا ہے، جو شخص نیکی کا ارادہ کرے اور اسے عملی جامہ نہ پہنا سکے تو اس کے لئے ایک نیکی لکھ دی جاتی ہے اور اگر وہ اس کو عملی جامہ پہنا دے تو اس کے لیے دس سے سات سو گنا، بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ نیکیاں لکھ دی جاتی ہیں اور جو شخص کسی برائی کا ارادہ کرے، پھر اسے عملی جامہ نہ پہنائے تو اس کے لئے ایک نیکی لکھ دی جاتی ہے اور اگر اسے عملی جامہ پہنا دے تو اس کے لئے ایک ہی برائی لکھی جاتی ہے یا اللہ ﷻ اسے بھی معاف فرما دیتا ہے۔ اس طرح اللہ ﷻ کے ہاں تباہ و برباد ہونے والا شخص ہی ہلاک ہوتا ہے۔" (بخاری، مسلم، مسند احمد)

علمی بات: اجر و ثواب میں کمی زیادتی کا مدار انسان کے احوال اور اخلاص پر مرتب ہے جو جتنی تنگی اور مصیبت میں اخلاص کے ساتھ نیکی اختیار کرے گا اسی کے بقدرِ ثواب ملے گا کیونکہ اللہ ﷻ انسان کے اعمال اور اس کی دلی کیفیت کو دیکھتا ہے جس درجہ کا اخلاص ہو گا اسی درجہ کا اجر و ثواب ملے گا۔ (واللہ اعلم بالصواب)۔

آیت نمبر ۱۶۱: صراط مستقیم کا مطلب ہے خالص دین پر عمل کرنا یعنی ہر معاملے میں یکسو ہو کر اللہ ﷻ کی اطاعت کرنا۔ اس کی عملی مثال حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں جنھوں نے ہر محبت کو اللہ ﷻ کی محبت کے سامنے قربان کر دیا۔ ملتِ ابراہیمی کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے یہود و نصاری اور مشرکین بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امامت و عظمت کے قائل ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام غیر اللہ ﷻ کی عبادت اور شرک سے بیزار تھے اور اللہ ﷻ کی توحید کے خالص داعی تھے۔ گویا نبی کریم ﷺ اعلان فرما رہے ہیں کہ اے عرب کے بت پرستو! تم چاہو کسی کو اپنا معبود بناؤ۔ اللہ ﷻ کی زمین میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑکاؤ اور فسق و فجور کا بازار گرم کرو۔ مجھے تم سے کوئی سروکار نہیں۔ میں تو ثابت قدمی سے توحید اور پاک بازی کی اسی راہ پر گامزن رہوں گا جو

مجھے میرے مالک نے دکھادی ہے۔ اور یہ کوئی نئی راہ نہیں ہے بلکہ تمہارے ہی جد الانبیاء حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی راہ ہے جس کی اولاد ہونے پر تم فخر کرتے ہو جس کے بنائے ہوئے کعبہ کی خدمت گذاری سے تمہاری ساری عظمتیں وابستہ ہیں۔ وہ شرک سے بیزار اور مؤحد تھے۔ تو پھر میں توحید چھوڑ کر شرک کیسے اختیار کر سکتا ہوں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مشرکوں سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ یہود و نصاریٰ اور اسی طرح مشرکین عرب کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اتباع واقتداء کا دعویٰ کرنا غلط ہے کیونکہ جس طرح یہ لوگ شرک میں مبتلا ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہر طرح کے شرک سے پاک اور بری تھے۔ وہ ہر طرف سے رخ پھیر کر صرف اللہ وحدہ لاشریک کے ہو کر رہ گئے تھے۔ یہاں تک کہ آپکا لقب ہی "حنیف" یعنی یکسو ہو گیا تھا۔ اور آپ کی ملت "ملت حنیفیہ" کہلائی جسکی اتباع و پیروی کا حکم امام الانبیاء حضرت محمد ﷺ کو بھی دیا گیا۔ "پھر ہم نے آپ کی طرف وحی بھیجی کہ آپ ابراہیم (علیہ السلام) کے طریقہ کی پیروی کریں جو بلکل یک سُو تھے اور وہ مشرکوں میں سے نہیں تھے" (سورۃ النحل ۱۶، آیت: ۱۲۳)۔

آیت نمبر ۱۶۲: حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ میرا دل چاہتا ہے کہ ہر مسلمان اس آیت کو بار بار پڑھا کرے اور اس کو وظیفہ زندگی بنالے۔ اس آیت میں دو باتیں بتائی گئیں۔ اول یہ کہ ہر کام اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی رضا کے لئے ہونا چاہیئے دوم یہ کہ مومن کی زندگی بھی قیمتی ہے اور موت بھی قیمتی ہے۔ مومن کو چاہیئے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی کے لئے جیئے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی کے لئے مرے۔ پوری زندگی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے احکام کی پابندی میں گزارے اور فرائض وواجبات کے علاوہ بھی انہیں کاموں میں لگائے جن سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ اور جب مرنے لگے تو ایمان ہی پر مرے تو اس کی یہ موت قیمتی ہو جائے گی کیونکہ موت ہی اخروی نعمتوں کے درمیان حائل ہے۔ جب مومن بندہ موت کی آغوش میں چلا جاتا ہے تو اس کے لئے خیر اور بھلائی ہی ہے۔ اگر عام مومنانہ زندگی گزارتے ہوئے کسی جہاد شرعی میں شریک ہو گیا اور دشمنانِ دین کے ہاتھوں شہید ہو گیا تو شہادت کی وجہ سے اس کی موت اور زیادہ قیمتی ہو جائے گی۔ لہذا ہر مومن بندہ اپنی موت اور زندگی کو قیمتی سمجھے اُسے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے احکام کی پیروی کر کے قیمتی بنائے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ رب العالمین اور پروردگار ہے چنانچہ یہ اس کا حق اس کا ہے کہ یہ تھوڑی سی زندگی اس کی راہ اور اطاعت میں خرچ ہو جائے۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

علمی بات: یہاں دوبارہ قل کہہ کر حضور ﷺ کو مخاطب فرمایا گیا ہے لیکن آپ ﷺ کی وساطت سے ہم میں سے ہر ایک کو یہ حکم پہنچ رہا ہے۔ کاش ہم میں سے ہر ایک یہ اعلان کرنے کے قابل ہو سکے کہ میری نماز 'میری قربانی 'میرا جینا اور میرا مرنا اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لئے ہے جو رب العالمین ہے۔ لیکن یہ تب ممکن ہے جب ہم اپنی زندگی واقعۃً اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لئے وقف کر دیں۔ دنیوی زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ناگزیر حد تک تو اپنا وقت اور صلاحیتیں ضرور صرف کریں لیکن اس ساری تگ ودَو کو اصل مقصود زندگی نہ سمجھیں بلکہ اصل مقصود زندگی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی اطاعت اور اُس کے کلمہ کی سربلندی کی جدوجہد ہی کو سمجھیں۔

آیت نمبر ۱۶۳: توحید باری تعالیٰ کی دعوت رسول ﷺ سمیت تمام انبیاء کرام علیہم السلام نے دی۔ ہر امت کے پہلے مسلمان اور صاحبِ ایمان خود وہ نبی یا رسول ہوتے ہیں جن پر وحی نازل ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے رسول ﷺ اپنی امت میں اول المسلمین ہیں۔

نوٹ: مسلمان ہونے کے ناطے ہمارا بھی اولین تعارف بطورِ مسلمان ہونا چاہیئے اور اس کے بعد عملی زندگی میں اس کا نمونہ پیش کریں تاکہ غیر مسلم بھی دائرہ اسلام میں داخل ہو سکیں۔

آیت نمبر ۱۶۴: اس آیت میں مشرکین مکہ ولید بن مغیرہ وغیرہ کی اس بات کا جواب ہے جو وہ رسول اللہ ﷺ اور عام مسلمانوں سے کہا کرتے تھے کہ تم ہمارے دین میں واپس آجاؤ، تو تمہارے سارے گناہوں کا بوجھ ہم اٹھالیں گے، اس پر فرمایا کہ آپ ﷺ ان سے کہہ دیجئے کہ کیا تم مجھ سے یہ چاہتے ہو کہ تمہاری طرح میں بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے سوا کوئی اور رب تلاش کر لوں، حالانکہ وہی سارے جہان اور ساری کائنات کا رب ہے، اس گمراہی کی مجھ

سے کوئی امید نہ رکھو، باقی تمہارا یہ کہنا کہ ہم تمہارے گناہوں کا بوجھ اٹھالیں گے یہ خود ایک حماقت ہے، گناہ تو جو شخص کرے گا اسی کے نامہ اعمال میں لکھا جائے گا، اور وہی اس کی سزا کا مستحق ہو گا تمہارے اس کہنے سے وہ گناہ تمہاری طرف کیسے منتقل ہو سکتا ہے۔ اور اگر یہ خیال ہو کہ نامہ اعمال میں تو انہی کے لکھا رہے گا لیکن میدان حشر میں ان گناہوں کا بوجھ ہم اُٹھالیں گے تو اسے بھی اس آیت کے اگلے جملہ نے رد کر دیا، وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی، "یعنی قیامت کے روز کوئی شخص کسی دوسرے کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھائے گا"۔

نوٹ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے ہدایت کی دعوت دی تو اس کو ہدایت پر تمام عمل کرنے والوں کے برابر اجر ملے گا اور ان متبعین کے اجروں میں سے کوئی کمی نہیں ہو گی اور جس نے کسی گمراہی کی دعوت دی تو گمراہی کا سبب بننے کی وجہ سے اس کو اس گمراہی پر تمام عمل کرنے والوں کے برابر سزا ملے گی اور ان متبعین کی سزاؤں میں کوئی کمی نہیں ہو گی۔ (صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابو داؤد، مسند احمد)

آیت نمبر ۱۶۵: لفظ خلائِف، خلیفہ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں کسی کا قائم مقام یعنی کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہی تم کو تم سے پہلی قوموں کی جگہ پر آباد کیا ہے، کوئی مکان زمین جسے آج تم اپنی ملکیت کہتے اور سمجھتے ہو یہ کل تم ہی جیسے دوسرے انسانوں کی ملکیت میں تھی، اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان کو ہٹا کر تمہیں ان کی جگہ بٹھایا ہے، اور پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ تمام انسان یکساں نہیں، کوئی مفلس ہے کوئی مال دار، کوئی کم تر ہے تو کوئی عزت میں برتر، یہ درجات کا تفاوت بھی تمہیں اس کی خبر دے رہا ہے کہ اختیار کسی اور ہستی کے ہاتھ میں ہے، وہ جس کو چاہے مفلس کر دے جس کو چاہے مال دار، جس کو چاہے عزت دے جس کو چاہے ذلیل کر دے۔ یہ سب کچھ دراصل امتحان کا سامان ہے، پوری زندگی ایک امتحان گاہ ہے، اور جس کو جو کچھ بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے دیا ہے اسی میں اس کا امتحان ہے کہ اس نے کس طرح اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی دی ہوئی جان، مال، عمر اور عہدہ کو امانت سمجھ کر اس کا حق ادا کیا، اور کس حد تک اپنی فرماں برداری کا ثبوت دیا۔ اسی امتحان کے نتیجہ میں آخرت کی زندگی کے درجات اور مراتب کا انحصار ہے کہ اس زندگی کے مطابق وہاں درجات اور مراتب ملیں گے۔

عملی پہلو: یہ آزمائش اس لئے ہے کہ قیامت کے دن سب لوگوں کو معلوم ہو کہ کون مال وزر کی فروانی کی وجہ سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے احکام بھلا بیٹھا اور نفسانی خواہشوں کی اتباع میں زندگی کی متاعِ عزیز لٹا بیٹھا اور کون ایسا ہے جو مال و دولت اور صحت کی فراوانی کے باوجود اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے ڈرتا رہا' اور اپنے مال و جان اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے احکام کی اطاعت اور خلق خدا کی خدمت میں صرف کرتا رہا' اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا شکر بجالاتا رہا۔ اور کون غربت و افلاس میں بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ اور بندوں کے حقوق ادا کرتا رہا؟ اور کون اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے شکوہ اور شکایت کرتا رہا؟ اور عبادت سے غافل رہا اسی طرح کون بیماری کی تکلیف صبر کے ساتھ سہتا رہا؟ اور کون بیماری میں گلے شکوے کرتا رہا؟ اور کون ہر حال میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی اطاعت میں لگا رہا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی شخص کسی ایسے شخص کو دیکھے جو مال اور شکل و صورت میں اس سے بڑھ کر ہے تو چاہیئے کہ اس کو بھی دیکھ لے جو اس سے کم ہے۔ (مشکوٰۃ المصابیح) اور ایک روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تم اس کو دیکھو جو تم سے کم ہے اور اس کو نہ دیکھو جو تم سے زیادہ ہے ایسا کرو گے تو تم پر جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی نعمتیں ہیں انہیں حقیر نہ جانو گے۔ (صحیح مسلم) اور ایک حدیث مبارک میں یوں آیا ہے کہ جس شخص میں دو باتیں ہوں گی اللہ سبحانہ وتعالیٰ اسے صابر اور شاکر لکھ دے گا۔ دین میں اسے دیکھے جو اس سے بڑھ کر ہے پھر اس کی اقتداء کرے اور دنیا میں اسے دیکھے جو اس سے کمتر ہو پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی حمد بیان کرے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اسے اس شخص پر فضیلت دی ہے، ایسے شخص کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ شاکر اور صابر لکھ دے گا اور جس نے اپنے دین میں ایسے شخص کو دیکھا جو اس سے کم ہے اور دنیا میں اسے دیکھا جو اس سے بڑھ کر ہے پھر اسے اس بات پر رنج ہوا کہ دنیا میں مجھے اتنا نہیں ملا تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ اسے نہ شاکر لکھے گا اور نہ صابر لکھے گا۔ (مشکوٰۃ المصابیح) آیت کے آخر میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی بندگی پر اس کی شان رحیمی و غفاری کے مستحق بننے کی بشارت دی گئی ہے جبکہ نافرمانی پر شدید عذاب سے دوچار ہونے کی وعید سنائی گئی ہے۔

سُوْرَۃُ الْاَعْرَاف

آیت نمبر ۱: علمی بات: الٓمّٓصٓ یہ حروف مقطعات میں سے ہے۔ حروف مقطعات کی کل تعداد ۱۴ چودہ ہے۔ حروفِ مقطعات قرآنِ حکیم کی (۲۹) (انتیس) سورتوں میں آئے ہیں۔ حروف مقطعات کا علم اللہ ﷻ کے پاس ہے اور یہ اللہ ﷻ اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان ایک راز ہے۔

علمی بات: اگر منکرین کے زعم کے مطابق قرآنِ حکیم کسی انسان کا کلام ہے تو ان ہی حروف سے مرکب کر کے وہ بھی قرآنِ حکیم کی کسی ایک سورت کی مثل بنا کر لے آئیں کیونکہ یہ کلام ان حروف ہجاء سے مرکب ہے جن کو تمام اہل عرب جوڑ کر اپنے کلام کو مرکب کرتے ہیں اور جب سر توڑ کوشش اور عربی زبان پر عبور رکھنے کے باوجود کوئی منکر اس کلام کی نظیر تو کجا اس کی سورت کی مثل یا اِس کی آیت کے مثل بھی نہ لا سکا تو یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو گئی کہ یہ قرآنِ حکیم کسی انسان کا کلام نہیں ہے بلکہ اللہ ﷻ کا کلام ہے۔

آیت نمبر ۲: نزولِ قرآن کا اولین مقصد غفلت میں پڑی ہوئی انسانیت کو بیدار کرنا اور انکار کرنے والوں کو عذاب الٰہی سے ڈرانا ہے۔

علمی بات: اس آیت کا معنی یہ ہے کہ قرآنِ حکیم کی تبلیغ میں اس خوف سے آپ ﷺ کا دل تنگ نہ ہو کہ کفار آپ ﷺ کی تکذیب کریں گے، اس آیت میں آپ ﷺ کو قرآنِ حکیم کے ذریعہ سے ڈرانے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے یہ کتاب، اللہ ﷻ نے آپ ﷺ پر نازل فرمائی ہے، اس لئے آپ ﷺ کو یہ یقین ہے کہ اللہ ﷻ کی نصرت اور حمایت آپ ﷺ کے ساتھ ہے لہذا آپ ﷺ اپنے دل منور میں اس کی تبلیغ کے حوالہ سے کوئی پریشانی محسوس نہ کیجئے کیونکہ جس کا اللہ ﷻ حافظ و ناصر ہو اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا سو آپ ﷺ قرآنِ حکیم کی تبلیغ کرنے، اس کے ذریعہ سے ڈرانے اور اس کے ساتھ نصیحت کرنے میں مشغول رہئے اور کفار اور مشرکین کی مخالفت کی مطلقاً پروانہ کیجئے۔

عملی پہلو: امت کے لئے اس آیت میں یہ حکم ہے کہ اللہ ﷻ کا پیغام دوسروں تک پہنچانے کا فرض ادا کرتی رہے اور اس دعوت و تبلیغ میں کسی قسم کا کوئی خوف اور تنگی محسوس نہ کرے۔

علمی و عملی بات: اس آیت میں فرمایا ہے: "تاکہ آپ اس (قرآنِ حکیم) کے ذریعہ سے ڈرائیں اور یہ ایمان والوں کے لئے نصیحت ہے" لیکن چونکہ اس سے فائدہ صرف مومنین حاصل کرتے ہیں اور وہی اس کی نصیحت قبول کرتے ہیں اس لئے فرمایا کہ یہ مومنین کے لئے نصیحت ہے۔ اس آیت میں قرآنِ حکیم کے ذریعہ سے ڈرانے کا بھی ذکر ہے اور قرآنِ حکیم سے نصیحت کرنے کا بھی ذکر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عموماً انسان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ بعض ضدی اور سرکش ہوتے ہیں اور خواہشاتِ نفسانی میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کو انبیاء کرام علیہم السلام اخروی عذاب سے ڈراتے ہیں اور بعض انسان نیک اور شریف ہوتے ہیں اور حق بات کو قبول کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ ان کے لئے انبیاء کرام علیہم السلام کی صرف نصیحت ہی کافی ہوتی ہے۔

علمی بات: قرآنِ حکیم کے سنانے کا ایک فائدہ تو یقینی ہے کہ جو لوگ ایمان لا چکے ہیں ان کے لئے یہ نصیحت بھی ہے اور یاد دہانی بھی جو ان کے ایمان کو مزید پختہ اور مضبوط بنا دے گی اور عالم ارواح میں کئے گئے عہد ("اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ" (اور پوچھا) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟) سورۃ الاعراف ۷، آیت: ۱۷۲) کی یاددہانی بھی ہے جو ہر انسان کے شعور میں موجود ہے اور یہ قرآنِ حکیم اسی دبے ہوئے شعور کو بیدار اور اس عہد کی یاد تازہ کرتا ہے۔ اور اسی طرح اللہ ﷻ نے اپنی پہچان اور معرفت کے حصول کے لئے بالخصوص قرآنِ حکیم اور اس کائنات کی نشانیاں ہمیں عطا کیں تاکہ ان میں غور و فکر کے ذریعہ ہم اللہ ﷻ کی پہچان اور معرفت حاصل کر سکیں۔

آیت نمبر ۳ اس آیت میں اہل ایمان کو قرآنِ حکیم کے احکامات پر عمل کرنے کی پرزور تاکید کی جا رہی ہے۔

علمی بات: "رب کی طرف سے نازل کیا گیا" سے مراد ہے قرآنِ حکیم اور رسول اللہ ﷺ کی احادیث مبارکہ ہیں، کیونکہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں قرآنِ حکیم اور اس کی مثل اس کے ساتھ دیا گیا ہوں۔ (ابو داؤد)

عملی پہلو: یہ قرآنِ حکیم اس لئے نازل ہوا کہ اس کے احکام پر عمل کیا جائے یعنی قرآنِ حکیم کی تلاوت کے ساتھ ساتھ اس پر عمل بھی لازم اور ضروری ہے اور یہ اس وقت ممکن ہے جب ہم قرآنِ حکیم کے معنی و مطلب اور احکامات کو سمجھیں گے کہ اس میں کن اعمال کی ادائیگی کا حکم ہے اور کن ناپسندیدہ اعمال سے منع کیا گیا ہے۔

علمی بات: یہاں اولیاء سے مراد دنیا پرست پیشوا اور دوست ہیں۔ جو باطل کی راہ دکھاتے ہیں اور گمراہی کے رستہ پر ڈال دیتے ہیں یہ رفیق وہی ہیں جنہیں دوسری جگہ قرآنِ حکیم میں "شَیَاطِیْنَ الْجِنِّ وَالْاِنْس" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بہر کیف آیت مبارکہ میں قرآن حکیم کو چھوڑ کر دوسرے سرکش دوستوں کی پیروی کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔

علمی بات: کم نصیحت قبول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جب انہیں نصیحت کی جاتی ہے تو بہت کم دھیان دیتے ہیں۔

علمی بات: اس آیت میں امت کو یہ حکم دیا ہے کہ نبی کریم ﷺ پر جو کچھ نازل کیا گیا ہے وہ اس کی اتباع کریں اور اس پر عمل کریں اور اس آیت میں احادیث مبارکہ کے حجت ہونے پر دلیل ہے، کیونکہ جس طرح نبی کریم ﷺ پر قرآنِ حکیم نازل کیا گیا ہے اسی طرح آپ ﷺ پر احادیث مبارکہ بھی نازل کی گئی ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ قرآنِ حکیم کے الفاظ اور معانی دونوں نازل ہوئے ہیں اور احادیث مبارکہ کے نبی کریم ﷺ پر صرف معانی نازل ہوئے اور ان معانی کو نبی کریم ﷺ نے اپنے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے، اس آیت کے علاوہ بھی متعدد آیات احادیث مبارکہ کے حجت ہونے پر دلیل ہیں، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"رسول تمہیں جو کچھ دیں، وہ لے لو، اور جس چیز سے منع کریں اس سے رک جاؤ"۔ (سورۃ الحشر ۵۹، آیت: ۷)

آیت نمبر ۴: اس آیت میں نوح علیہ السلام کی قوم، ہود علیہ السلام کی قوم، صالح علیہ السلام کی قوم، اور شعیب علیہ السلام کی قوم کی بستیوں کی ہلاکت کی طرف اشارہ ہو رہا ہے کہ ان قوموں پر رسولوں کی مخالفت اور ان کی تکذیب کرنے کی وجہ سے اللہ ﷻ کا عذاب آیا۔

علمی بات: حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر رات میں اور حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم پر دوپہر کے وقت عذاب آیا تھا۔ قرآنِ حکیم میں بڑی تفصیل سے ان قوموں کا ذکر کیا گیا ہے جن کو لمبی مہلت دی گئی اور بالآخر ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے ان پر عذاب الٰہی نازل ہوا۔ اور یہ تو دنیاوی ہلاکت تھی، اخروی اور مستقل عذاب تو روزِ قیامت دیا جائے گا۔

عملی پہلو: جب انسان اللہ ﷻ کے احکامات بھول کر غفلت کا شکار ہو جاتا ہے تو پھر اللہ ﷻ کی پکڑ ہوتی ہے۔

علمی بات: یہاں رات اور دوپہر کے وقت کا ذکر بستی والوں کی انتہائی غفلت کو ظاہر کرنے کے لئے کیا گیا ہے۔ کیونکہ اہل عرب میں بھی قیلولہ کا رواج تھا تو مشرکین عرب کو ان کے انکار اور بد عملی کے نتائج سے خبر دار کیا جا رہا ہے۔

نوٹ: حضرت لوط علیہ السلام کے قصّہ کی مزید تفصیلات مطالعۂ قرآنِ حکیم حصّہ چہارم اور حضرت شعیب علیہ السلام کے قصّہ کی مزید تفصیلات حصّہ اوّل میں ملاحظہ فرمائی جا سکتی ہیں۔

آیت نمبر ۵: اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ مجرمین نے عذاب کے وقت اعتراف کیا اور پچھتائے کہ ہم نے رسولوں کی مخالفت کر کے اپنی ہی جانوں پر ظلم کیا مگر اس کا فائدہ نہیں ہوا۔

عملی پہلو: سخت نادان ہے وہ شخص اور وہ قوم جو اللہ ﷻ کی دی ہوئی مہلت کو غفلتوں اور سرکشیوں میں ضائع کر دے۔ نزولِ عذاب کے وقت یعنی مہلت ختم ہو جانے کے بعد کا اعتراف جرم کوئی فائدہ نہیں دیتا۔

عملی پہلو: گزرشتہ اقوام کا حال بتانے کا مقصد یہ ہے کہ اقوام سابقہ جن عقائد اور بداعمالیوں کی وجہ سے عذابِ الٰہی سے دوچار ہوئی انسان ان غلطیوں سے عبرت حاصل کرے اور اس عبرتناک انجام سے بچنے کے لئے اُن غلطیوں کو نہ دہرائے اور اللہ ﷻ نے جو مختصر سی زندگی اور مہلت دی ہے اس کا فائدہ اٹھائے اٹھاتے ہوئے اسے قیمتی بنائے۔

آیت نمبر ۶: اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ قیامت کے دن امتوں سے سوال ہو گا کہ کیا تم تک اللہ ﷻ کے احکامات نہیں پہنچائے گئے تھے اور تم نے رسولوں کی دعوت کو قبول کیا تھا؟ اسی طرح قیامت کے دن اللہ ﷻ کے رسولوں علیہم السلام سے بھی یہ سوال ہو گا کہ انہوں نے پیغامِ حق پہنچا دیا تھا یا نہیں؟

علمی بات: اللہ ﷻ اتمام حجت کے لئے اُمتوں سے پوچھے گا تاکہ وہ خود اپنے زبانی جرم کا اقرار کریں اور ذلیل و رسوا ہوں اسی طرح رسولوں سے گواہی کے طور پر پوچھا جائے گا۔ ورنہ اللہ ﷻ تو عالم الغیب ہے ہر شے اس کے علم میں ہے۔

علمی بات: حجتہ الوداع کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے سوال کیا "کیا میں نے اللہ ﷻ کا پیغام پہنچا دیا؟" تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جواب دیا کہ صرف پہنچایا ہی نہیں بلکہ اس کا حق بھی ادا فرما دیا ہے اور آپ ﷺ نے دعوتِ حق کی تبلیغ پر اللہ ﷻ کو گواہ بنایا اور اس کا اظہار کل قیامت کے دن بھی ہو گا۔

عملی پہلو: نبی کریم ﷺ اللہ ﷻ کے آخری رسول ہیں۔ آپ ﷺ پر نبوت ختم ہو گئی ہے چنانچہ اب دعوتِ الی اللہ اور تبلیغ کی ذمہ داری اُمت مسلمہ پر ہے۔ جیسا کہ حجتہ الوداع کے موقع آپ ﷺ نے فرمایا: "کہ اب پہنچائیں وہ لوگ جو یہاں موجود ہیں ان لوگوں کو جو یہاں موجود نہیں ہیں"۔ گویا ختمِ نبوت کے بعد دعوت و تبلیغ کی ذمہ داری اب اُمتِ مسلمہ کے کاندھوں پر ہے۔

علمی بات: گواہی اس لئے ضروری ہوتی ہے تاکہ کسی کو اس کے جرم کی سزا نہ زیادہ ملے اور نہ اس پر ظلم ہو۔ یعنی قیامت میں اللہ ﷻ کا پوچھ گچھ فرمانا ضابطہ کی کاروائی کے لئے ہو گا ورنہ وہ تو علیم و خبیر ذات ہے۔

آیت نمبر ۷: اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اللہ ﷻ کے علم سے کوئی بات پوشیدہ نہیں ہے، وہ لوگوں کے ظاہر و باطن اور ان کے ہر قول و فعل سے باخبر ہے۔ اللہ ﷻ ہم سے کسی لمحہ دور نہیں ہوتا وہ ہماری ہر بات سے باخبر ہے۔ قیامت کے دن انسان کے اعضاء اللہ ﷻ کے حکم سے بندوں کے خلاف گواہی دیں گے۔ جیسا کہ سورۃ یٰس ۳۶، آیت: ۶۵ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے "آج ہم ان کے مونہوں پر مہر لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے باتیں کریں گے اور ان کے پاؤں (اس کی) گواہی دیں گے جو کچھ وہ کیا کرتے تھے" اور سورۃ حم السجدہ ۴۱، آیات: ۲۰ اور ۲۱ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے "یہاں تک کہ جب وہ اس (جہنم) کے پاس پہنچ جائیں گے تو ان کے کان ان کی آنکھیں اور ان کی کھالیں ان کے خلاف گواہی دیں گی ان اعمال کی جو وہ کیا کرتے تھے وہ اپنی کھالوں سے کہیں گے تم نے ہمارے خلاف گواہی کیوں دی وہ کہیں گی ہمیں اُسی اللہ نے بولنا سکھایا ہے جس نے ہر شے کو بولنا سکھایا ہے اور اُسی نے تمہیں پہلی بار پیدا فرمایا ہے اور اس کی طرف تم سب لوٹائے جاؤ گے۔"

علمی بات: اگر کوئی مجرم دنیا میں اپنے آپ کو سزا سے بچا لے یا بچ جائے تو قیامت کی سزا سے نہیں بچ سکتا کیونکہ اللہ ﷻ مجرموں کو ان کے کئے کی سزا ضرور دے گا۔

آیت نمبر ۸: اس دن وزن کے حق ہونے کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ اس دن وزن صرف حق ہی میں ہو گا، یعنی صرف اعمال صالحہ ہی کا وزن ہو گا، باطل اور بُرے اعمال سرے سے بے وزن ہوں گے اور ریاکاری کی نیکیاں ترازو میں بالکل بے حیثیت ہوں گی۔ دوسرا مفہوم یہ بھی ہے کہ اس دن وزن ہی حق ہو گا، وزن ہی فیصلہ کن ہو گا۔ یعنی اس روز اللہ ﷻ ایسا میزان عدل قائم کرے گا، جس کے ذریعے سے اعمال کا ٹھیک ٹھیک وزن ہو گا۔ تو جس کا نیکیوں والا پلڑا بھاری ہو گا اس کے لئے نجات ہو گی۔

علمی بات: اعمال کے وزنی اور بے وزن ہونے کے باب میں سورۃ الکہف ۱۸، آیات: ۱۰۳ تا ۱۰۵ میں ارشادِ باری تعالیٰ کا مفہوم ہے: "آپ فرما دیجئے کیا ہم تمہیں بتائیں اعمال کے اعتبار سے سب سے زیادہ خسارے والے (کون ہیں)۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی کوششیں دنیا کی زندگی میں ضائع ہو گئیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ وہ بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رَب کی آیات کا انکار کیا اور اس کی ملاقات کا پس ان کے اعمال برباد ہو گئے پس ہم قیامت کے دن ان کے لئے کوئی وزن قائم نہیں کریں گے۔"

علمی بات: میزان سے مراد ترازو ہے جس کے دو پلڑے ہوتے ہیں۔ قیامت کے روز تمام ظاہری اور باطنی اعمال کا ٹھیک ٹھیک وزن کیا جانا برحق ہے تاکہ ہر ایک کی حالت اس پر واضح ہو جائے اور یہ بھی ظاہر ہو جائے کہ حساب و کتاب کے بعد جو جزا و سزا دی جائی گی ہے وہ عین حق اور اعمال کے مطابق ہو گی۔ کسی کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی اور ناانصافی نہ ہو گی۔

عملی پہلو: قیامت کے دن میزان پر وہی اعمال بھاری اور وزن رکھتے ہوں گے جو صرف اللہ ﷻ کی رضا و خوشنودی کے لئے اخلاص سے کیئے گئے ہوں گے۔ اگر اچھے سے اچھا عمل محض دکھاوے اور نمود و نمائش، کے لئے کیا ہو گا تو میزان الٰہی میں ان کا کوئی وزن نہ ہو گا۔ اور یہی لوگ خسارے میں ہوں گے۔

آیت نمبر ۹: اللہ ﷻ کے ہاں کفار کا عمل قبول نہیں کیونکہ بغیر ایمان کے کوئی عمل معتبر ہی نہیں ہوتا اور جب میزان عدل میں ان کے اعمال کو تولا جائے گا ان کے اعمال کا پلڑا ہلکا رہے گا اور یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنی جانیں خسارہ میں ڈالیں اور ہماری آیتوں پر ناانصافی سے انکاری تھے اور اس طرح یہ سب اپنی جانوں پر زیادتی کرنے والے تھے۔ میزان عدل میں ایمان و کفر کا وزن کیا جائے گا ایک پلڑے میں ایمان اور دوسرے میں کفر کو رکھا جائے گا جب اس تول سے مومن و کافر الگ الگ ہو جائیں گے تو پھر خاص طور پر مومنین کے لئے ایک پلڑے میں ان کی حسنات اور دوسرے پلڑے میں ان کی سیئات رکھ کر ان اعمال کا وزن ہو گا اور جیسا

کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اگر حسنات غالب ہوئیں تو جنت اور اگر سیئات غالب ہوئیں تو دوزخ اور اگر دونوں برابر ہوئیں تو اعراف کے حق دار ہونگے پھر یا تو آپ ﷺ کی شفاعت کی وجہ سے سزا سے پہلے یا سزا کے بعد جنّت میں داخل ہوں گے۔

علمی بات: آیاتِ الٰہی سے بے انصافی اور ظلم کرنے کا یہ مطلب ہے کہ وہ ان آیات میں غور و فکر نہیں کرتے۔ ہدایت کی جو روشنی ان آیات میں موجود ہے اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ بلکہ انا اور ضد کے سبب ان آیات سے منہ موڑے رہتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ ﷻ کی آیتوں کا انکار کر کے ان کو جھٹلاتے اور ان کی اطاعت سے منہ موڑتے تھے وہ تو ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔

عملی پہلو: دین حق کو نہ قبول کرنا اور احکامات خداوندی سے انکار و بغاوت آیاتِ الٰہی کے حق میں ظلم و بے انصافی کرنا ہے۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ اس روز قیامت سے قبل جو وقت دنیا میں میسر ہے اپنے مقصد حیات کو سمجھ کر دین اسلام کے تحت زندگی بسر کی جائے۔

آیت نمبر ۱۰: اس آیت میں اللہ ﷻ انسانوں پر کی جانے والی درج ذیل نعمتوں کا ذکر فرما رہا ہے:

۱۔ نعمتِ اقتدار: یعنی اللہ ﷻ نے زمین کے وسائل کو انسان کی خدمت پر لگا دیا۔ سورۃ الجاثیہ ۴۵ کی آیت: ۱۳ میں ہے کہ "زمین میں جو کچھ بھی ہے اسے اللہ ﷻ نے تمہاری خدمت میں لگا دیا"۔

۲۔ نعمتِ معیشت: یعنی اللہ ﷻ نے زندگی بسر کرنے کے لئے سارے اسباب جمع کر دیئے۔ جیسے پہاڑ، نہریں، ہوا، آگ، سورج، پیڑ پودے، اور کھانے پینے کی انواع واقسام کی چیزیں تاکہ انسان ان سے دنیا کی زندگی میں نفع اُٹھائیں۔

عملی پہلو: انسان پر اللہ ﷻ کے انعامات واحسانات اس قدر زیادہ ہیں کہ اگر ان کا شمار ممکن ہے اور اگر اللہ ﷻ ان انعامات کو واپس لے یا ان میں سے کوئی ایک بھی کم کر دیا جائے مثلاً ہوا کا وجود ہی ختم ہو جائے یا دھوپ کبھی نہ نکلے تو اس دنیا میں انسان کا جینا محال ہو جائے ان احسانات کا بدلہ اور ان نعمتوں کا تقاضا یہ تھا کہ انسان اللہ ﷻ کا خوب شکر ادا کرتا اور اس کی خوب عبادت کرتا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اکثر و بیشتر انسان اللہ ﷻ کا کم شکر ادا کرتے ہیں۔ مال اور اقتدار کو صحیح مصرف میں خرچ کرنا ان نعمتوں کی شکر گزاری ہے۔

علمی و عملی بات: اس آیت میں اللہ ﷻ نے اپنی بے شمار نعمتوں کی یاد دلا کر بندوں کو اپنے احکامات کی پیروی اور منکرات سے بچنے کی ترغیب دی ہے اور انہیں شکر گزاری کی طرف متوجہ کیا ہے کہ اس دنیا میں اسی نے تمہیں زمین پر رہنے اور زندگی گزارنے کی قدرت عطا فرمائی اور تمہارے لئے زندگی بسر کرنے کے اسباب، کھیتی باڑی، پھل، ترکاری، غلہ، مویشی اور تجارت کے سامان اور کسب و کمائی کے پیشے وغیرہ پیدا کیئے۔ اس کے باوجود لوگ ان سب نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتے، بلکہ ان نعمتوں میں مشغول ہو کر وہ حقیقی منعم اللہ ﷻ کو بھول جاتے ہیں اور اس کی نافرمانی کرنے لگتے ہیں۔

نوٹ: سورۃ الاعراف کی آیات: ۱۱ تا ۲۷ کی وضاحت رہنمائے اساتذہ مطالعۂ قرآن حکیم حصّہ اوّل میں ملاحظہ فرمائیں۔

آیت نمبر ۲۸: اس آیت میں فحش سے مراد بیت اللہ ﷻ کا برہنہ طواف کرنا ہے۔ مشرکین عرب اس فعل کو مقدس مذہبی فریضہ سمجھتے تھے۔ وہ اس جاہلانہ رسم کے جواز کے لئے یہ دلیل دیتے کہ ہم اپنے باپ دادا کی پیروی کرتے ہیں اور انہیں اللہ ﷻ ہی نے ایسا حکم دیا ہے (معاذ اللہ)۔ لہٰذا ان پر واضح کر دیا گیا کہ بے حیائی اور فحاشی اللہ ﷻ کا حکم ہر گز نہیں ہو سکتا۔ ان کا یہ دعویٰ جھوٹ پر مبنی ہے۔

علمی بات: سنہ ۹ ہجری میں رسول اللہ ﷺ نے سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیر حج بنا کر بھیجا اور بعد میں سورۃ التوبہ کی ابتدائی آیات کے نزول کے بعد سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا۔ چنانچہ سنہ ۹ ہجری حج کے اجتماع میں جو عام اعلان کیا گیا اس کے دو اہم نکات یہ تھے کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک بیت اللہ میں داخل نہیں ہو سکتا اور دوسرا یہ کہ آئندہ کوئی ننگا ہو کر کعبہ کا طواف نہیں کر سکتا (صحیح بخاری)۔

نوٹ: مشرکین مکہ اگرچہ برہنگی کو باعث عار اور معیوب فعل نہیں سمجھتے تھے پھر جب انہیں اس کام سے روکا جاتا تو وہ کہہ یہ دیتے کہ ہمارے آباء واجداد اور بڑے بزرگ بھی کعبہ کا طواف ننگے ہو کر کرتے آئے ہیں وہ بزرگ ہم سے زیادہ دین دار تھے پھر بھلا ہم کیوں نہ کریں۔ چونکہ وہ اس طواف کو متبرک اور دین ہی کا حکم سمجھتے تھے اور کہتے تھے یہ اللہ ﷻ ہی کا حکم ہو گا جو ہمارے بزرگ برہنہ ہو کر طواف کرتے تھے۔ اللہ ﷻ نے اس کا جواب دیا کہ اللہ ﷻ تو بے حیائی کے کاموں سے روکتا ہے وہ اس کا حکم کیسے دے گا ہے؟ بالفاظ دیگر جس چیز میں بے حیائی پائی جاتی ہو وہ اللہ ﷻ کا حکم کبھی نہیں ہو سکتا۔

عملی پہلو: اس آیت کریمہ میں بہت بڑی ڈانٹ ہے ان لوگوں کے لئے جو راہ حق کو چھوڑ کر اپنے گم راہ آباءو اجداد کی اندھی پیروی کرتے ہیں۔ البتہ یہ یاد رہے، صاحب ایمان بزرگوں اور اہل حق کی پیروی تو مطلوب طرزِ عمل ہے۔

آیت نمبر ۲۹: "قسط" سے مراد ہے انصاف، اعتدال اور برابری۔ یعنی ایسا درمیانہ راستہ ہے جو افراط و تفریط سے پاک ہو۔ زندگی کے ہر معاملہ میں افراط و تفریط سے پاک رویہ اختیار کرنے کا حکم ہے۔ اللہ ﷻ کا ہر حکم قسط پر مبنی ہے اور بے حیائی قسط کی ضد ہے۔ چونکہ تمام احکام شرعیہ افراط و تفریط سے خالی ہیں اس لئے قسط کے مفہوم میں تمام عبادات و احکام شرعیہ داخل ہیں۔ اس آیت کے نزول کا سبب مشرکین کے برہنہ طواف سے متعلق ہے۔ بعض علماء کرام کے نزدیک اس آیت میں مسجد سے مراد نماز ہے۔ اللہ ﷻ ہی کو اخلاص کے ساتھ پکارنے کا حکم دیا گیا ہے۔ نیز یہ بھی بیان ہے کہ جس طرح پہلی بار انسان کو پیدا فرمایا گیا روز قیامت اسی طرح دوبارہ اسے زندہ کر کے کھڑا کیا جائے گا۔

علمی بات: ننگے ہو کر طواف کرنے کو اللہ ﷻ کا حکم قرار دینا، اللہ ﷻ پر صریح بہتان اور افتراء ہے۔ اللہ ﷻ کسی کو فحش و نازیبا کام کا حکم نہیں دیتا۔ وہ اپنی عبادت اور عدل و مساوات کا حکم دیتا ہے۔ لہٰذا ہر نماز کے وقت اپنا رخ سیدھا رکھو اور اللہ ﷻ کو اس طرح متوجہ ہو کر پکارو کہ خالص اسی کی عبادت ہو، اس کی عبادت میں کسی کی شرکت کا شائبہ تک نہ ہو اور اسی طرح ریاکاری سے بھی پاک ہو اور اس بات کا یقین کر لو کہ ایک دن تمہیں اپنے اعمال کا حساب دینا ہو گا۔ جس طرح اللہ ﷻ نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا اسی طرح تمہیں قیامت کے روز دوبارہ پیدا کرنا اس کے لئے ذرا مشکل نہیں۔ بالآخر تم اس کی طرف لوٹو گے۔ اس وقت تم سے تمہارے اعمال کی باز پرس ہو گی۔

آیت نمبر ۳۰: اس آیت میں دو گروہوں کا بیان ہے۔ ایک گروہ کو ایمان اور نیک عمل کی راہ دکھائی گئی جبکہ دوسرا گروہ اپنے انکار اور بد عملی کی وجہ سے گمراہ ہوا۔ گمراہ وہ ہیں جنھوں نے اللہ ﷻ کو چھوڑ کر شیطان کو دوست بنایا اور اپنے آپ کو ہدایت یافتہ سمجھتے رہے۔

علمی بات: وہ لوگ جنہوں نے اللہ ﷻ کی دی ہوئی سمجھ سے صحیح کام لیا اور اس کی عطا کردہ آزادی و اختیار کو استعمال کرتے ہوئے اللہ ﷻ کے حکموں کی پابندی کی کوشش کی انہیں راہ ہدایت دکھا دی گئی اور اس پر چلنے کی توفیق مرحمت فرما دی گئی اور جنہوں نے اللہ ﷻ کی دی ہوئی عقل و فہم سے کام نہ لیا اور اللہ ﷻ کو چھوڑ کر شریروں اور مفسدوں سے دوستی و محبت نبھائی۔ ان کے مقدر میں گمراہی لکھ دی گئی اور وہ بدنصیب اس غلط فہمی میں مبتلا رہے کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں عین حق ہے اور وہ سیدھے راستے پر ہیں اور یہ صرف اس وقت کے باطل پرستوں کا خیال نہ تھا بلکہ آج بھی راہ حق سے بھٹکے ہوئے افراد اور قومیں بڑی شد و مد اور وثوق سے اپنے آپ کو حق کا علم بردار سمجھتے ہیں۔ ان کی گمراہی کی وجہ بیان فرما دی کہ انہوں نے خود شیطان کی رفاقت اختیار کی اور اللہ ﷻ اور اس کے رسول ﷺ کا راستہ چھوڑ دیا۔

عملی پہلو: جن لوگوں نے حق کا انکار کیا اور پھر ڈٹ گئے وہ اپنی اس متعصبانہ روش، ہٹ دھرمی اور تکبر کے باعث گمراہی کے مستحق ہو جاتے ہیں لہٰذا ہمیں اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونا چاہیئے اور ان کی اہمیت و احترام ہمارے دلوں میں ضرور ہونا چاہیئے اور انہیں بے سود خیال کرنے سے لازماً بچنا چاہیئے۔

آیت نمبر ۳۱: اس آیت میں زینت سے مراد لباس ہے۔ نماز میں ستر پوشی کے علاوہ اپنی وسعت کے مطابق زینت والا لباس اختیار کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ تمام حلال اور پاکیزہ اشیاء کھانے کی اجازت ہے۔ تاہم اسراف کی ممانعت ہے۔ اسراف کا مطلب ہے ضروریاتِ زندگی پر ضرورت سے زیادہ خرچ کرنا یا بغیر ضرورت کے خرچ کرنا۔

علمی بات: طواف اور نماز میں پردے کی چیزوں کو چھپانا فرض ہے، مرد کے لئے کمر سے گھٹنوں تک اور عورت کے لئے چہرہ اور ہاتھوں کے سوا سارا بدن ستر ہے۔ باریک کپڑا جس سے بدن اور بال نظر آئیں معتبر نہیں، یعنی نہ ہونے کے برابر ہے۔ پس جس عورت کا سر، گردن یا بازو یا پنڈلی کھلی ہوئی ہو تو ایسے لباس میں غیر محرم کے سامنے رہنا اس کے لئے جائز نہیں اور نہ ایسے لباس میں اس کی نماز ہو گی۔ عورت کا چہرہ، ہتھیلیاں اور قدم جو ستر سے مستثنیٰ قرار دیئے گئے ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر نماز میں اس کے یہ اعضاء کھلے ہوئے ہوں تو نماز میں کوئی خلل نہیں آئے گا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ شرعی عذر کے بغیر چہرہ کھول کر غیر محرموں کے سامنے آئے۔ اسی طرح مرد کا مونڈھے یا کہنیاں کھول کر نماز پڑھنا مکروہ ہے۔ ایسے لباس میں بھی نماز پڑھنا مکروہ ہے جس کو پہن کر آدمی اپنے دوستوں اور عام لوگوں کے سامنے جانا قابل شرم و عار سمجھے۔ البتہ جمعہ جسے سید الایام کہا گیا ہے اس دن خاص طور پر غسل کرنے، خوش بو لگانے اور اپنے موجودہ لباس میں سے بہترین پہننے کا حکم دیا۔ جمعہ مسلمانوں کی ہفتہ وار عید ہے۔ اسی طرح عید الفطر اور عید الاضحیٰ سالانہ عیدیں ہیں، ان میں تو بدرجہ اولیٰ اس کا اہتمام ہونا چاہیئے۔

علمی بات: زمانہ جاہلیت کے عرب ننگے ہو کر بیت اللہ کا طواف کرنے کو عبادت اور بیت اللہ کا احترام سمجھتے تھے۔ اس آیت میں لباس کو لفظ زینت سے تعبیر کر کے اس طرف اشارہ کر دیا گیا کہ نماز میں افضل واولیٰ یہ ہے کہ صرف ستر پوشی پر کفایت نہ کی جائے بلکہ اپنی وسعت کے مطابق اچھا لباس پہنا جائے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نماز کے وقت اپنا سب سے اچھا لباس پہنتے تھے اور فرماتے تھے کہ اللہ ﷻ جمیل ہے اور جمال کو پسند فرماتا ہے۔ اس لئے میں اپنے رب کے لئے زینت و جمال اختیار کرتا ہوں۔

عملی پہلو: ایک حدیث شریف میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ "کھاؤ، صدقہ کرو، اور پہنو، لیکن اسراف (فضول خرچی) اور غرور (گھمنڈ و تکبر) سے بچو۔" (سنن نسائی) اسراف کی ممانعت صرف کھانے پینے کے ساتھ خاص نہیں۔ عبادات، معاملات، بات چیت بلکہ تمام امور میں اعتدال اور میانہ روی اختیار کرنے سے انسان مصائب اور اکتاہٹ کا شکار نہیں ہوتا اور خاص طور پر عبادت میں اُسے دوام نصیب ہوتا ہے کہ ہر کام حد میں رہ کر کرنے سے یومیہ معمولات میں فرق نہیں آتا۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے بندوں کو کھانے اور پینے کا حکم دیا ہے اس لئے کہ اس کے بغیر آدمی زندہ نہیں رہ سکتا اور انہیں حد اعتدال سے تجاوز کرنے سے منع کیا ہے، آیت میں "اسراف" سے اکل حرام، فضول خرچی اور کھانے پینے میں بد احتیاطی، کسی بھی کام میں حد سے تجاوز کرنا سبھی مراد ہیں، فضول خرچی اللہ ﷻ کو بہت نا پسند ہے اور یہ انسان کو فقیر اور محتاج بنا دیتی ہے۔ ایک حدیث شریف میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ آدمی اپنے پیٹ سے زیادہ کوئی بُرا برتن نہیں بھرتا ہے، ابن آدم کے لئے چند لقمے کافی ہیں، جو اس کی پیٹھ کو سیدھا رکھیں اور اگر اتنا ہی ضرور ہو تو ایک تہائی کھانے کے لئے ایک تہائی پینے کے لئے اور ایک تہائی سانس کے لئے۔ (مسند احمد، سنن نسائی، جامع ترمذی)

عملی پہلو: اللہ ﷻ حد اعتدال سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ نہ وہ یہ پسند کرتا ہے کہ آدمی کھانے پینے پہننے ہی کو مقصدِ حیات بنالے اور رات دن اسی کی حصول میں مشغول رہے اور نہ اسے یہ پسند ہے کہ وہ راہبوں اور جوگیوں کی طرح ان اسباب دنیوی سے اور اپنی ذمہ داریوں سے بھاگ کر کنارہ کش ہو جائے۔ یہ اسراف اور ترکِ دنیا، دونوں ہی شیطان کی نکالی ہوئی راہیں ہیں۔ اللہ ﷻ زندگی کے ہر پہلو میں عدل و میانہ روی کو پسند فرماتا ہے۔

آیت نمبر ۳۲: اس آیت میں خود ساختہ تصورِ عبادت اور ترکِ دنیا کی نفی کی گئی ہے۔ لوگوں کے حرام کر لینے سے اللہ ﷻ کی حلال کردہ چیزیں حرام نہیں ہو جاتیں۔ حلال اور پاکیزہ چیزیں اصلاً اہل ایمان کے لئے ہیں۔ دنیا میں کفار کو بھی نعمتوں سے فیض یاب ہونے کا موقع دیا گیا ہے۔ البتہ آخرت میں تمام نعمتیں صرف اہل ایمان کے لئے مختص ہوں گی۔

علمی بات: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے) تین شخص نبی اکرم ﷺ کی ازواج کے گھروں کے قریب آئے اور ازواجِ مطہرات سے رسول اللہ ﷺ کی عبادت کا حال پوچھا جب انہیں آپ علیہ السلام کی عبادت کی خبر دی گئی تو انہوں نے اسے کم سمجھا اور کہا "کہاں ہم اور کہاں نبی اکرم ﷺ ان کی تو اگلی پچھلی سب لغزشیں معاف ہو چکیں"۔ پھر ان میں سے ایک نے کہا "میں ہمیشہ ساری رات قیام کیا کروں گا"۔ دوسرے نے کہا "میں ہمیشہ روزے رکھا کروں گا، افطار نہ کروں گا" تیسرے نے کہا "میں عورتوں سے علیحدہ رہوں گا کبھی نکاح نہ کروں گا"۔ اتنے میں رسول اللہ ﷺ بھی تشریف لے آئے اور آپ ﷺ کو ان کی گفتگو کی خبر دی گئی۔ آپ ﷺ نے ان کے پیچھے جا کر ان سے فرمایا کیا تم ہی ہو جنہوں نے ایسا اور ایسا کہا تھا؟ سنو اللہ ﷻ کی قسم میں تم سب سے زیادہ اللہ ﷻ سے ڈرنے والا اور سب سے زیادہ متقی ہوں لیکن میں روزے رکھتا بھی ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں (یعنی نفل روزوں میں ناغہ کرتا ہوں) میں رات کو نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور میں عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں اب جس شخص نے میری سنت (طریقہ) سے بے رغبتی کی اس کا مجھ سے کوئی سروکار نہیں۔ (صحیح بخاری)

نوٹ: اس آیت میں ان لوگوں کو تنبیہ کی گئی ہے جو عبادات میں غلو اور اپنی طرف سے تنگیاں پیدا کرتے ہیں۔ اللہ ﷻ کی حلال کی ہوئی چیزوں کو اپنے اوپر حرام قرار دینے کو عبادت سمجھتے ہیں۔ جیسے بعض خود ساختہ طور پر لوگ ترک حیوانات یعنی جاندار اور جاندار سے حاصل ہونے والی غذاؤں گوشت، دودھ، گھی وغیرہ کو چھوڑ دینا روحانیت میں کمال کا ذریعہ سمجھتے ہیں یا جیسے مشرکین مکہ حج کے دنوں میں طواف کے وقت لباس پہننا جائز نہیں سمجھتے تھے اور جو غذائیں اللہ ﷻ نے حلال کی ہیں ان سے پرہیز کو عبادت جانتے تھے۔ کسی چیز کو حلال یا حرام ٹھہرانے کا حق صرف اس ذات کو ہے جس نے اس کو پیدا کیا ہے کسی اور کو اس میں مداخلت کا کوئی حق نہیں ہے۔

عملی پہلو: جب اللہ ﷻ کسی بندے کو اپنی نعمت و وسعت عطا فرمادے تو اللہ ﷻ اس بات کو پسند فرماتا ہے کہ اس نعمت کا اثر اس کے لباس وغیرہ سے ظاہر ہو، اس لئے کہ اظہار نعمت بھی شکر ہے۔ اس کے بالمقابل وسعت ہوتے ہوئے پھٹے پرانے یا میلے کچیلے کپڑے استعمال کرنا ناشکری ہے اسی طرح ایسے لباس سے بچنا ضروری ہے جس سے انسان کے اندر ریاکاری، نمود و نمائش اور فخر و تکبر پیدا ہوتا ہے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: اللہ ﷻ اپنے بندے پر اپنی نعمت کا اثر دیکھنا پسند کرتا ہے۔ (جامع ترمذی)

علمی بات: دنیا کی تمام نعمتیں، نفیس و عمدہ لباس، پاکیزہ اور صحت بخش غذائیں، اللہ ﷻ نے مومنوں ہی کے لئے پیدا کی ہیں تاکہ وہ ان سے فائدہ اٹھائیں، ان کو استعمال کر کے اللہ ﷻ کی عبادت کے لئے جسمانی طاقت و توانائی حاصل کریں اور اللہ ﷻ کا شکر ادا کریں۔ دوسرے لوگ تو انہی کے طفیل میں کھاتے پیتے اور پہنتے ہیں۔ یہ دنیا دار العمل ہے، دار الجزا نہیں، اس لئے دنیا کی نعمتوں میں کھرے کھوٹے اور اچھے برے کا امتیاز نہیں کیا جاسکتا بلکہ اللہ ﷻ کی نعمتوں کا یہ دستر خوان دنیا میں سب کے لئے عام ہے۔ اسی لئے اللہ ﷻ نے اپنی حکمت و مصلحت سے دنیاوی زندگی میں مومنوں کے ساتھ کافروں کو بھی نعمتوں میں شریک کر دیا تاکہ حجت پوری ہو جائے۔ آخرت میں ساری نعمتیں اور راحتیں صرف اللہ ﷻ کے فرماں بردار بندوں کے لئے مخصوص ہوں گی کیونکہ جنت اور جنت کی نعمتیں کافروں پر حرام ہیں۔

علمی بات: بعض مفسرین نے آیت کے یہ معنی بیان کیئے ہیں کہ دنیا میں ساری نعمتوں اور راحتوں کے ساتھ محنت و مشقت، پھر زوال کا خطرہ اور طرح طرح کے رنج و غم لگے ہوئے ہیں۔ خالص نعمت اور خالص راحت کا یہاں وجود نہیں۔ البتہ قیامت کے روز جس کو یہ نعمتیں ملیں گی وہ خالص ہو کر ملیں گی، نہ ان کے ساتھ کوئی محنت و مشقت ہو گی، نہ ان کے زوال یا نقصان کا کوئی خطرہ ہو گا اور نہ ان کے بعد کوئی رنج و مصیبت۔ پھر فرمایا کہ ہم اپنی قدرت کاملہ کی نشانیاں سمجھدار لوگوں کے لئے اسی طرح صاف صاف بیان کرتے ہیں جس طرح ہم نے حرام کو حلال سے جدا کر دیا تاکہ ہر عالم و جاہل سمجھ لے اور جو لوگ سرکشی اور حماقتوں میں مبتلا ہیں ان کا جاننا اور نہ جاننا برابر ہے۔

آیت نمبر ۳۳: اس آیت میں اللہ ﷻ کی حرام کردہ باتوں کا بیان ہے۔ پانچ حرام کردہ چیزوں کا ذکر ہے جن کا تعلق کھانے پینے سے نہیں بلکہ اعمال سے ہے۔ زمانہ جاہلیت میں اکثر لوگ ان جرائم اور محرمات میں مبتلا تھے جو درج ذیل ہیں:

۱۔ بے حیائی کے کام چاہے ظاہر ہوں یا پوشیدہ۔

۲۔ "اثم" وہ گناہ جو انسان کی ذات تک محدود ہو۔

۳۔ "بغی": وہ گناہ جس کا تعلق دوسروں کے معاملات اور حقوق سے ہو۔

۴۔ اللہ ﷻ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا۔

۵۔ بے سند و بے بنیاد باتیں اللہ ﷻ کی طرف منسوب کرنا۔

شانِ نزول: اس آیت کا سبب نزول ایک خاص قصّہ ہے اور وہ یہ ہے کہ دور جاہلیت میں دیگر رسوم جہالت کے ساتھ یہ بھی ایک بے حیائی کی رسم تھی کہ وہ بیت اللہ شریف کا برہنہ طواف کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ جن کپڑوں میں ہم نافرمانی کرتے ہیں ان میں طواف نہیں کر سکتے۔ دیکھیئے ظاہر میں تو کیسی خوبصورت بات ہے لیکن ان احمقوں نے جہالت میں یہ نہ سمجھا کہ برہنہ طواف کرنے میں کس قدر بے حیائی اور بیت اللہ شریف کی بے ادبی ہے۔

علمی بات: ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس اللہ ﷻ کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہو ورنہ قریب ہے کہ اللہ ﷻ تم لوگوں پر عذاب بھیج دے اور تم اس سے دعائیں مانگو اور وہ قبول نہ کرے۔ (جامع ترمذی)

ایک اور حدیث میں حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے نیکی اور گناہ کے بارے میں پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ نیکی خوش خلقی کا نام ہے اور گناہ وہ کام ہے جو تمہارے دل میں تردد پیدا کرے اور تم اس بات کو پسند نہ کرو کہ لوگ تمہارے اس کام سے مطلع ہو جائیں۔ (صحیح مسلم)

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ جن چیزوں کو تم نے اپنے طور پر حرام ٹھہرا لیا ہے وہ تو حرام نہیں البتہ بے حیائی کے تمام کام خواہ وہ ظاہر ہوں، جیسے ننگے ہو کر طواف کرنا، یا چھپے ہوئے ہوں جیسے بدکاری، گناہ کے کام بشمول شراب وجوا کسی پر ناحق ظلم کرنا، کسی کو اللہ ﷻ کے ساتھ شریک ٹھہرانا اور جس بات کی تمہارے پاس کوئی دلیل و سند نہ ہو اس کو اللہ ﷻ کی طرف منسوب کرنا یہ سب حرام ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو چیزیں واقعتاً حلال ہیں ان کو تو تم نے حرام سمجھ رکھا ہے اور جو چیزیں حرام ہیں ان کو تم حلال سمجھتے ہو۔ یہ نری جہالت ہے۔

آیت نمبر ۳۴: اس آیت میں مجرموں کے انجام بد کا بیان ہے۔ "وقت مقرر" سے مراد عمل کرنے کی وہ مہلت ہے جو ہر قوم کو آزمانے کے لئے عطا کی جاتی ہے۔ کسی قوم کی اجتماعی زندگی کا وقت پورا ہو جانے پر مزید مہلت دیئے جانے کی نفی کی گئی ہے۔ قوموں کا وقتِ مقرر بیان کر کے مشرکین کو تنبیہ کی جارہی ہے۔ اسی طرح ہر فرد کا وقتِ مقرر ہے اور اس کے آنے تک اس کو عمل کی مہلت ملی ہوئی ہے۔

شانِ نزول: یہ آیت اس موقع پر نازل ہوئی جب لوگوں نے عذاب کا سوال کیا یعنی یوں کہا کہ اگر آپ ﷺ اللہ ﷻ کے سچے رسول ہیں تو اللہ ﷻ ہم پر عذاب کیوں نہیں بھیجتا اور ہلاک کیوں نہیں کر دیتا۔

علمی بات: یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ دنیا میں اللہ ﷻ کے نافرمان اور مجرم ہر طرح کی سرکشی اور ظلم کے باوجود اللہ ﷻ کی نعمتوں میں پل رہے ہیں۔ بظاہر ان پر کوئی عذاب اور تکلیف و تنگی نظر نہیں آتی۔ یہ محض اللہ ﷻ کی طرف سے ان کے لئے مہلت اور ڈھیل ہے تاکہ وہ توبہ کر کے اپنی حرکتوں سے باز آجائیں۔ اللہ ﷻ کے علم میں اس مہلت اور ڈھیل کا ایک وقت مقرر ہے۔ جب وہ مقررہ وقت آپہنچتا ہے تو وہ ایک لمحہ کے لئے بھی آگے پیچھے نہیں ہوتا خواہ وہ اس وقت مہلت کے طالب ہوں یا اس مقررہ وقت سے پہلے نزول عذاب چاہتے ہوں۔ نیز اس وقت کوئی توبہ اور معذرت قبول نہیں ہوتی بلکہ ان کو عذاب میں پکڑ لیا جاتا ہے۔ کبھی تو دنیا میں ہی عذاب دے دیا جاتا ہے اور اگر اللہ ﷻ کسی مصلحت کے تحت ان کو دنیا میں عذاب نہ دے تو ایسے لوگ مرتے ہی عذاب میں داخل ہو جاتے ہیں۔

عملی پہلو: اس سے پہلی آیت میں اللہ ﷻ نے بتایا تھا کہ انسان پر اللہ ﷻ نے کیا کیا کام حرام کیئے ہیں اور اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ اس کی زندگی کا ایک وقت معین ہے اور جب وہ وقت آجائے گا تو اس پر لا محالہ موت آجائے گی اور اس کو چونکہ موت کا وقت بتایا نہیں گیا اس لئے وہ ہر وقت اس کے لئے تیار رہے اور حرام کاموں سے بچتا رہے، ایسا نہ ہو کہ وہ کسی حرام کام میں مشغول ہو اور وہ اس کی موت کا وقت ہو وہ اس کے لئے تیار نہ ہو اور بُری موت کا شکار ہو کر عذابِ الٰہی کا مستحق بن جائے۔ (اَللّٰھُمَّ احْفَظْنَا، اللہ ﷻ ہمیں محفوظ فرمائے)

آیت نمبر ۳۵: انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات پر ایمان لا کر تقوی اور عمل صالح سے آراستہ ہونے والوں کے لئے بشارت دی گئی ہے کہ انہیں نہ مستقبل کا خوف ہو گا اور نہ وہ اپنے سابقہ اعمال پر غمگین ہوں گے۔

علمی بات: انبیاء کرام علیہم السلام کو بھیجے جانے کا مقصد یہ ہے کہ وہ لوگوں کو اللہ ﷻ کے احکام سنائیں اور وہ رسول بھی ان ہی میں سے ہوں گے لہذا جس نے رسول کی بات مان کر ان کی تصدیق کی اور گناہوں کو چھوڑ کر اپنی اصلاح کر لی تو پھر وہ اللہ ﷻ کے فضل سے جنت میں جائے گا۔

عملی پہلو: اس سے پہلی آیت میں انسانوں کی زندگی کے بعد ان کی موت کا ذکر فرمایا تھا۔ اب بتایا ہے کہ اگر انہوں نے اپنی زندگی میں اللہ ﷻ کے احکام کی پابندی کی ہو گی تو مرنے کے بعد انہیں کوئی خوف اور غم نہیں ہو گا اور اگر انہوں نے اپنی یہ زندگی سرکشی اور احکامِ الٰہی کے خلاف گزاری ہو گی تو پھر مرنے کے بعد انہیں دائمی عذاب کے لئے دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔

علمی بات: اگر زمین میں انسانوں کے بجائے فرشتے آباد ہوتے تو نبی بھی فرشتہ ہی آتا۔ کیونکہ نبی تو داعی اور مبلغ ہوتا ہے اور کسی قوم کو تبلیغ وہی کر سکتا ہے جو اُس قوم کی زبان اور اس کے طور طریقوں سے واقف ہو۔ ان کے حالات سے باخبر ہو اور یہ تب ہی ممکن ہے جب نبی اسی قوم سے ہوں البتہ نبی افضل ترین اور اشرف ترین انسان ہوتا ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ کفار فرشتوں کو انسان سے افضل سمجھتے اور کہتے تھے کہ فرشتہ نبی کیوں نہ ہوا۔ حالانکہ نیک انسان فرشتوں سے افضل ہے اور فرشتوں نے اللہ ﷻ کے حکم سے انسان کو سجدہ تعظیمی کیا تھا تاکہ انسان کی فضیلت اور بڑائی فرشتوں پر ظاہر ہو۔

آیت نمبر ۳۶: اس آیت میں اللہ ﷻ کے حکم کو جھٹلانے اور تکبر کرنے والے سرکشوں کے انجام کا بیان ہے کہ وہ جہنم میں ہمیشہ کے عذاب سے دوچار ہوں گے۔ اہل ایمان اور اہل کفر کے انجام کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ لوگ اچھے انجام والوں کا طریقہ اپنائیں اور برے انجام والوں کی روش اور طریقے سے بچیں تاکہ بُرے انجام سے اور سزا سے محفوظ رہ سکیں۔

علمی بات: جو اللہ ﷻ کی آیتوں کو جھٹلائیں گے اور اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں ان سے اعراض و روگردانی برتیں گے، وہ دوزخ کی آگ کے ساتھی اور اس کے یار ہوں گے، اور ان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسی میں رہنا ہو گا۔

آیت نمبر ۳۷: سب سے بڑا ظالم وہ شخص ہے جو جھوٹی نبوت کا دعویٰ کرتا ہے، خود باتیں گھڑ کر اللہ ﷻ کی طرف منسوب کرتا ہے اور رسولوں کی تکذیب کے ساتھ ساتھ اللہ ﷻ کی نازل شدہ آیات کا انکار کرتا ہے۔ یہ مجرم لوگ موت کے وقت اپنے خلاف خود گواہی دیں گے اور اپنے کفر کا اعتراف کریں گے۔

علمی بات: اللہ ﷻ پر جھوٹ گھڑنے والوں اور اس کی آیتوں کو جھٹلانے والوں کا مزید حال بیان کیا جا رہا ہے کہ ان سے بڑا کوئی ظالم نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود ان کے لئے دنیا میں جو عمر، روزی اور اعمال دیئے گئے ہیں انہیں وہ اللہ ﷻ کی طرف سے ضرور پائیں گے پھر جب ان کی موت کا وقت آجائے گا اور فرشتے ان کی

روحوں کو قبض کر کے جہنم کی طرف لے جائیں گے تو بطور ڈانٹ ڈپٹ ان سے کہیں گے کہ کہاں ہیں تمہارے وہ معبود جن کی تم عبادت کرتے تھے آج وہ تمہیں اس عذاب نار سے کیوں نہیں بچا لیتے ؟ تو وہ جواب دیں گے کہ وہ غائب ہو گئے اور اب ہمیں ان سے کوئی امید نہیں ہے اور اپنے بارے میں اعتراف کریں گے کہ واقعی ہم دنیا میں کافر تھے۔

آیت نمبر ۳۸: انسانوں کی طرح جنات کو بھی محاسبہ کے عمل سے گزرنے کے بعد جنت یا دوزخ کا ٹھکانہ ملے گا۔ جہنم میں پہنچنے کے بعد سب ایک دوسرے کو ملامت کریں گے۔ بعد والے پہلوں کو اپنی گمراہی کے لئے مورد الزام ٹھہرائیں گے۔ گناہ میں برابر شریک ہونے کی وجہ سے سب کو دگنا عذاب دیا جائے گا۔ جو لوگ دنیا میں اللہ ﷻ پر افترا باندھتے تھے، قیامت کے روز اللہ ﷻ ان سے فرمائے گا کہ تم دوزخ میں داخل ہو کر اپنے جیسے ان گروہوں میں شامل ہو جاؤ جو تم سے پہلے گزرے ہیں خواہ وہ جنات میں سے ہوں یا انسانوں میں سے۔ پھر جب بھی کوئی گروہ دوزخ میں داخل ہو گا تو وہ دوسرے گروہ کو لعنت وملامت کرنے لگے گا جو ان ہی کی طرح گمراہ ہو گا اور جن کی پیروی کی وجہ سے یہ گروہ گمراہ ہوا یہاں تک کہ جب سب لوگ دوزخ میں جمع ہو جائیں گے تو بعد میں داخل ہونے والے اللہ ﷻ سے ان لوگوں کی شکایت کریں گے جو ان سے پہلے دوزخ میں داخل ہوئے تھے اور جن کی اتباع کر کے یہ لوگ گمراہ ہوئے اور کہیں گے کہ اے ہمارے رب! ان ہی لوگوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا، اس لئے ان کو دوزخ میں دوگنا عذاب دے۔ اللہ ﷻ فرمائے گا کہ صرف انہی کو نہیں بلکہ تم میں سے ہر ایک کو دوگنا عذاب ہو گا، لیکن تمہیں ابھی اس کا علم نہیں۔

علمی بات: پہلوں کو دگنا عذاب دینے کی وجہ یہ ہے کہ وہ خود گمراہ ہوئے باوجود اس کے کہ ان کے پاس انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کے نائبین نے واضح دلائل سے حق اور باطل کو واضح کر دیا پھر بھی انہوں نے اہلِ حق کو چھوڑ کر گمراہوں کی اتباع کی اور بعد میں آنے والوں کو گمراہ کیا۔ اس طرح بعد والوں کو دہرا عذاب دینے کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے گمراہی کا راستہ اختیار کیا اور سابقہ امتوں کے حالات سے عبرت حاصل نہیں کی بلکہ ان کی اندھی تقلید اور پیروی کی۔

آیت نمبر ۳۹: جب گمراہ لوگوں کو اللہ ﷻ کی طرف سے دُگنے عذاب کی خبر سنادی جائے گی تو اللہ ﷻ کے اس جواب کے بعد پہلی جماعت بعد والی جماعت سے کہے گی کہ اللہ ﷻ کے فیصلے کے بعد اب تمہیں ہم پر کوئی فضیلت و فوقیت نہیں رہی کہ ہمارے مقابلہ میں عذاب کم دیا جائے۔ ہم بھی دوچند عذاب میں مبتلا ہیں اور تم بھی دوچند عذاب میں مبتلا ہو گئے۔ پس گمراہی اور کفر میں ہم دونوں برابر ہو گئے۔ لہٰذا تم بھی اپنے کفر کے بدلے ہماری طرح عذاب کا مزہ چکھو۔ بہر حال ہر شخص اپنے اپنے کرتوتوں کا مزہ چکھے گا کوئی فریق نہیں بچ سکے گا۔

علمی بات: اہل دوزخ کی اس باہمی تکرار کو قرآنِ حکیم میں کئی جگہ بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۃ سبا آیات: ۳۱ تا ۳۳ میں ارشاد ہوتا ہے کہ " کاش تم دیکھ سکو اس موقع کو جب یہ ظالم اپنے رب کے حضور کھڑے ہوں گے اور ایک دوسرے پر باتیں بنا رہے ہوں گے۔ جو لوگ دنیا میں کمزور بنا کر رکھے گئے تھے وہ ان لوگوں سے جو بڑے بن کر رہتے تھے، کہیں گے کہ اگر تم نہ ہوتے تو ہم مومن ہوتے۔ وہ بڑے ان کمزور بنائے ہوئے (یعنی ماتحت) لوگوں کو جواب دیں گے کیا ہم نے تم کو ہدایت سے روک دیا تھا جب کہ وہ تمہارے پاس آئی تھی؟ نہیں، بلکہ تم خود مجرم تھے۔" مطلب یہ ہے کہ تم خود کب ہدایت کے طالب تھے؟ اگر ہم نے تمہیں دنیا کی لالچ دے کر اپنا بندہ بنایا تو تم لالچی تھے جبھی تو ہماری باتوں میں آکر ہمارے دام میں گرفتار ہوئے۔

آیت نمبر ۴۰: اس آیت میں اللہ ﷻ کی آیات کو جھٹلانے والوں اور تکبر کرنے والوں کا بیان ہے۔ ان کے لئے آسمان میں جنت کے دروازے نہیں کھولے جاتے۔ ان کے اعمال، دعا اور ارواح کو واپس زمین پر لوٹا دیا جاتا ہے۔ جس طرح اونٹ کا سوئی کے ناکے سے گزرنا ممکن نہیں اسی طرح اہل کفر کا جنت میں جانا ممکن نہیں۔

علمی بات: ابو داؤد، سنن نسائی، ابن ماجہ اور مسند احمد میں نبی مکرم ﷺ کا ارشاد نقل کیا گیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ایک صالح مومن بندے کی جب موت کا وقت آتا ہے تو ملک الموت کے ساتھ حسین و جمیل فرشتے اس کے پاس آتے ہیں جنت کا کفن اور خوشبو ان کے ساتھ ہوتی ہے ملک الموت کہتے ہیں کہ اے نفس مطمئنہ باہر نکل۔ تو اللہ ﷻ سے خوش رہا اور اللہ ﷻ تجھ سے خوش رہا چل اللہ ﷻ کی جنت کی طرف۔ اس کے برخلاف جب کافر بندہ دنیا سے جانے اور آخرت کا رخ کرنے والا ہوتا ہے تو سیاہ چہروں والے فرشتے آسمان سے اس کے پاس آتے ہیں، جن کے پاس ٹاٹ ہوتے ہیں اور اس سے اتنی دور بیٹھ جاتے ہیں، جہاں تک اسکی نظر پہنچتی ہے، پھر ملک الموت تشریف لاتے ہیں حتی کہ اس کے سر کے پاس بیٹھ جاتے ہیں، پھر کہتے ہیں کہ اے خبیث جان! اللہ ﷻ کی ناراضگی کی طرف نکل، ملک الموت کا یہ فرمان سن کر روح، اس کے جسم میں ادھر ادھر بھاگی پھرتی ہے لہٰذا ملک الموت اس کی روح کو جسم سے اس طرح نکالتے ہیں جیسے بوٹیاں بھوننے کی سیخ بھیگے ہوئے اون سے صاف کی جاتی ہے (یعنی کافر کی روح کو جسم سے زبردستی اس طرح نکالتے ہیں جیسے بھیگا ہوا اون کانٹے دار سیخ پر لپٹا ہوا ہو اور اس کو زور سے کھینچا جائے)

پھر اس کی روح کا ملک الموت (اپنے ہاتھ میں) لے لیتے ہیں۔ "لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ" کا مطلب یہی ہے کہ کفار کی ارواح کو آسمان کی طرف فرشتے لے جاتے ہیں تو ان کے لئے دروازے نہیں کھولے جاتے، اور ان کو وہی سے پھینک دیا جاتا ہے۔

آیت نمبر ۴۱: اس آیت میں کفار کے انجام بد کا بیان ہوا ہے ("مهد" گہوارے کو کہتے ہیں جو بیٹھنے یا لیٹنے کی جگہ ہوتی ہے۔ "غواش" غاشیہ کی جمع ہے جس سے مراد وہ پردہ ہے جو اوپر سے ڈھانپ لے، اوپر اوڑھنے والی چیز) کفار پر اوپر اور نیچے ہر طرف عذابِ الٰہی کی آگ بھڑک رہی ہو گی۔ انہیں کسی پہلو چین اور قرار نصیب نہ ہو گا۔ ان کا مستقل ٹھکانہ جہنم ہے۔

آیت نمبر ۴۲: کفار کے انجام بد کے بیان کے بعد ایمان اور عمل صالح اختیار کرنے والوں کو ہمیشہ کی جنت کی بشارت دی گئی ہے نیز ذکر کیا گیا ہے کہ اللہ ﷻ نے بندوں پر کوئی ایسے احکام نازل نہیں فرمائے جو ان کی استطاعت سے باہر ہوں۔ ایسا ہرگز نہیں کہ اللہ ﷻ نے جن کاموں کا حکم دیا انہیں انجام دینا یا جن کاموں سے روکا ہے ان سے خود کو بچائے رکھنا انسان کی سکت و بس میں نہ ہو نیز یہ بات بھی واضح ہوئی ہے کہ آخرت کا محاسبہ ہر فرد کی صلاحیتوں اور دنیا میں دی گئی نعمتوں اور کوششوں کے مطابق ہو گا۔

علمی و عملی بات: اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایمان اعمال پر مقدم ہے۔ پہلے مومن بنو۔ پھر نیک کام بھی کرو۔ مزید برآں کوئی شخص نیک اعمال سے بے نیاز نہیں خواہ کسی طبقہ اور کسی شعبے سے تعلق رکھتا ہو۔ یعنی ہر مسلمان اپنی طاقت کے مطابق نیک اعمال کرنے اور جنت کے حصول کی محنت کرن کا پابند ہے۔

آیت نمبر ۴۳: اس آیت میں اہل جنت کے دو خاص احوال بیان ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ جنت میں داخلے سے پہلے ہی ان کی باہمی رنجشوں کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔ دوسرا یہ کہ اہل ایمان جنت میں پہنچ کر اللہ ﷻ کی حمد اور اس کا شکر ادا کریں گے جس نے انہیں مقام رحمت تک پہنچایا۔ اہل یمان کو ان کی اخلاص نیت، ایمان اور اعمال صالحہ کے بدلے جنت بطور ورثہ عطا کی جائے گی۔ اللہ ﷻ کی شانِ کریمی ہے کہ اُس کی طرف سے اہل ایمان کے لئے جنت کے وارث ہونے کا اعلان کیا جائے گا۔

علمی بات: حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب اہل جنت جنت کے دروازے پر پہنچیں گے تو انہیں دو نہریں نظر آئیں گی اور انہیں از خود خیال پیدا ہو گا ایک کا وہ پانی پئیں گے تو ان کے دلوں میں جو کچھ تھا سب دور ہو جائے گا دوسری میں غسل کریں گے جس سے چہرے تر و تازہ، ہشاش بشاش ہو جائیں گے۔

فرمان نبوی ﷺ: آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب مومنین دوزخ سے نجات پا جائیں گے، تو جنت اور دوزخ کے درمیان ایک پل پر روک دیئے جائیں گے اور ان ظلموں کا بدلہ لیا جائے گا، جو ان لوگوں نے دنیا میں ایک دوسرے کے ساتھ کئے تھے، یہاں تک کہ جب وہ پاک صاف ہو جائیں گے، تو انہیں جنت میں داخلہ کی اجازت دی جائے گی۔ (صحیح بخاری)

علمی بات: اہل ایمان کے بیچ اگر دنیا میں کسی وجہ سے ناراضگی یا غلط فہمی کی بنا پر رنجش پیدا ہو گئی تھی تو جنت میں داخل ہونے سے پہلے ان کی آپس کی غلط فہمیاں اور رنجشیں دور کر دی جائیں گی اور وہ ایک دوسرے کے سچے خیر خواہ اور مخلص دوست بن کر جنت میں داخل ہوں گے۔ تاکہ ایک دوسرے سے مل کر کیف و سرور اور خوشی محسوس کریں کیونکہ جن سے کوئی رنجش ہو ان کو دیکھنے سے اذیت ہوتی ہے۔ اس سے اہلِ جنت کے دلوں کو کینہ و بغض سے پاک کر دیا جائے گا۔ بخلاف دوزخیوں کے کہ وہ مصیبت کے وقت ایک دوسرے کو لعن طعن کریں گے۔

اس آیت کو پڑھ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا: "مجھے امید ہے کہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں سے ہوں گے جن کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی" یعنی روز قیامت ہماری خلش اور غلط فہمی بھی دور ہو جائے گی جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی وجہ سے پیدا ہوئی۔

علمی بات: اہلِ جنت کے دلوں سے کینہ نکالنے کا ایک اور مفہوم یہ بھی ہے کہ ان میں سے بعض، بعض کے ساتھ ان کی قرابت اور درجات کی فضیلت کے سبب حسد و رشک نہیں کریں گے۔ ہر کوئی اپنے آپ کو اور دوسرے کو جس مقام پر بھی ہے دیکھ کر خوش و خرم ہو گا۔

آیت نمبر ۴۴: اس آیت میں اہل جنت اور اہل جہنم کے مکالمہ کا بیان ہے۔ وعدہ سے مراد اہل ایمان کے لئے جنت اور کفار و مشرکین کے لئے جہنم کا وعدہ ہے۔ ظالموں پر دنیا و آخرت میں اللہ ﷻ کی لعنت اور پھٹکار ہے۔

علمی بات: جب اہل جنت، جنت میں چلے جائیں گے اور اہل دوزخ، دوزخ میں چلے جائیں گے تو جنت والے اپنی خوشی ظاہر کرنے کے لئے ان سے پکار کر کہیں گے کہ ہمارے رب نے ہم سے جس اجر و ثواب اور جنت کا وعدہ فرمایا تھا، وہ ہمیں عطا فرما دیا ہے۔ کیا تم اپنے کفر و عصیان کی بنا پر اس عذاب میں مبتلا ہو جس کی تمہارے رب نے انبیاء کرام علیہم السلام کے ذریعہ تمہیں وعید سنائی تھی؟ اہل دوزخ جواب دیں گے کہ ہاں۔ اسی بنا پر تو ہم عذاب میں مبتلا ہیں۔ اس وقت ایک پکارنے والا دونوں

کے درمیان پکار کر کہے گا کہ ظالموں اور اللہ ﷻ کی راہ سے روگردانی کرنے والوں پر اللہ ﷻ کی لعنت ہو، جو آخرت کے انجام سے بے فکر ہو کر خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی راہ حق سے روکتے رہے۔ یہ لوگ آخرت کے منکر تھے۔ صرف دنیاوی زندگی ہی ان کے پیش نظر تھی۔

علمی بات: نبی کریم ﷺ نے فرمایا جنت میں جو بھی داخل ہو گا اسے اس کا جہنم کا ٹھکانا بھی دکھایا جائے گا کہ اگر اس نے نافرمانی کی ہوتی (تو اس کا یہ ٹھکانہ ہوتا) تاکہ وہ اور زیادہ شکر کرے اور جو بھی جہنم میں داخل ہو گا اسے اس کا جنت کا ٹھکانا بھی دکھایا جائے گا کہ اگر اچھے عمل کئے ہوتے (تو یہاں ٹھکانہ ہوتا) تاکہ اس کے لئے حسرت وافسوس کا باعث ہو۔ (صحیح بخاری)

آیت نمبر ۴۵: اس آیت میں ظالموں کی بداعمالیوں کا بیان ہے۔ وہ خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور لوگوں کو بھی اللہ ﷻ کی راہ سے روکتے ہیں۔ وہ آخرت کے منکر ہوتے ہیں۔

علمی بات: منکرین خود تو ایمان نہیں لائے تھے، بلکہ دوسرے لوگوں کو بھی اس راستے سے روکنے کی حتی الوسع کوشش کرتے تھے۔ اگر کسی شخص کو رسول اللہ ﷺ کی مجلس کی طرف جاتے دیکھتے تو اسے ورغلانے اور بہکانے کے درپے ہو جاتے تاکہ کہیں وہ آپ ﷺ کی باتوں سے متاثر ہو کر ایمان نہ لے آئے۔

علمی بات: اللہ ﷻ کے دین میں کجی تلاش کرنا۔ مشرکین مکہ کا یہی وطیرہ تھا۔ وہ دین اسلام پر طرح طرح کے اعتراض اٹھاتے تھے۔ اسی طرح مدینہ منورہ میں یہودی آپ ﷺ کی نبوت ورسالت کا اقرار نہیں کرتے تھے اور ایسی ایسی باتیں نکالتے جو درحقیقت قابل اعتراض نہ تھیں لیکن انہیں بطور اعتراض عوام کے سامنے لاتے تھے تاکہ وہ اسلام قبول نہ کریں۔ آج تک یہود ونصاریٰ اور دیگر کفار اس کام میں لگے ہوئے ہیں کہ اسلام میں عیب نکالیں۔ انہیں مسلمانوں کی پاکیزہ شریعت اور پاکیزہ زندگی پر اعتراض ہے۔ جن قوموں میں زناکاری عام ہے اور نکاح کرنا عیب ہے انہیں اسلام پر یہ اعتراض ہے کہ اس میں تعدّد ازواج یعنی ایک سے زائد شادیوں کی اجازت ہے یہ کیسی الٹی سمجھ ہے کہ ناجائز دوستیاں تو جتنی چاہیں رکھ لی جائیں لیکن ایک سے زیادہ بیویاں جو اللہ ﷻ کی شریعت میں حلال ہے اس پر اعتراض ہے۔ لیکن ایسے لوگ کبھی بھی اپنی سازشوں میں کامیاب نہیں ہوئے کیونکہ دین اسلام فطرت انسانی کے عین مطابق ہے۔

آیت نمبر ۴۶: اس آیت میں مقام اعراف کا ذکر ہے یعنی جنت اور دوزخ کے درمیان دیوار جہاں سے دونوں طرف دیکھا جاسکے گا۔ اہل جنت اور اہل جہنم کے علاوہ تیسری جماعت ہو گی جو اعراف پر مقیم ہو گی۔ ان کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہوں گی۔ ان کی نیکیاں انہیں جہنم میں جانے اور برائیاں جنت میں جانے میں مانع ہوں گی۔ اہل اعراف اہل جنت کو ان کی نورانی چہروں کی بدولت اور اہل دوزخ کو ان کی سیاہ رنگت کی بنا پر پہچان لیں گے۔ اہل اعراف کا اہل جنت کو سلام پیش کرنے اور خود بھی جنت میں داخلہ کی امید رکھنے کا بیان ہے۔

علمی بات: "اَعْرَاف" کو اعراف کہنے کی وجہ یہ ہے اہل اعراف ہر شخص کو اوپر سے دیکھ کر پہنچان لیں گے کہ یہ جنتی ہے اور یہ دوزخی ہے۔

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے کسی نے پوچھا کہ اصحاب اعراف کون ہیں؟ فرمایا وہ لوگ ہیں جن کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہیں برائیوں نے جنت میں جانے سے روکا، اور نیکیوں نے جہنم کی آگ سے بچایا۔ سو وہ اس دیوار پر ٹھہریں گے جب تک کہ اللہ ﷻ ان کے حق میں فیصلہ نہ فرمادے۔

علمی بات: یوں تو اعراف والے جنت اور جہنم دونوں کا خود نظارہ کر رہے ہوں گے، اس لئے انہیں جنتیوں اور دوزخیوں کو پہچاننے کے لئے کسی علامت کی ضرورت نہیں ہو گی لیکن یہاں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ یہ لوگ جنت اور دوزخ والوں کو دنیا میں بھی ان کی علامتوں سے پہچانتے تھے اور چونکہ یہ لوگ صاحب ایمان تھے، اس لئے انہیں دنیا میں بھی اللہ ﷻ نے اتنی حس عطا فرمادی تھی کہ یہ متقی پرہیزگار لوگوں کے اور اسی طرح کافروں کو ان کے چہروں سے پہچان لیتے تھے۔

آیت نمبر ۴۷: اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اصحاب الاعراف اہل دوزخ کے عذاب اور مصیبت کا مشاہدہ کرنے کے بعد۔ دوزخیوں کی سزا سے وحشت زدہ اور متنفر ہو کر ان میں شامل نہ کیئے جانے کی دعا کریں گے۔

علمی بات: جنت کے نظارے کے بعد ان کو جہنم کا منظر بھی دکھایا جائے گا کہ اب ذرا جہنمیوں کی کیفیت کا بھی مشاہدہ کر لو۔ یہ لوگ ابھی تک بین الخوف و الرجاء (خوف اور اُمید کے درمیان) کی کیفیت میں ہوں گے۔ انہیں جنت میں داخلے کی امید بھی ہو گی اور جہنم میں جھونکے جانے کا خوف بھی۔ اس لئے جب وہ اہل جنت کی طرف دیکھیں گے تو انہیں سلام کریں گے اور ساتھ ہی ان کے دلوں میں اُمنگیں اور تمنائیں جاگ جائیں گی کہ اللہ ﷻ ہمیں بھی ان کے ساتھ شامل کر دے۔ لیکن دوسری طرف جب اہل جہنم پر نظر پڑے گی تو فریاد کریں گے کہ پروردگار! ہم پر رحم فرما اور ہمیں ان ظالم لوگوں کا ساتھی نہ بنا۔

آیت نمبر ۴۸: اس آیت میں اصحابِ اعراف اہل دوزخ کو ان کی بداعمالیوں پر ملامت کریں گے۔ دنیا کی جمعیت و کثرت اور تکبر، آخرت میں اہل دوزخ کو کوئی فائدہ نہ دے پائے گا۔

فرمانِ نبوی ﷺ: سیدنا حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "قیامت کے دن اہل دوزخ میں سے اس شخص کو لایا جائے گا جو دنیا میں سب سے زیادہ آسودہ اور خوشحال تھا، پس اسے دوزخ میں ایک بار غوطہ دیا جائے گا، پھر اس سے پوچھا جائے گا کہ اے آدم کے بیٹے! کیا تو نے دنیا میں کبھی آرام دیکھا تھا؟ وہ کہے گا کہ اللہ کی قسم، اے میرے رب! کبھی نہیں۔" (صحیح مسلم)

علمی بات: قیامت کے روز اعراف والے، مشرکین کے سرداروں کو دوزخ میں دیکھ کر ملامت کے طور پر ان سے کہیں گے کہ دنیا میں جس مال و دولت اور جماعت و کثرت پر تمہیں بھروسہ اور ناز تھا اور جس کی وجہ سے تم غرور و تکبر میں مبتلا تھے اور انبیاء کرام علیہم السلام کی اتباع سے انکار کرتے تھے، آج وہ تمہارے کسی کام نہ آیا۔

علمی بات: اہل جنت و جہنم کی علامات: صحیح مسلم کی ایک روایت ہے جس کا مفہوم ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا کہ حضور ﷺ آپ ہمیں قیامت کے دن کس طرح پہچانیں گے، فرمایا کسی کے گھوڑے اگر پنج کلیان ہوں (یعنی گھوڑے کی پیشانی اور اس کے چاروں پاؤں اگر سفید ہوں تو انہیں پنج کلیان کہا جاتا ہے) تو کیا باقی گھوڑوں میں سے انہیں پہچاننا مشکل ہے ظاہر ہے کہ ان کا پہچاننا مشکل نہیں بلکہ ان علامتوں سے باقی گھوڑوں میں سے ان کو آسانی سے پہچان لیا جائے گا اسی طرح اللہ ﷻ نے اس امت کے نیک لوگوں اور نمازیوں کو پنج کلیان بنایا ہے یعنی ہم جو اپنے اعضاء وضو میں دھوتے ہیں یعنی چہرہ ,دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں یہ پانچوں اعضاء قیامت کے دن نہایت روشن ہوں گے۔ ان اعضا کی روشنی سے رسول اللہ ﷺ اپنی امت کے نیک لوگوں کو پہچانیں گے اور اہل جنت بھی انہی علامتوں کے ساتھ جنت میں داخل کیئے جائیں گے اور ہر دیکھنے والا انہیں انہی علامتوں سے پہچانے گا قرآنِ حکیم سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن صاحب ایمان لوگوں کے چہرے نہایت روشن اور تروتازہ ہوں گے۔ لیکن اس کے برعکس کافروں کے چہرے نہایت سیاہ اور مکروہ ہوں گے اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان میں جو بڑے بڑے کفار ہوں گے جنہوں نے ائمہ کفر کی طرح اپنا کردار ادا کیا ہوگا وہ اپنے چہروں کی بڑھی ہوئی سیاہی اور چہروں پر پڑی ہوئی لعنت اور پھٹکار سے پہچانے جائیں گے۔ جتنا بڑا کافر ہوگا اس کا چہرہ اتنا ہی زیادہ سیاہ اور مکروہ ہوگا۔ ایسی ہی علامتوں سے اصحاب اعراف ان اہل جہنم کے بڑے بڑے کافروں کو پہچانیں گے اور پھر ان سے مختلف سوالات کریں گے۔

آیت نمبر ۴۹: اس آیت میں اصحاب الاعراف کے ذریعہ اہل دوزخ کو جھوٹ، تکبر اور غلط تصورات پر ملامت کرنے کا بیان ہے۔ اہل دوزخ دنیا میں اہل ایمان کو فقیر، مسکین اور غلام کہہ کر حقیر سمجھتے تھے جبکہ معاملہ یہ ہے کہ اہل ایمان کو بلاخوف و خطر جنت میں داخلہ کی بشارت دی گئی ہے۔

اہل اعراف جنت کی طرف دیکھیں گے تو اس کے اندر غریب اور کمزور لوگ نظر آئیں گے جن سے کافر دنیا میں استہزاء اور مذاق کرتے تھے اور ان کو ایذا دیتے تھے۔ اس وقت اہل اعراف کافر سرداروں کو دوزخ میں دیکھ کر کہیں گے کہ کیا یہ وہی کمزور و حقیر لوگ ہیں جن کے بارے میں تم قسمیں کھا کر کہتے تھے کہ اللہ ﷻ کی رحمت انہیں کبھی نہیں پہنچے گی اور نہ اللہ ﷻ کبھی ان کی مغفرت فرمائے گا۔

علمی بات: اصحاب اعراف کو جنت والوں میں فقراء صحابہ رضی اللہ عنہم بھی نظر آئیں گے' وہاں وہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو بھی دیکھیں گے، وہاں ان کی نظر حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ اور حضرت یاسر رضی اللہ عنہ پر بھی پڑے گی۔ چنانچہ وہ ان اہلِ جنت کی طرف اشارہ کر کے جہنمیوں سے پوچھیں گے کہ کیا یہی وہ لوگ تھے جن کے بارے میں تم قسمیں کھا کھا کر کہا کرتے تھے کہ ان لوگوں کو اللہ ﷻ کسی طرح بھی ہم پر فضیلت نہیں دے سکتا، ان تک اللہ ﷻ کی کوئی رحمت پہنچ ہی نہیں سکتی، کیونکہ تمہارے زعم میں تو وہ مفلس اور نادار تھے، کمزور طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور تم اس وقت ان کے مقابلے میں اپنی سرداری، مال و دولت اور طاقت کے بل بوتے پر اکڑا کرتے تھے۔

علمی و عملی بات: جب غریب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آگے بڑھ کر اسلام کو سینے سے لگایا تو اشراف مکہ کی نگاہ میں یہ بات اسلام کی بے قدری کا باعث بن گئی اور اسی کو دلیل بنا کر انہوں نے اسلام کو سچا مذہب اور سچا دین سمجھنے سے انکار کر دیا کہ اسلام لانے کے بعد ان کو حضور ﷺ کی مجلس میں اُن غریب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ بیٹھنا ہوگا ہم سردار ہیں یہ ہماری شان کے خلاف ہے کہ ہم ایسا مذہب اختیار کریں جس میں امیر و غریب سب برابر ہوں۔ لیکن یہی بات قیصر روم کی نگاہ میں بالکل ایک دوسرا مفہوم رکھتی ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے جب خطوط کے ذریعہ سلاطین عالم کو اسلام کی دعوت دی تو قیصر روم کو بھی اِسی سلسلے میں آپ ﷺ نے ایک مکتوب گرامی لکھا۔ چنانچہ جب اس کو یہ مکتوب ملا تو بجائے اس کے کہ وہ (معاذ اللہ) کسریٰ ایران کی طرح توہین آمیز رویہ اختیار کرتا اور اس مکتوب گرامی کی بے ادبی کرتا

بلکہ اس نے نہایت احترام سے اُس کو وصول کیا اور کہا کہ یہاں کچھ عرب اگر تجارت کے سلسلے میں آئے ہوئے ہوں تو انہیں میرے پاس لاؤ تا کہ میں اُن سے اِس نبوت کے دعوے دار کے متعلق تحقیق کر سکوں اتفاق سے ابو سفیان جو ان دنوں تک اسلام نہ لائے تھے وہ بھی وہاں موجود تھے۔ انہیں ان کے ساتھیوں سمیت قیصر روم کے سامنے پیش کیا گیا۔ قیصر نے جہاں اور کئی سارے سوالات کیئے وہاں ان سے یہ بھی ایک سوال کیا کہ اس نبی پر ایمان لانے والے کون لوگ ہیں امیر یا غریب؟ ابو سفیان نے جواب دیا کہ غریب لوگ ہیں۔ قیصر بجائے اس کے کہ اشراف مکہ کی طرح اس بات سے یہ نتیجہ اخذ کرتا کہ جس نبی کی دعوت کو غریب لوگ قبول کریں وہ اس قابل نہیں کہ اس پر غور بھی کیا جاسکے اس نے اس کے بالکل برعکس یہ کہا کہ اگر واقعی اس پر ایمان لانے والے غریب لوگ ہیں تو وہ اللہ ﷻ کا سچا نبی ہے کیونکہ انبیاء کرام علیہم السلام پر سب سے پہلے ایمان لانے والے ہمیشہ غریب لوگ ہی ہوتے ہیں۔ لیکن مالداروں اور امراء میں ایسے خوش قسمت لوگ بھی ہوتے ہیں جو شروع ہی میں پیغمبر کی دعوت کو قبول کر کے اپنے مال و دولت کو اللہ ﷻ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور اللہ ﷻ کے یہاں بڑے مقام کے مالک بن جاتے ہیں لیکن امراء طبقے کے بیشتر لوگ ہمیشہ انقلاب کی آگ سے دور رہتے ہیں بلکہ عموماً ان کا مقام اور ان کا اثر و رسوخ اور ان کا مال و دولت انقلاب کے رستے کی رکاوٹ بنتا ہے اور وہ اگر شریک ہوتے بھی ہیں تو اس وقت جب وہ دیکھتے ہیں کہ اب یہ انقلاب اپنی کامیابیوں کی طرف بڑھ رہا ہے، بہر کیف اللہ ﷻ جسے چاہتا ہے ہدایت کی نعمت سے سرفراز فرماتا ہے۔

آیت نمبر ۵۰: اس آیت میں اہل دوزخ کا اپنے دنیا کے شناسا اہل جنت سے کچھ کھلانے پیلانے کی فریاد کا بیان ہے۔ جنت کی تمام نعمتیں صرف اہل ایمان کے لئے ہوں گی اور اہل دوزخ کو کوئی نعمت میسر نہیں آسکے گی۔ دوزخ والے بھوک اور پیاس سے بدحواس ہو کر جنت والوں کو پکاریں گے کہ اللہ ﷻ کے لئے ہم پر کوئی قطرہ پانی بہادو اس چیز میں سے جو اللہ ﷻ نے تمہیں رزق دیا ہے۔ جن فقراء مؤمنین سے دنیا میں کلام کرنا توہین سمجھتے تھے آخرت میں ان کے سامنے دست سوال دراز کریں گے۔ اہل جنت کہیں گے اللہ ﷻ نے ان دونوں چیزوں کو کافروں پر حرام کیا ہے۔ اس لئے تم کو کوئی چیز نہیں مل سکتی۔

آیت نمبر ۵۱: اس آیت میں جنت کی نعمتوں سے محرومی کی درج ذیل وجوہات بیان کی گئی ہیں:

۱۔ لوگوں نے دین کو دنیا میں کھیل تماشہ بنالیا تھا۔ ۲۔ دنیا کی زندگی نے انہیں دھوکے میں ڈالے رکھا تھا۔

۳۔ دنیا میں اللہ ﷻ کی آیتوں اور آخرت کی جواب دہی کو جھٹلاتے تھے۔

اس سب باتوں کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اللہ ﷻ بھی انہیں روز آخرت نظر انداز کر کے اپنی رحمتوں سے دور کر دے گا۔ جس کی وجہ سے اللہ ﷻ کی نعمتوں سے محروم رہیں گے۔

علمی بات: قرآنِ حکیم کی اس آیت سے معلوم ہوا کہ دین کو لہو و لعب بنانے والے وہی ہوتے ہیں جو دنیا کے فریب میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے دلوں سے چونکہ آخرت کی فکر اور اللہ ﷻ کا خوف نکل جاتا ہے۔ اس لئے وہ دین میں بھی اپنی طرف سے جو چاہتے ہیں اضافہ کر لیتے ہیں اور ان کے ہاں دین کے عائد کردہ احکام اور فرائض پر عمل کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔

علمی بات: جنہوں نے دین کو ایک کھیل سمجھ رکھا ہے جس چیز کو چاہا حلال کر لیا اور جس کو چاہا حرام کر لیا یا اس سے وہ بے اصل اور لایعنی امور مراد ہیں جن کو مشرکین نے دین سمجھ رکھا تھا مثلاً بیت اللہ کے پاس تالیاں اور سیٹیاں بجانا۔ چونکہ انہوں نے یوم آخرت کی تیاری کے لئے اعمال صالحہ ترک کر دیئے تھے اس لئے آخرت میں ان کو عذاب میں مبتلا کیا جائے گا۔

آیت نمبر ۵۲: اس آیت میں قرآنِ حکیم کے ذریعہ اللہ ﷻ کا اتمام حجت کرنے کا بیان ہے۔ قرآنِ حکیم سے فائدہ اٹھانے والے وہ لوگ ہیں جو اس پر ایمان لاتے ہیں۔ اس طرح قرآنِ حکیم دنیا و آخرت میں ان کے لئے ہدایت و رحمت بن جاتا ہے۔

علمی و عملی بات:

اللہ ﷻ نے اپنے علم کامل کی بنا پر نیکوکاروں اور بدکاروں کا انجام بتادیا ہے اور روز آخرت یقینی ہے اور ہر ایک کو اس کے عمل کی جزا و سزا بھی مل کر رہے گی۔ بدکاروں پر اس دنیا میں بھی عذاب آتا ہے اور آخرت میں تو عذاب یقینی ہے۔ غرض ہر طرح کی تفصیل اس کتاب میں مذکور ہے۔ اس کتاب سے فائدہ صرف وہی لوگ اٹھاتے ہیں جو اس پر ایمان لاتے ہیں۔ ان کی زندگی میں خوشگوار تبدیلی شروع ہو جاتی ہے۔ ان کے اخلاق سنور جاتے ہیں وہ دوسروں کو فائدہ پہنچانے اور ان

کی بھلائی کی باتیں سوچنے لگتے ہیں۔ ان کی زندگی انتہائی ذمہ دارانہ زندگی بن جاتی ہے پھر ان کی آخرت بھی سنور جاتی ہے اس طرح یہ کتاب ان کی دنیوی زندگی میں بھی ہدایت اور رحمت ثابت ہوتی ہے اور آخرت میں بھی۔

آیت نمبر ۵۳: تاویل سے مراد کسی چیز کا مصداق یا واقع ہونے کا وقت ہے۔ یعنی قرآنِ حکیم نے جو وعدہ اور وعید بیان کی ہے اور اس میں جس نتیجہ اور انجام کی صراحت مذکور ہے اس کے سامنے آنے کے منتظر ہیں اور وہ سزا و جزا ہے۔ یعنی مرنے کے بعد اور قیامت کے دن جب نتیجہ سامنے آجائے گا۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے فرمایا کیا وہ ایمان لانے کے لئے اس انتظار میں ہیں کہ وہ وعید واقع ہو جائے یعنی ان پر سخت عذاب آجائے جو ان کو ملیامیٹ کر دے یا قیامت واقع ہو جائے اور ان کا مواخذہ کر کے ان کو دوزخ میں ڈال دیا جائے تو اس وقت وہ اعتراف کریں گے۔

علمی بات: منکرین حق جس انجام کے منتظر تھے اس کے سامنے آجانے کے بعد اعتراف حق کرنا یا دوبارہ دنیا میں بھیجے جانے کی آرزو اور کسی سفارش کی تلاش، یہ سب بے فائدہ ہوں گی۔ وہ معبود بھی ان سے گم ہو جائیں گے وہ اللہ ﷻ کو چھوڑ کر جن کی عبادت کرتے تھے، نہ وہ ان کی مدد و سفارش کر سکیں گے اور نہ ہی عذاب جہنم سے چھڑا سکیں گے۔ در حقیقت انہوں نے خود اپنے آپ کو خسارہ میں ڈال کر بربادی کا سامان کر لیا۔

آیت نمبر ۵۴: اس آیت میں کائنات کی تخلیق کا چھ دنوں میں مکمل ہونے کا بیان ہے۔ رات اور دن کا باقاعدہ نظام اور سورج، چاند، ستارے سب اللہ ﷻ کے حکم کے پابند ہیں۔ اللہ ﷻ ہی حقیقی رب اور خالق کائنات ہے اور اسی کے حکم اور قدرت سے پورا نظام چل رہا ہے۔

علمی و عملی بات: البتہ ایک قول کے مطابق چھ دن رات کے بقدر وقت مراد ہے یوں تو اللہ ﷻ کو یہ بھی قدرت تھی کہ وہ پلک جھپکنے سے بھی پہلے پوری کائنات وجود میں لے آتا، لیکن اس عمل کے ذریعے انسان کو بھی جلد بازی کے بجائے اطمینان اور وقار کے ساتھ کام کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ ساتوں آسمان اور زمین اور پوری کائنات کی تخلیق کے بعد عرش پر مستوی یعنی جلوہ فرما ہوا۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اللہ ﷻ عرش پر اُسی طرح جلوہ فرما ہے جو اس کی شان کے لائق ہے، نہ اس کا انکار کیا جاسکتا ہے نہ اسے مخلوق کی صفت کے ساتھ تشبیہ دی جاسکتی ہے اور نہ ہی اس کی کیفیت بیان کی جاسکتی ہے۔ عرش پر جلوہ فرما ہونے کا صحیح مطلب ہمارے فہم اور ادراک سے باہر ہے۔ ذات باری تعالیٰ کے حوالہ سے ہمارا یہ ایمان ہے کہ اللہ ﷻ زمان و مکان کی قیود سے بے نیاز ہے۔

علمی بات: قرآن و حدیث سے اتنی بات ثابت ہے کہ عرش ایسا مقام ہے جو تمام آسمانوں اور زمین اور تمام کائنات عالم کو محیط ہے سارا جہاں اس کے اندر سمایا ہوا ہے، اس سے زائد اس کی حقیقت کا معلوم کرنا انسان کے بس کی بات نہیں۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے سورج، چاند اور ستاروں کو اس طرح پیدا کیا ہے کہ ان میں سے ہر ایک اللہ ﷻ کی مرضی اور اس کے ارادہ کا پابند ہے، اور بال برابر بھی اپنی مقررہ شدہ حرکات و سکنات سے روگردانی نہیں کر سکتا ہے، اسی لئے اس کے بعد اللہ ﷻ نے فرمایا کہ بے شک اسی نے تمام چیزوں کو پیدا کیا ہے، وہی سب کا مالک ہے اور ہر چیز پر اسی کا حکم نافذ ہے۔

علمی بات: اس آیت میں انسان کے لئے دعوت فکر ہے دنیا کے بڑے بڑے نامور سائنسدانوں اور ماہرین کی بنائی ہوئی مشینوں اور آلات کو دیکھو، ان میں بھی کچھ نہ کچھ نقائص نکلتے رہتے ہیں۔ چلتے چلتے ان کے تمام پُرزے گھسنے لگ جاتے ہیں اور ختم ہو جاتے ہیں۔ پھر یا تو ان کی مرمت کی جاتی ہے اور کبھی نئے پرزے لگائے جاتے ہیں۔ لیکن یہ خدائی مشینیں ایسی ہیں کہ جس طرح اور جس شان سے اللہ ﷻ نے ان کو پہلے دن چلایا تھا، یہ اسی طرح چل رہی ہیں، نہ کبھی ان کی رفتار میں فرق آتا ہے اور نہ کبھی ان کا کوئی پرزہ گھستا اور ٹوٹتا ہے اور نہ ہی کسی قسم کی مرمت کی ضرورت پڑتی ہے۔ پس یہ تو امر الٰہی سے چل رہی ہیں اور اسی کے تابع ہیں، ان میں کوئی فرق آنا محال ہے۔ ہاں جب وہ قادر مطلق ہی ایک متعین وقت پر ان کو فنا کرنے کا ارادہ کرے گا تو یہ سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اسی کا نام قیامت ہے۔

آیت نمبر ۵۵: اس آیت میں اللہ ﷻ سے دعا مانگنے کے درج ذیل آداب بیان کیئے گئے ہیں۔

۱۔ دعا عاجزی اور رقت سے مانگی جائے۔ ۲۔ دعا آہستہ مانگی جائے۔ ۳۔ دعا میں زیادتی نہ ہو۔

فرمان نبوی ﷺ: ا۔"دُعا عبادت کا مغز ہے"۔(جامع ترمذی) ۲۔"جو اللہ ﷻ سے نہیں مانگتا اللہ ﷻ اس سے ناراض ہو جاتا ہے"۔(جامع ترمذی) ۳۔"دعا بہر حال فائدہ مند ہے ان بلاؤں کے معاملے میں بھی جو نازل ہو چکی ہیں اور ان کے لئے بھی جو ابھی نازل نہیں ہوئیں۔ اللہ ﷻ کے بندو تم ضرور دعا مانگا کرو"(جامع ترمذی) ۴۔"اللہ ﷻ سے اس امید کے ساتھ دعائیں مانگا کرو کہ وہ قبول کرے گا۔"(جامع ترمذی)

اس آیت میں اللہ ﷻ نے دعا کے آداب بتائے ہیں کہ دعا عاجزی اور تواضع کے ساتھ ہو اور چپکے چپکے مانگی جائے اور دعا میں تجاوز نہ کیا جائے بلا ضرورت بلند آواز سے دُعا کرنا بھی حد سے تجاوز کرنے میں داخل ہے اور تجاوز کی مد میں وہ سب چیزیں داخل ہیں جن کا مانگنا عادتاً یا شرعاً محال یا ممنوع ہو جیسے گناہ اور قطع رحمی کی دعا نہ مانگے کوئی ایسا سوال نہ کرے جو اس کی شان کے مناسب نہ ہو پھر معلوم ہوا کہ دعا میں اخفاء بہتر ہے اللہ ﷻ نے حضرت زکریا علیہ السلام کے اوصاف بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا! جب انہوں نے اپنے رب کو آہستہ آواز سے پکارا۔(سورۃ مریم ۱۹، آیت:۳)

علمی بات: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بندہ کی دعا برابر قبول ہوتی ہے، بشرطیکہ وہ گناہ کی اور قطع رحمی کی دعا نہ کرے اور دعا میں جلد بازی سے کام نہ لے۔ عرض کیا گیا یارسول اللہ ﷺ، جلد بازی سے کیا مراد ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ (مثلاً) یہ کہنے لگے کہ میں اتنے عرصہ سے دعا مانگ رہا ہوں اب تک قبول نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ مایوس ہو کر (دعا کرنا) چھوڑ دے۔(صحیح مسلم، جامع ترمذی)

آیت نمبر ۵۶: اس آیت میں دعا کے مزید آداب کا بیان ہے کہ: (ا)۔ زمین میں فساد نہ مچایا جائے۔ فساد میں شرک، کفر، نفس کی اطاعت اور دیگر گناہ شامل ہیں۔ (۲)۔ گناہوں کی وجہ سے اللہ ﷻ کی پکڑ اور گرفت کا خوف رکھا جائے۔ (۳)۔ اللہ ﷻ کی رحمت سے مایوس نہ ہوا جائے۔ (۴)۔ اعمال میں احسان کی روش اختیار کی جائے۔ اللہ ﷻ کی رحمت ایسے لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے جو ان مذکورہ باتوں پر عمل کریں۔

علمی بات: فساد فی الارض یہ ہے کہ انسان اللہ ﷻ کی بندگی چھوڑ کر اپنے نفس کی یا دوسروں کی اطاعت شروع کر دے اور اللہ ﷻ کی بتلائی ہوئی راہ ہدایت کو چھوڑ کر اپنے اخلاق، معاشرت، معیشت، سیاست اور تمدن کی عمارت کو ایسے اصول و قوانین پر قائم کرے جو اسلام کے مخالف اور متصادم ہوں یہی وہ بنیادی چیز ہے جس سے زمین میں فساد برپا ہو جاتا ہے اور ایسی خرابیاں اور مسائل جنم لیتے ہیں کہ جن کا دور کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس آیت سے ضمناً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں زمین میں اصلاح ہی اصلاح تھی کیونکہ پہلے بشر حضرت آدم علیہ السلام خود نبی تھے۔ بعد میں شیطانی عناصر اور عوامل نے اس اصلاح میں بگاڑ کی صورتیں پیدا کیں تو اللہ ﷻ انبیاء کرام علیہم السلام کو بھیج کر اس بگاڑ کو ختم کرتا رہا۔ جبکہ انسانی تہذیب و تمدن کی داستان لکھنے والے اس نظریہ کے قائل ہیں کہ انسان ظلمت سے نکل کر بتدریج روشنی میں آیا ہے اور اس کی زندگی بگاڑ سے شروع ہوئی جو بتدریج سنور رہی ہے قرآنِ حکیم اس نظریہ کی پرزور تردید کرتا ہے۔

علمی و عملی بات: خوف اور طمع سے پکارنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنی تمام امیدیں اللہ ﷻ سے وابستہ رکھے اور اس کی رحمت سے کبھی مایوس نہ ہو اور ڈرنا اس بات سے چاہیئے کہ کسی غلطی یا تقصیر کی وجہ سے کہیں اللہ ﷻ کی بارگاہ میں مردود ہی نہ ہو جاؤں۔ دونوں پہلوؤں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

علمی بات:"محسنین سے مراد احسان کرنے والے ہیں۔ کسی کام کے اچھی طرح انجام دینے کو احسان کہا جاتا ہے۔" احسان اللہ ﷻ کی عبادت میں بھی ہوتا ہے اور بندوں کے ساتھ بھی۔ اللہ ﷻ کی عبادت میں احسان کا ذکر حدیثِ جبریل میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:"(احسان یہ ہے) کہ تُو اللہ ﷻ کی عبادت اس طرح کرے گویا تُو اسے دیکھ رہا ہے، تو اگر تُو اسے نہیں دیکھتا تو (یہ خیال کر کہ) یقیناً وہ تجھے دیکھ رہا ہے"۔(صحیح بخاری)

بندوں کے ساتھ احسان کا ذکر قارون کو اس کی قوم کی نصیحت میں ہے، فرمایا: "جیسا کہ اللہ نے تم پر احسان فرمایا" یعنی کسی معاوضے کی خواہش کے بغیر ان سے نیکی کر۔(سورۃ القصص ۲۸، آیت:۷۷)

آیت نمبر ۵۷: اس آیت میں رحمت سے مراد بارش ہے۔ بارش سے قبل ہوائیں بادلوں کو چلا کر خشک زمینوں کی طرف لے جاتی ہیں۔ بارش کے ذریعہ مردہ زمین زندہ ہو کر سبزہ اور اناج اُگاتی ہے جو انسانوں کی روزی کا ذریعہ بنتی ہے۔ مردہ زمین کو زندہ فرمانے والا اللہ ﷻ اسی طرح قیامت کے دن مردوں کو دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہے۔

علمی بات: بارش سے پہلے اللہ ﷻ ہی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چلاتا ہے جو بارش کی آمد آمد کی خوشخبری لوگوں کو پہنچاتی ہیں جس طرح اللہ ﷻ اپنی قدرت کاملہ سے مردہ زمین کو زندہ اور سرسبز کر سکتا ہے اسی طرح وہ قیامت کے دن ہمیں بھی دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہے۔ چناچہ اللہ ﷻ کو دوبارہ زندگی دینے پر قادر نہ سمجھنا بہت بڑی بے وقوفی کی بات ہے کیونکہ وہ قادر مطلق ہے۔

آیت نمبر ۵۸: اللہ ﷻ کی ہدایت اور آیات بینات کا فائدہ تمام انسانیت کے لئے ہے۔ تاہم جس طرح ہر زمین بارش سے فائدہ نہیں اٹھاتی اسی طرح ہر انسان وحی کی نعمت سے نفع حاصل نہیں کرتا۔ وحی کی نعمت سے صرف وہ لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں جو اللہ ﷻ کے شکر گزار ہیں۔

علمی بات: انسان اور ان کے دلوں کی دو قسمیں بیان کی گئی ہیں ایک اثر قبول کرنے والے اور دوسرے غیر متاثر اور قرآنِ حکیم بمنزلہ باران رحمت اور آب حیات ہے۔ چنانچہ بعض دل ایسے ہیں کہ جب یہ بارش ان پر برستی ہے تو اس سے طرح طرح کے ثمرات اور برکات کا ظہور ہوتا ہے اور ان کے قبول ایمان کا سبب بنتی ہے، جبکہ بعض انسانوں کے دل کی زمین بنجر اور کھاری ہوتی ہے، لہٰذا وہ اللہ ﷻ کی طرف سے نازل ہونے والی اس عمومی باران ہدایت کا کوئی اثر قبول نہیں کرتی بلکہ اس زمین میں سے کفر اور الحاد کے کانٹے اور جھاڑ نکل آتے ہیں اور وہ کفر پر جمے رہتے ہیں۔ اسی کو ایک حدیث شریف میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

فرمان نبوی ﷺ: سیدنا ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اللہ ﷻ نے جس علم و ہدایت کے ساتھ مجھے مبعوث فرمایا ہے، اس کی مثال اس موسلا دھار بارش کی سی ہے جو زمین پر برسی، تو اس میں سے کچھ ایسی صاف زمین تھی، جس نے پانی کو قبول کیا اور بہت زیادہ گھاس اور جڑی بوٹیاں اُگائیں۔ زمین کے کچھ قطعات ایسے تھے جنھوں نے پانی کو روک لیا تو اس سے اللہ ﷻ نے لوگوں کو فائدہ پہنچایا، انہوں نے اسے پیا، پلایا اور اسے زراعت کے لئے استعمال کیا، تاہم زمین کے کچھ ٹکڑے چٹیل میدان تھے، جن پر بارش تو برسی مگر انہوں نے نہ تو پانی روکا اور نہ گھاس ہی اُگائی۔ یہی مثال ہے اس شخص کی جو اللہ ﷻ کے دین میں سمجھ بوجھ حاصل کرے اور اسے وہ چیز نفع پہنچائے جس کے ساتھ اللہ ﷻ نے مجھے مبعوث فرمایا ہے، اسے وہ سیکھے بھی اور سکھائے بھی اور یہی مثال ہے اس شخص کی جو اس کے ساتھ سر ہی نہ اٹھائے اور نہ اللہ ﷻ کی اس ہدایت کو قبول کرے جس کے ساتھ مجھے بھیجا گیا ہے"۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

نوٹ: سورۃ الاعراف کی آیات ۵۹ تا ۷۹ اور ۸۵ تا ۹۳ کی وضاحت رہنمائے اساتذہ مطالعہ قرآنِ حکیم حصہ اوّل میں اور سورۃ الاعراف کی آیات ۸۰ تا ۸۴ کی وضاحت رہنمائے اساتذہ مطالعہ قرآنِ حکیم حصہ چہارم میں ملاحظہ فرمائیں۔

آیت نمبر ۹۴: اللہ ﷻ قوموں کو مختلف بیماریوں اور فقر و فاقہ میں مبتلا کر کے ان کی آزمائش کو بیان فرمایا ہے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب کبھی ہم کسی قوم کی طرف اپنے رسول بھیجتے ہیں اور وہ ان کی بات نہیں مانتے تو ہماری عادت یہ ہے کہ اوّل ان کو دنیا ہی میں مالی اور جانی تنگی و بیماری وغیرہ میں مبتلا کر دیتے ہیں تاکہ یہ لوگ گڑگڑا کر اللہ ﷻ کی طرف رجوع کریں۔

علمی و عملی بات: "بَالْبَاْسَاء" کے معنی فقر و فاقہ اور "وَالضَّرَّاءِ" کے معنی بیماری و مرض کے آتے ہیں، قرآن حکیم میں یہ لفظ جابجا اسی معنی میں آیا ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس کے یہی معنی بیان فرمائے ہیں، بعض اہل لغت نے کہا ہے کہ بَالْبَاْسَاء سے مراد اموال میں پہنچنے والی مصیبت، مثلاً فقر و فاقہ، تنگدستی، مفلسی اور قحط وغیرہ ہے۔ "وَالضَّرَّاءِ" سے مراد انسانی بدن کو نقصان پہنچانے والی اشیاء، مثلاً بیماری، مشقت، تکلیف، مصیبت اور جنگ وغیرہ ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے جن لوگوں کو اپنے عذاب سے ہلاک کیا انہیں (معاذاللہ) یک دم ہی ہلاک نہیں کیا، بلکہ انہیں سالہا سال تک راہ راست پر آنے کے بہت سے مواقع فراہم کیئے، اول تو پیغمبر بھیجے جو انہیں برسوں تک خبردار ہوشیار کرتے رہے، پھر اور عذاب الٰہی سے ڈراتے رہے انہیں کچھ معاشی بدحالی اور بیماریوں وغیرہ کی مصیبتوں سے دوچار کیا تاکہ ان کے دل کچھ نرم پڑیں اور وہ راہ راست پر آجائیں۔

آیت نمبر ۹۵: اس آیت میں نافرمان قوم پر آزمائش کے دوسرے طریقہ کا بیان ہے۔ بیماری اور فقر و فاقہ کو تندرستی اور آسودگی میں تبدیل کر دیا جاتا تو اس پر نافرمان یہ کہتے کہ ماضی میں ہمارے آباؤ اجداد پر بھی ایسی راحت و تکلیف آتی رہتی تھیں۔ پھر اللہ ﷻ کی طرف سے اچانک ان نافرمانوں پر عذاب آیا جس کا انہیں گمان بھی نہ تھا۔

دوسری طرف کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جب ان پر خوش حالی آتی ہے تو ان کے دل میں اللہ ﷻ کے احسانات کا احساس پیدا ہوتا ہے اور وہ اس وقت حق بات کو قبول کرنے کے لئے نسبتاً زیادہ آمادہ ہو جاتے ہیں، چنانچہ ان لوگوں کو بدحالی کے بعد خوش حالی کی نعمت بھی عطا کی جاتی ہے تاکہ وہ شکر گزار بن سکیں، حالات کی اس تبدیلی سے بعض لوگ سبق حاصل کر کے راہ راست پر آجاتے ہیں، لیکن کچھ ضدی طبیعت کے لوگ ان باتوں سے کوئی سبق نہیں سیکھتے اور یہ کہتے ہیں کہ یہ دکھ سکھ اور گرم سرد حالات تو ہمارے باپ داداؤں کو بھی پیش آچکے ہیں، انہیں خوامخواہ اللہ ﷻ کی طرف سے کوئی اشارہ قرار دینے کی کیا ضرورت ہے؟ اس

طرح جب ان لوگوں پر ہر طرح کی حجت تمام ہو چکی ہوتی ہے تو پھر اللہ ﷻ کی طرف سے عذاب آتا ہے اور اس طرح پکڑ لیتا ہے کہ ان کو پہلے سے اس کا گمان اور اندازہ بھی نہیں ہوتا۔

علمی بات: حضرات مفسرین فرماتے ہیں کہ جب بندوں کو گناہوں کی سزا دنیا میں ملتی رہے تو امید ہے کہ توبہ کر لیں گے، اور جب گناہ پر سزا نہ ملے تو یہ اللہ ﷻ کی طرف سے ڈھیل اور پھر اس کی ہلاکت یقینی ہے، جیسے کوئی زہر کھا لینے کے بعد اُگل دے تو امید ہے کہ بچ جائے گا اور اگر وہ جسم میں سرایت کر جائے تو بس پھر ہلاکت یقینی ہے۔

عملی پہلو: اگر مصائب و آلام کے پہاڑ ٹوٹنے کے بعد بھی لوگ غفلت سے بیدار نہ ہوں اور مال دولت اور نعمتوں کی فراوانی کے باوجود بھی اپنے مہربان اور کریم پروردگار کے لئے شکر گزاری کا جذبہ پیدا نہ ہو تو پھر اصلاح کی کوئی امید باقی نہیں رہتی۔

آیت نمبر ۹۶: اس آیت میں ایمان اور تقویٰ کی برکات کا ذکر ہے کہ آسمان و زمین سے برکتوں کے عطا کیئے جانے کا وعدہ ہے۔ لیکن کفر کی روش پر ڈٹے رہنے والے عذاب میں مبتلا کر دیئے جاتے ہیں۔

علمی بات: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ ﷻ کی مقرر کردہ حدود میں سے کسی ایک حد کے قائم کرنے سے اتنی برکات اور رحمتوں کا نزول ہوتا ہے جتنا چالیس دن کی بارش سے ہوتا ہے (سنن نسائی)۔

آیت نمبر ۹۷: نافرمانی پر اللہ ﷻ کے عذاب کے اچانک آجانے پر خبردار کیا گیا ہے اور تنبیہ کو نظر انداز کرنے پر رات کے وقت نیند کی حالت میں عذاب کے بھیجے جانے کا بیان ہے۔

مطلب یہ ہے کہ پیغمبروں کی نافرمانی اور تکذیب کے بعد عذاب الٰہی سے کسی وقت بھی بے خوف نہیں رہنا چاہیئے۔ نہ جانے رات یا دن میں کس وقت بے خبری میں عذابِ الٰہی آجائے۔ کیا یہ تکذیب کرنے والے اللہ ﷻ کے عذاب سے بے خوف ہو گئے ہیں۔ کہ عیش و آرام میں مشغول ہوں یا اپنی خواب گاہ میں استراحت کر رہے ہوں اور یکایک عذابِ الٰہی سے دوچار ہو کر ہلاک ہو جائیں، کیا انہیں اللہ ﷻ کی تدبیر سے بالکل بھی ڈر نہیں لگتا؟

آیت نمبر ۹۸: بے فکری اور غفلت کے نتیجہ میں دن دیہاڑے بھی عذاب بھیج دیئے جانے کی تنبیہ ہے۔

یعنی جب عیش و آرام میں غافل پڑے سو رہے ہوں یا دنیا کے کاروبار اور لہو و لعب میں مشغول ہوں اس وقت اللہ ﷻ کا عذاب ان کو دفعتاً آگھیرے۔ اس بات سے یہ لوگ کیوں نڈر اور بے فکر ہو رہے ہیں۔ حالانکہ جن اسباب کی بنا پر گزشتہ اقوام پر عذاب آئے ہیں، وہ ان مشرکین مکہ میں بھی موجود ہیں یعنی کفر و تکذیب اختیار کرنا اور سید الانبیاء حضرت محمد ﷺ کے ساتھ دشمنی مقابلہ اور جنگ و جدال وغیرہ کرنا۔

علمی پہلو: ان واقعات کو بیان کر کے کفار مکہ کو متوجہ کیا جا رہا ہے کہ اللہ ﷻ کے غضب سے کسی کو بھی بے فکر ہو کر نہیں بیٹھنا چاہیئے اور یہ بات صرف کفار مکہ ہی کے لئے نہیں ہے بلکہ ہر وہ شخص جو کسی گناہ، بد عملی یا ظلم میں مشغول ہو اسے ان آیات کریمہ کو اپنے پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔

آیت نمبر ۹۹: دنیا کی تمام نافرمان قوموں اور رسول اللہ ﷺ کے دور نبوت کے کفار کو تنبیہ ہے۔ اللہ ﷻ کی گرفت اور تدبیر سے بے فکر وہی ہوتے ہیں جنہوں نے خسارہ میں جانے کا فیصلہ کر لیا ہو۔

علمی بات: اصل میں لفظ "مکر" استعمال ہوا ہے جس کے معنی عربی زبان میں خفیہ تدبیر کے ہیں، یعنی کسی شخص کے خلاف ایسی چال چلنا کہ جب تک اس پر فیصلہ کن ضرب نہ پڑ جائے اس وقت تک اسے خبر نہ ہو کہ اس کی شامت آنے والی ہے، بلکہ ظاہر حالات کو دیکھتے ہوئے وہ یہی سمجھتا رہے کہ سب اچھا ہے۔

اللہ ﷻ وہاں سے پکڑتا ہے، جہاں سے کسی کو پکڑے جانے کا گمان بھی نہیں ہوتا۔ اوپر تنبیہ کے بعد ڈھیل کی جو سنت بیان ہوئی، وہ اس تدبیر الٰہی ہی کی ایک مثال ہے۔ وہ قوم تو سمجھتی ہے کہ اب اس نے پالا مار لیا، لیکن درحقیقت وہیں اس کی ہلاکت کا گہرا گڑھا ہوتا ہے۔

عملی پہلو: انسان کو غور و فکر کرنا چاہیئے کہ اللہ ﷻ کی تدبیر مخفی اور ناگہانی ہوا کرتی ہے۔ زلزلہ کے اسباب شب و روز نشو نما پاتے رہتے ہیں۔ سیلاب ایک لمحہ کی برف باری ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ آتش فشاں پہاڑوں کا لاوا برسوں تک کھولتا رہتا ہے تب کہیں جا کر پھٹنے کے قابل ہوتا ہے، جب کہ اللہ ﷻ کے ہاں یہ سب تدبیریں

پوشیدہ ہوتی ہیں۔ انسانوں کو اس کا گمان بھی نہیں ہوتا کہ کوئی غیر معمولی بات ہونے والی ہے۔ اس لئے ہمیشہ اللہ ﷻ کے غضب سے بچنے کی کوشش اور فکر کرنی چاہیئے اور اللہ ﷻ کے عذاب سے پناہ طلب کرنی چاہیئے۔

آیت نمبر ۱۰۰: اس آیت میں سابقہ اقوام کے حالات سے عبرت حاصل کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ ظلم و زیادتی اور نافرمانی سے باز نہ آنے پر کفار و منکرین کے دلوں پر مہر لگادی جاتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قبول حق کی صلاحیت سلب کرلی جاتی ہے اور وہ ہمیشہ حق کے انکاری رہتے ہیں۔

علمی بات: یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ کفار اپنے سر میں لگے ہوئے حسی کانوں سے سنتے تھے اور سنتے ہیں لیکن انہوں نے حق کو قبول نہ کیا اور اسے گوش دل سے نہ سنا اور انہیں تسلیم کرنے اور حق پر ایمان لانے کی توفیق نہ ہوئی تو سنا ان سنا برابر ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا سننا کہ اس کو قبول کریں اور نفع حاصل ہو ایسا نہیں سنتے اسی معنی میں ان کو "صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ" کہا ہے۔

عملی پہلو: مشرکین مکہ کے لئے سابقہ قوموں کے انجام سے مقام عبرت:

آیت کریمہ میں بنی نوع انسان کے لئے ایک بڑی تنبیہ ہے کہ اس دنیا میں اللہ ﷻ کے عذاب سے ہمیشہ ڈرتے رہیں اور سابقہ قوموں کے انجام بد سے عبرت حاصل کریں۔ جس طرح اللہ ﷻ نے ان کے گناہوں کی وجہ سے انہیں گرفت میں لے لیا، اسی طرح ممکن ہے ان لوگوں کو بھی اللہ ﷻ ان کے گناہ کی وجہ سے پکڑ لے اور ان کے دلوں پر مہر لگادے جو ان ہلاک کی گئی قوموں کے بعد آئے ہیں اور اسی سرزمین پر انہی کی طرح گناہ بھی کر رہے ہیں جس پر گذشتہ قومیں آباد تھیں۔

آیت نمبر ۱۰۱: اس آیت میں جھٹلانے والوں کا بیان ہے کہ واضح دلائل لانے کے باوجود سابقہ امتوں نے رسولوں کی تکذیب کی چنانچہ پتا چلا کہ جان بوجھ کر حق کو جھٹلانا انسان کو سخت دل اور ہدایت سے محروم کر دیتا ہے۔

علمی بات: ان آیتوں میں اللہ ﷻ نے آنحضرت ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ قومِ نوح علیہ السلام، قوم عاد علیہ السلام، قوم ثمود علیہ السلام لوط علیہ السلام اور شعیب علیہ السلام کی قوموں کی یہ وہ اجڑی ہوئی بستیاں ہیں جن کے کچھ حالات و واقعات ہم نے بیان کیئے ہیں۔ مشرکین مکہ کے تجارتی سفر کے دوران راستے میں ان بستیوں کے آثار و نشانات ملتے ہیں۔ یہ لوگ ان کو دیکھ کر سبق حاصل نہیں کرتے۔

اللہ ﷻ نے اپنے رسولوں کو حق کے واضح دلائل دے کر ان کے پاس بھیجا، جنہوں نے ان کو خوب سمجھایا مگر وہ لوگ اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کی بنا پر توحید کو جھٹلاتے رہے اور اپنے کفر و انکار پر قائم رہے اور ایمان نہ لائے، اللہ ﷻ نے اِن کی تکذیب کی روش کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر لگادی۔ پھر ان میں نیکی قبول کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہی۔ اسی طرح آپ ﷺ کی قوم کے ایسے کافروں کے بارے میں بھی ہم نے لکھ دیا ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

علمی بات: حدیث میں رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جب کوئی انسان پہلے پہل گناہ کرتا ہے تو اس کے قلب پر ایک نقطہ سیاہی کا لگ جاتا ہے، دوسرا گناہ کرتا ہے تو دوسرا، تیسرا گناہ کرتا ہے تو تیسرا نقطہ لگ جاتا ہے یہاں تک کہ اگر وہ برابر گناہوں میں مشغول رہا اور توبہ نہ کی تو یہ سیاہی کے نقطے اس کے سارے قلب کو گھیر کر سیاہ کر دیتے ہیں پھر اس انسان کے قلب میں بھلے بُرے کی پہچان کا مادہ فنا یا مغلوب ہو جاتا ہے اور نتیجتاً وہ اچھی چیز کو بُرا اور بُری چیز کو اچھا خیال کرنے لگتا ہے اسی حالت کو قرآنِ حکیم میں "رَانَ" یعنی قلب کے زنگ سے تعبیر فرمایا ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ: ہرگز ایسا نہیں! بلکہ (جھٹلانے کی وجہ یہ ہے کہ) ان کے دلوں پر (بُرے اعمال کا) زنگ چڑھ گیا ہے جو وہ کیا کرتے تھے۔ (سورۃ المطففین ۸۸، آیت: ۱۴) اس آیت میں اور دوسری آیات میں جس کو "طبع" یعنی مہر لگانے سے تعبیر کیا گیا ہے۔

علمی بات: یہاں سننے سے مراد ماننا اور اطاعت کرنا ہے، مطلب یہ ہے کہ دلوں پر مُہر لگ جانے کے سبب وہ کسی حق بات کو ماننے کو تیار نہیں ہوتے اس کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ انسان کا قلب اس کے تمام اعضاء و جوارح کا مرکز ہے، جب دل میں کسی چیز کی بھلائی یا بُرائی سما جاتی ہے تو پھر آنکھوں سے وہ چیز اسی طرح دکھائی دیتی ہے جس طرح دل میں سمائی ہوتی ہے۔

آیت نمبر ۱۰۲: اس آیت میں نافرمانوں کی اکثریت کا عہد کی پاسداری نہ کرنے کا ذکر ہے۔

علمی بات: مفسرین کرام نے اس عہد سے مختلف عہد مراد لیئے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس عہد سے مراد وہ ازلی عہد یعنی عہد میثاق ہے جو آدم علیہ السلام کی تخلیق کے وقت تمام ارواح سے لیا تھا کہ (اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ) (اور پوچھا) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ تو سب نے کہا کیوں نہیں۔ اس وقت سب نے اقرار کیا تھا مگر دُنیا میں آکر اکثر نے فراموش کر دیا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ عہد سے مراد عہد ایمان ہے جیسا کہ قرآنِ حکیم میں فرمایا اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا، اس میں عہد سے عہد ایمان وطاعت مراد ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ عہد سے مراد وہ اقرار ہے جو آدمی ایمان قبول کرتے ہوئے کلمۂ شہادت کے الفاظ میں اقرار کرتا ہے۔ اس عہد کے تحت وہ عہد وپیمان بھی شامل ہیں جو انسان دوسرے انسانوں سے کرتا ہے خواہ یہ لین دین کے معاملات سے تعلق رکھتا ہو یا نکاح وطلاق کے معاملات سے اور وہ عہد بھی جو کوئی انسان ذاتی طور پر اپنے پروردگار سے کرتا ہے الغرض عہد پر پورا اترنا انسان پر لازم ہے اسے توڑنے والا فاسق وگناہ گار ہوتا ہے۔

عملی بات: ایمان واطاعت کا عہد باندھنے سے مراد یہ ہے کہ عموماً انسان جب کسی مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے اور وہ مصیبت ٹلنے کا نام نہیں لیتی تو اسے اپنا انجام خسارہ کی صورت میں یاد آتا ہے اور اکثر دل یا زبان سے عہد کرتا ہے کہ اس مصیبت سے نجات مل گئی تو اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اطاعت میں لگ جاؤں گا، جیسا کہ قرآنِ حکیم میں بہت سے لوگوں کا یہ حال ذکر کیا گیا ہے، لیکن جب ان کو اس سے نجات ہو جاتی ہے اور آرام وراحت ملتی ہے تو پھر اسی سرکشی اور نافرمانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اس عہد کو بھول جاتے ہیں۔

علمی وعملی پہلو: ان تمام قصص سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ان قوموں نے کس طرح بار بار اللہ تعالیٰ سے کئے عہد وپیمان توڑا اور نتیجتاً ان کو سخت ترین سزائیں دی گئیں، تاکہ اس سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلّی وتشفّی ہو اور دوسری جانب مکہ والوں کے دل میں ڈر پیدا ہو، اور ان کو معلوم ہو کہ اگر ہم نے رسول اللہ تعالیٰ کا کہا نہ مانا اور انکار کیا تو ہمارا بھی یہی حشر ہو گا۔

نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ حق کے ظہور کے بعد اوّلاً اکثریت کی جانب سے پر زور مخالفت ہوتی ہے اور ابتداً حق کو قبول کرنے والے بہت تھوڑے لوگ ہوتے ہیں۔

نوٹ: سورۃ الاعراف کی آیت ۱۰۳ تا ۱۵۵ کی وضاحت رہنمائے اساتذہ مطالعہ قرآن حصہ دوم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصّہ میں ملاحظہ فرمائیں۔

آیت نمبر ۱۵۶: اس آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی امت کے لئے دنیا و آخرت دونوں جگہ کی بھلائی مانگی ہے۔ "حُسْنَه" بھلائی کو کہتے ہیں دنیا میں حسنہ کا وسیع مفہوم یہ ہے کہ بندہ کو نیکی کی توفیق، رزق حلال اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت نصیب ہو جائے، اور آخرت میں حسنہ سے مراد یہ ہے کہ بندہ کو نجات، گناہوں کی معافی اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور دیدار نصیب ہو جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ جواب دیا کہ جو سزا کا مستحق ہے اسی کو سزا ملتی ہے کسی کو بلاوجہ سزا نہیں دی جاتی۔ دنیا کی تمام مخلوق اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مستفید ہو رہی ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت کے مستحق وہ لوگ ہوں گے جو درج ذیل شرائط پوری کریں: ۱۔ تقویٰ اور پرہیز گاری اختیار کریں۔ ۲۔ زکوٰۃ ادا کریں۔ ۳۔ اللہ تعالیٰ کی تمام آیات اور احکامات پر ایمان رکھیں۔

علمی بات: اس دعا میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دنیا اور آخرت کی بھلائی کی درخواست کی ہے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں جس پر چاہتا ہوں اپنا عذاب نازل کرتا ہوں کوئی مجھ پر اعتراض نہیں کر سکتا اور میری رحمت ومہربانی ہر چیز سے زیادہ وسیع ہے اس عام رحمت کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی ایک خاص رحمت بھی ہے جو اس کے خاص بندوں پر نازل ہوتی ہے۔ اس میں سے ہر اس شخص کو حصہ ملے گا جو متقی اور پرہیز گار ہو اور اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے مال میں سے زکوٰۃ ادا کرتا ہو اور اللہ تعالیٰ کے تمام احکام کو مانتا ہو۔ جو اس درجہ کا ایمان وتقویٰ رکھتا ہو گا وہ اس خاص رحمت کا مستحق ہو گا۔

آیت نمبر ۱۵۷: اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع کے حوالے سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تین کاموں کو نمایاں کیا گیا ہے۔

۱۔ نیکی کا حکم دینا اور بُرائیوں سے روکنا۔ یہی اب اُمت مسلمہ کی ذمہ داری ہے (سورۂ آل عمران ۳، آیت: ۱۱۰)

۲۔ پاکیزہ چیزوں کو حلال کرنا اور خبیث چیزوں کو حرام ٹھہرانا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے (سورۃ الحشر ۵۹، آیت: ۷) " اور رسول تمہیں جو کچھ دیں، وہ لے لو، اور جس چیز سے منع کریں اس سے رک جاؤ، اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بیشک اللہ سخت سزا دینے والا ہے"۔

۳۔ انسانوں کو غلط عقائد و بُرے اعمال اور گذشتہ امتوں کے سخت اور دشوار احکامات بے جا معاشرتی رسومات کے بوجھ دور کرنا۔ اب یہ ذمہ داری اُمتِ مسلمہ کے کاندھوں پر ہے کہ وہ اس ذمہ داری کا احساس کریں اور اس فریضہ نیابت کو بخوبی نبھانے کی کوشش کریں۔

علمی بات: بوجھ سے مراد وہ مشکل احکام ہیں جن کا شرعی حکم پچھلی امتوں کو تھا یا وہ بندشیں ہیں جو امتوں نے از خود اپنے اوپر عائد کر لی تھیں۔

گزشتہ آسمانی کتابوں میں نبی کریم ﷺ کی یہ صفت بھی بیان کی گئی تھی کہ آپ ﷺ بھلائی کا حکم دیں گے برائی سے روکیں گے نیز تجارت کی وہ تمام قسمیں جو ربا اور باطل شرائط سے خالی ہوں اور اچھی اور پاکیزہ چیزوں کو اس اُمت کے لئے حلال بیان کریں گے جو پہلی قوموں پر ان کی سرکشی کی وجہ سے بطور سزا حرام کر دی گئی تھیں۔ اسی طرح اور نقصان دہ چیزوں کی مذمت کریں گے جن کو اللہ ﷻ نے حرام کیا ہے جیسے سود، خنزیر کا گوشت اور دوسرے محرمات وغیرہ۔

نوٹ: سچا امتی بننے اور نجات پانے کے لئے چار کام لازمی ہیں:

۱۔ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا زبان سے بھی اور دل سے بھی اور اپنی جان سے بڑھ کر رسول اللہ ﷺ سے محبت کرنا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ " ایمان والوں کے لئے یہ نبی (ﷺ) ان کی اپنی جانوں سے بھی زیادہ قریب تر ہیں"۔ (سورۃ الاحزاب ۳۳، آیت:۶)

۲۔ رسول اللہ ﷺ کی تعظیم اور احترام کرنا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ اے ایمان والو! اپنی آوازوں کو (اپنے) نبی کی آواز پر بلند نہ کرو، اور نہ ان کے سامنے بلند آواز سے بولو، جیسے کہ تم ایک دوسرے سے بلند آواز سے بات کرتے ہو، ورنہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں گے اور تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا۔ (سورۃ الحجرات ۴۹، آیت نمبر:۲)

۳۔ خدمت دین کے مشن میں رسول اللہ ﷺ کی نصرت کرنا اور دعوت اور نفاذ دین کی جدوجہد کرنا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے اے ایمان والو! اللہ (کے دین) کے مددگار بن جاؤ، جیسا کہ عیسیٰ ابن مریم نے حواریوں سے کہا: اللہ کی طرف میرے مددگار کون ہیں؟ حواریوں نے کہا: ہم اللہ کے (دین کے) مددگار ہیں۔ (سورۃ الصف ۶۱، آیت:۱۴)

۴۔ یعنی وحی جو رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی خواہ متلو ہو یا غیر متلو اس کی پیروی کرنا یعنی قرآنِ حکیم کے حقوق مکمل طور پر ادا کرنا۔ اور سنّت رسول ﷺ کی پیروی کرنا۔

علمی بات: نور سے مراد قرآنِ حکیم بھی ہے اور اس پر عمل کرنے کا طریقہ کار یعنی سنت نبوی ﷺ بھی۔ ان دونوں کی پیروی میں ہی نجات ہے۔

آپ ﷺ پر ایمان لانے کے دو بنیادی تقاضے ہیں' پہلا تقاضا ہے آپ ﷺ کی محبت اور دوسرا تقاضا ہے آپ ﷺ کی اطاعت۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهٖ) تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہے جب تک کہ اس کی خواہش نفس تابع نہ ہو جائے اس چیز کے جو میں لے کر آیا ہوں۔ یعنی جس شریعت اور اس کے احکام کے ساتھ حضور ﷺ مبعوث ہوئے' ان کو-صدق دل سے تسلیم کر کے ان پر ایمان لانے کے بعد اس پر عمل کرنا ہو گا۔

اسی طرح حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: " لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ" "تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اسے محبوب تر نہ ہو جاؤں اس کے باپ، بیٹے اور تمام انسانوں سے۔" (متفق علیہ) چنانچہ جب دونوں تقاضے پورے ہوں گے تو آپ ﷺ پر ایمان کا دعویٰ سچائی پر مبنی ہو گا۔ ایک تو یہ کہ آپ ﷺ کی اتباع اور اطاعت، انتہائی درجے کی ہو دوسرا یہ کہ آپ ﷺ کی محبت میں سرتاپا منہمک ہوں کہ اپنا سب کچھ آپ پر قربان کرنے کے لئے تیار ہوں۔

فرمانِ نبوی ﷺ: ۱۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میری تمام امت جنت میں داخل ہو گی سوائے اس کے جو انکار کرے، لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کون انکار کرے گا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے میری نافرمانی کی تو اس نے انکار کیا۔ (صحیح بخاری)

۲۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے میری فرماں برداری کی اس نے اللہ ﷻ کی فرماں برداری کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ ﷻ کی نافرمانی کی (ابن ماجہ)۔

عملی پہلو: آپ ﷺ نے سخت محنت، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی قربانیوں اور اللہ ﷻ کی نصرت سے جزیرہ نمائے عرب میں دین کو غالب کر کے اپنے مشن کی تکمیل کر دی۔ آپ ﷺ کے بعد خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے دور میں فتوحات زیادہ ہوتی گئیں اور اسلامی سلطنت کا دائرہ کار دور دور تک پھیل گیا۔ اُس کے بعد مسلمان

اپنی بداعمالیوں کے سبب پستی اور زوال کا شکار ہوتے گئے اور آج دنیا میں کہیں بھی دین اسلام عملی طور پر غالب و نافذ نہیں ہے۔ لہٰذا اب دین کو ساری دنیا میں غالب کرنے کی جدوجہد کرنا امت کی ذمہ داری ہے۔ یہ قرآنی حکم آج بھی ہمیں پکار رہا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے "اے ایمان والو! اللہ (کے دین) کے مددگار بن جاؤ جیسا کہ عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام نے حواریوں سے کہا: اللہ کی طرف میرے مددگار کون ہیں؟ حواریوں نے کہا: ہم اللہ (کے دین) کے مددگار ہیں۔" (سورۃ الصف ۶۱، آیت: ۱۴)

عملی پہلو: اللہ ﷻ کی خاص رحمت کے حصول کے لئے نبی کریم ﷺ کی اتباع شرط لازم ہے۔ "اُمّی" کے لفظ میں نبی کریم ﷺ کی عظمت کا ذکر ہے کہ اُمّی ہونے کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے ایسا کلام (قرآنِ حکیم) پیش فرمایا کہ اس جیسا کلام پیش کرنا ساری مخلوق کے بس میں نہیں ہے۔ جس سے یہ ثابت ہوا کہ یہ اللہ ﷻ کا کلام برحق ہے۔

علمی بات: عرب کے محاورہ میں اُمّی اسے کہتے ہیں جس نے کسی مخلوق سے لکھنا پڑھنا نہ سیکھا ہو اور آپ ﷺ نے بھی کسی سے لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا تھا۔ اللہ ﷻ نے محض اپنے فضل و قدرت سے آپ ﷺ کو وہ علوم عطا فرمائے جو کسی کو نہیں دیئے۔ مخلوق میں آپ ﷺ سے بڑھ کر کوئی بھی صاحب علم نہیں ہے اللہ ﷻ نے آپ ﷺ کو جو علوم دیئے تھے ان ہی میں سے وہ سب خبریں ہیں جو آپ ﷺ نے عالم کی ابتدا سے لے کر جنت میں داخل ہونے والے آخری شخص کے داخلہ تک بتادیا اور اہل دوزخ کے احوال اور حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کی امتوں کے احوال اور واقعات بیان کیئے ایسے اُمّی پر کڑوڑوں اہل علم قربان۔ اس سب تفصیل سے معلوم ہوگیا کہ اُمّی ہونا آپ علیہ السلام کی ذات گرامی کے لئے سراپا مدح اور خیر وخوبی کی چیز ہے۔

علمی بات: اہل کتاب، بنی اسماعیل کے اندر ایک صاحب رسالت نبی کی بعثت کے بارے میں پہلے سے ہی واقف تھے اور اس کا چرچا ان کے ہاں برابر قائم رہا ہے۔ تورات و انجیل میں آپ ﷺ کی آمد کا ذکر واضح طور پر موجود ہے۔

چنانچہ برٹش اینڈ فارن بائیبل سوسائٹی لاہور ۱۹۳۱ء میں چھپی ہوئی بائیبل میں یوحنا کی انجیل کی انتیسویں اور تیسویں آیت میں ہے کہ "اور اب میں نے تم سے اس کے ہونے سے پہلے کہہ دیا ہے تاکہ جب ہو جائے تو تم یقین کرو اس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا۔ کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں"۔ پھر اسی کتاب کے باب سولہ کی ساتویں آیت ہے۔ "لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لئے فائدہ مند ہے۔ کیونکہ اگر میں نہ جاؤں گا تو وہ مددگار تمہارے پاس نہ آئے گا"۔ اس کی تیرھویں آیت ہے "لیکن جب وہ یعنی سچائی کا روح آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا۔ اس لئے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا۔ لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا"۔

"خداوند تیرا خدا تیرے لئے تیرے ہی درمیان سے تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا، تم اس کی سننا اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں سو ٹھیک کہتے ہیں۔ میں ان کے لئے ان ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے تو میں ان کا حساب اس سے لوں گا" (استثنا باب ۱۸: ۱۵۔۱۹)۔ سیدنا مسیح علیہ السلام کی پیشگوئی ملاحظہ ہو: "یسوع نے ان سے کہا کہ کیا تم نے کتاب مقدس میں نہیں پڑھا کہ جس پتھر کو معماروں نے رد کیا وہی کونے کے سرے کا پتھر ہوگیا۔ یہ خداوند کی طرف سے ہوا اور ہماری نظر میں عجیب ہے۔ اس لئے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی دی ہوئی بادشاہت تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے دے دی جائے گی" (متی باب ۲۱: ۴۲۔۴۴)۔ ان پیشن گوئیوں پر غور کیجیے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل میں آخری نبی ہیں ان کے بعد کوئی بنی اسرائیل میں نہیں آیا۔ پھر ان پیشن گوئیوں کا مصداق آنحضرت (ﷺ) کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟ یہ کس کا مرتبہ بیان ہوا ہے کہ وہ دنیا کا سردار ہے جو ابد تک لوگوں کے ساتھ رہے گا۔ جو شخص بھی ان پیشن گوئیوں پر انصاف اور غیر جانبداری کے ساتھ غور کرے گا وہ پکار اٹھے گا کہ یہ اگر کسی پر صادق آسکتی ہیں تو صرف نبی اُمّی اور رسولِ خاتم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر ہی صادق آسکتی ہیں۔ نبی اُمّی ﷺ کے سوا اور کوئی ان کا مصداق نہیں ہو سکتا۔

آیت نمبر ۱۵۸: نبی کریم ﷺ کی رسالت عالمگیر ہے۔ آپ ﷺ کو اللہ ﷻ نے مبعوث فرمایا جو پوری کائنات کا مالک ہے۔ نجات اور فلاح کا واحد راستہ یہ ہے کہ اللہ ﷻ کی وحدانیت اور نبی کریم ﷺ کی رسالت کو تسلیم کرلیا جائے۔ رسول ﷺ خود اللہ ﷻ اور اس کے کلمات یعنی تمام آسمانی کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ نیز بتایا گیا ہے کہ ہدایت کے حصول کے لئے نبی کریم ﷺ کی اتباع لازمی اور ضروری ہے۔

اب قیامت تک ہدایت اور کامیابی کے حصول کی ممکن صورت یہ ہے کہ آپ ﷺ کی تعلیمات کی مکمل پیروی کی جائے اور قیامت تک آنے والے تمام انسانوں اور جنوں کی ذمہ داری ہے آپ ﷺ پر ایمان لائیں اور یہ تمام انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانے کے مترادف ہے آنحضرت ﷺ کی نبوت ورسالت تمام انسانوں اور جنات کے لئے ہے لہذا محمد رسول ﷺ کے بعد کسی بھی قسم کا کوئی نیا نبی نہیں آئے گا۔

حضور نبی کریم ﷺ کی خصوصیات: احادیث صحیحہ میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ ﷻ نے مجھے چند باتیں ایسی عنایت فرمائی ہیں جو کسی اور نبی علیہ السلام کو عنایت نہیں فرمائیں۔

۱۔ تمام انبیاء علیہم السلام خاص اپنی قوم کی ہدایت کے لئے بھیجے جاتے تھے مجھے اللہ ﷻ نے ہر سیاہ وسفید یعنی عرب وعجم کے لئے بھیجا ہے مطلب یہ ہے کہ میں تمام مخلوق کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

۲۔ مجھ پر نبوت ختم ہوگئی یعنی میرے بعد کسی کو منصب نبوت عطا نہیں ہوگا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو آخری زمانہ میں قربِ قیامت آسمان سے نازل ہوں گے ان کو منصب نبوت آپ ﷺ سے تقریباً چھ سو سال پہلے مل چکا تھا۔ ان کا نزول ختم نبوت کے منافی نہیں کیونکہ وہ بھی اس وقت رسول علیہ السلام کی حیثیت سے نہیں آپ ﷺ کے امتی بن کر آئیں گے اور شریعتِ محمدی ﷺ کی ہی پیروی کریں گے۔

۳۔ مجھے شفاعت کا مقام عطا کیا گیا کہ قیامت کے دن اولین وآخرین کی لئے شفاعت کروں گا۔ (اس شفاعت سے مراد حساب کتاب کے شروع ہونے کے لئے سفارش مراد ہے)۔

۴۔ میرے لئے غنائم حلال کر دی گئیں جو مجھ سے پہلے کسی نبی کے لئے حلال نہیں کی گئیں۔

۵۔ تمام روئے زمین میرے لئے پاک اور نماز کی جگہ قرار دے دی گئی (یعنی میری امت کو جہاں نماز کا وقت ہو جائے وہیں کسی پاک جگہ نماز پڑھ لے)۔

۶۔ ایک مہینہ کی مسافت راہ کے فاصلے پر میرے دشمنوں کے دلوں میں میرا رعب ڈال دیا گیا۔

۷۔ مجھ کو جوامع الکلم عطا کیئے گئے یعنی ایسے کلمات کہ جن کے الفاظ تو بہت مختصر اور معانی بہت ہوں۔ یہ مضمون صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی روایتوں سے ثابت ہے۔

آیت نمبر ۱۵۹: اس آیت میں گروہ کے دو مفہوم ہیں۔

۱۔ دور نبوی ﷺ میں یہود میں ایک گروہ انصاف پسند تھا۔

۲۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں دور نبوی ﷺ تک ایک انصاف پسند گروہ ہمیشہ موجود رہا جو آپ ﷺ پر بھی ایمان لے آیا۔ یہ گروہ ان اہل علم کا ہے جو حق کے مطابق لوگوں کی رہنمائی کرتا ہے اور حق کے مطابق ہی فیصلہ کرتا ہے۔

یہودیوں کو آنحضرت ﷺ پر ایمان لانے کی جو دعوت دی گئی اور اس سے پہلے ان کی بہت سی بدعنوانیاں بیان ہوئیں، اس سے یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ تمام بنی اسرائیل بدعنوانیوں کے مرتکب ہیں، اس لئے اب اللہ ﷻ نے یہ وضاحت فرمادی کہ سارے بنی اسرائیل ایک جیسے نہیں ہیں، اس میں وہ بنی اسرائیل بھی داخل ہیں جو آنحضرت ﷺ سے پہلے دین حق پر قائم رہے اور پھر آپ ﷺ پر ایمان لائے، مثلاً حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ وغیرہ۔

آیت نمبر ۱۶۰: صحرائے سینا میں بنی اسرائیل کے بارہ قبائل پر کیئے گئے احسانات میں سے تین کا بیان ہے۔

۱۔ اللہ ﷻ کے حکم سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چٹان پر لاٹھی ماری جس سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے۔

۲۔ ان کے لئے بادلوں کو سائبان بنایا گیا۔ ۳۔ انہیں من وسلویٰ کی صورت میں خوراک فراہم کی گئی۔

بنی اسرائیل نے اللہ ﷻ کے ان احسانات کا شکر ادا کرنے کے بجائے اس کی نافرمانیاں شروع کر دیں اور تاکیدی حکم کے باوجود من وسلویٰ کو ذخیرہ کرنا اور دوسروں کو ان کے حق سے محروم کرنا شروع کر دیا پھر انہیں ان نافرمانیوں کی سزا خود ہی بھگتنا پڑی کہ اس سے محروم کر دیئے گئے۔

علمی بات: حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹوں کی اولاد میں اللہ ﷻ نے بڑی برکت دی ان کی تعداد کثرت سے بڑھتی گئی، اور ان کی تعداد بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتی گئی، اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ انہیں مختلف جماعتوں میں تقسیم کر دیا جائے اور ہر جماعت کا ایک نگراں مقرر کر دیا جائے تاکہ ہر جماعت اپنے الگ الگ نظم ونسق کے مطابق زندگی گزارے اللہ ﷻ کے احکام کی پابندی کرے، بنی اسرائیل پر اللہ ﷻ کا یہ ایک احسان تھا۔

یہ اس دور کے واقعات ہیں جب بنی اسرائیل کو چالیس سال کے طویل عرصہ کے لئے صحرائے سینا میں روک دیا گیا تھا کیونکہ ان لوگوں نے جہاد سے انکار کر کے انتہائی بزدلی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس میدان میں دور تک کہیں پانی کا نام ونشان تک نظر نہ آتا تھا نہ کوئی کھانے پینے کی چیز ملتی تھی اور نہ کہیں کوئی سایہ یا مکان نظر آتا تھا جہاں جا کر وہ دھوپ سے پناہ لے سکیں گویا اللہ ﷻ نے ان کی ان ضروریات کا یوں اہتمام فرمایا کہ پورا چالیس سال کا عرصہ جب دھوپ تیز ہونے لگتی تو آسمان پر بادل چھا جاتے اور انہیں دھوپ سے بچاتے تھے پھر یہ کہ وہ برستے بھی نہیں تھے کہ بارش کی وجہ سے انہیں کہیں پناہ لینی پڑے، پینے کو پانی نہیں مل رہا تھا تو اللہ ﷻ نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ چٹان پر اپنا عصا ماریں اس سے بارہ الگ الگ چشمے پھوٹ نکلے اور یہ چشمے بھی اس طویل مدت میں بہتے ہی رہے ہر قبیلہ کو الگ الگ چشمہ پر اختیار اور قبضہ دیا گیا تاکہ ان میں پانی کی تقسیم پر جھگڑا نہ پیدا ہو، پھر کھانے کو من اور سلویٰ نازل فرمائے۔ نیز یہ کہ اس چالیس سال کے عرصہ میں بنی اسرائیل کی اپنی ہی تربیت کی جارہی تھی۔ تاکہ اس عرصہ میں اللہ ﷻ کے ان احسانات کا شکر ادا کرتے ہوئے صرف اسی کی عبادت بجالائیں اور ان سے وہ بزدلی دور ہو جو غلامی کی طویل زندگی میں ان کی رگوں میں رچ بس گئی تھی۔

علمی بات: المَنّ اہل لغت کی تحقیق میں یہ ایک میٹھی میٹھی رطوبت (نرم شے) تھی۔ جو درختوں پر گرا کرتی تھی۔ المَنّ کے متعدد معنی بیان کیئے گئے ہیں، میٹھا گوند، شہد، شربت وغیرہ۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ برف کی طرح تھا جو دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھا ہوتا تھا۔ لیکن اکثر کا خیال ہے کہ یہ ترنجبین تھی۔ ترنجبین سے متعلق قدیم طب کی کتابوں میں یہ درج ہے کہ شہد کی طرح جمی ہوئی اور لذیذ، آسمان گرنے والی شبنم کی قسم کی چیز ہے۔ بہر حال اتنا یقینی ہے کہ کوئی لذیذ قدرتی غذا تھی جو بنی اسرائیل کو مسلسل مسافرت کے زمانہ میں، بلا مشقت وتھکاوٹ مل جاتی تھی۔

سلویٰ: یہ ایک پرندہ تھا جو بٹیر سے مشابہ تھا اللہ ﷻ بنی اسرائیل کے پاس خوب زیادہ تعداد میں پرندے بھیج دیتا تھا جو بنی اسرائیل کی قیام گاہوں کے آس پاس کثرت سے منڈلاتے رہتے اور کوئی انہیں پکڑنا چاہتا تو آسانی سے پکڑ لیتا۔ وہ لوگ ان کو ذبح کر دیتے تھے۔ بٹیر جزیرہ نمائے سینا کا خاص جانور ہے اور بڑی کثرت سے پایا جاتا ہے۔ گرمی میں شمال کی طرف چلا جاتا ہے اور جاڑے میں جنوب کی طرف پھر آجاتا ہے۔ یہ پرندہ اونچا نہیں اُڑتا بلکہ بہت نیچے رہتا ہے، بہت جلدی تھک جاتا ہے اور شکار بڑی آسانی سے ہو جاتا ہے۔ ان کا گوشت چربی دار ہوتا ہے، رکھنے سے بہت جلد خراب ہو جاتا ہے۔

عملی پہلو: کفران نعمت اور منعم حقیقی کی مسلسل نافرمانی کرنے والے بالآخر اللہ ﷻ کے غضب کو دعوت دیتے ہیں۔

آیت نمبر ۱۶۱: جب بنی اسرائیل نے مختلف سبزیوں کی فرمائش کی تو ان سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ کسی شہر میں چلے جاؤ وہاں یہ سب کچھ دستیاب ہو جائے گا اور شہر جاتے ہوئے تواضع وانکساری کے حطّۃ یعنی گناہوں کی معافی کی صدا لگاتے جانا مگر ظالموں نے اس لفظ کو بدل دیا اور گھسٹتے ہوئے داخل ہوئے جس پر ان کو عذاب ہوا اور طاعون کی بیماری سے ہزاروں ہلاک ہو گئے۔ ایک قول کے مطابق یہ واقعہ حضرت یوشع علیہ السلام کے دور میں پیش آیا تھا۔ واضح رہے کہ بسا اوقات تاریخی ترتیب کو قرآنِ حکیم ملحوظ نہیں رکھتا ہے بلکہ اصل مقصود عبرت وموعظت کو پیشِ نظر رکھتا ہے۔

علمی وعملی بات: ایک چیز قرآنِ حکیم کا مطالعہ کرتے وقت ہمیشہ پیش نظر رہنی چاہیئے وہ یہ کہ قرآنِ حکیم جن واقعات کا ذکر کرتا ہے اس سے مقصود صرف عبرت ونصیحت ہوتی ہے اس سے اس واقعہ کی تاریخی حیثیت کا بیان مطلوب نہیں ہوتا۔ اس لئے قرآنِ حکیم اِن واقعات کے صرف اُن پہلوؤں کو بیان کرتا ہے جن میں درسِ عبرت ہو۔ عموماً تفصیلات کو حکمت کے پیش نظر ذکر نہیں کیا جاتا چنانچہ جو لوگ قرآنِ حکیم کی اس خصوصیت کو ملحوظ خاطر نہیں رکھتے وہ عموماً قصصِ قرآنی کی تفصیلات کا تسلسل اور زمان ومکاں کا تعین نہیں کر پاتے لہذا بعض اوقات خلجان وپریشانی کا شکار ہوتے ہیں لہذا ہمیں سیرت کی مستند کتابوں کا مطالعہ بھی کرنا چاہیئے۔

آیت نمبر ۱۶۲: بنی اسرائیل نے اللہ ﷻ کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے نافرمانی اختیار کی۔ اس نافرمانی کا یہ نتیجہ نکلا کہ ان پر عذاب مسلط کر دیا گیا۔

(سورۃ البقرۃ ۲: آیات ۵۸ اور ۵۹) چالیس سال صحرا میں بھٹکنے کے بعد جب یہ قوم اس بستی میں داخل ہوئی تو اس نے تمام وعدوں اور اللہ ﷻ کے احکامات کو بھلا دیا اور تکبر، سرکشی اور تمسخر کے ساتھ داخل ہوئے اور زبان پر توبہ کے کلمات کے بجائے دنیا طلبی کے کلمات جاری ہو گئے۔ تو پھر اللہ ﷻ نے ان پر "طاعون" جیسی بیماری کا عذاب مسلط کر دیا جس سے لاتعداد بنی اسرائیل موت کا شکار ہوئے۔

بنی اسرائیل کی زندگی سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ اگر وہ اپنے نبی کا کہا مانتے، اطاعت کرتے تو جس اللہ ﷻ نے صحرا میں کھانا، پانی اور سایہ عطا فرمایا، جس نے بغیر کسی جنگ کے ایک ملک عطا فرما دیا تھا اگر وہ اللہ ﷻ کی شکر گزاری کرتے تو اللہ ﷻ ان کو اس سے بھی زیادہ نعمتوں سے نواز تا لیکن ان کی سرکشی انہیں لے ڈوبی اور وہ عبرتناک انجام سے دوچار ہوئے۔

آیت نمبر ۱۶۳: دور نبوی ﷺ کے یہود کو اصحاب سبت کے واقعہ کی یاد دہانی کرائی گئی۔ اس یاد دہانی کا مقصد یہ بتانا تھا کہ یہ واقعہ اللہ ﷻ کے رسول ﷺ کے علم میں ہے جو آپ ﷺ کی صداقت کی دلیل ہے۔ اصحاب سبت وہ تھے جنھوں نے سبت یعنی ہفتہ کے دن کے قانون کی خلاف ورزی کی۔ ان کا تعلق بنی اسرائیل کے ایک قبیلہ سے تھا جو ایک دریا کے کنارے آباد تھا۔ اُن کے لئے ہفتہ کا دن عبادت کے لئے مقرر تھا اور اس دن مچھلیوں کے شکار کی ممانعت تھی۔ بطور آزمائش اسی دن مچھلیاں کثرت سے آتیں اور پانی پر ظاہر ہوتیں۔ ان لوگوں نے حیلہ اختیار کر کے اللہ ﷻ کے حکم سے تجاوز کیا اور گڑھے کھود لئے تاکہ مچھلیاں اس میں پھنسی رہیں اور ہفتہ کا دن گزرنے پر وہ انہیں پکڑ لیں۔ یہ ایک آزمائش تھی کیونکہ وہ اللہ ﷻ کی اطاعت سے کوتاہی کرتے تھے اور اللہ ﷻ کی حرمت کو توڑنے کے لئے مختلف طریقے اور حیلے بہانے ڈھونڈھتے تاکہ حکم خداوندی سے انحراف کر سکیں۔

اس آیت میں بنی اسرائیل کے آباءواجداد کا کفران نعمت اور ان کی سرکشی کے ایک واقعہ کا بیان ہے۔ یہود بھی اس سے بخوبی واقف ہیں۔ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ احکام خداوندی سے جان بوجھ کر انحراف کرنا یہود کی پرانی آبائی خصلت ہے جس کی سزا ان کو ملتی رہی۔ اسی لئے ان کی صورتوں میں مسخ کر کے بندر بنا دیا گیا جو انتہائی ذلت اور عبرت ناک سزا تھی۔

آیت نمبر ۱۶۴: بستی میں رہنے والے تین گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔

۱۔ ہفتہ کے دن حیلہ کر کے مچھلی کا شکار کرنے والے۔

۲۔ حیلہ سازی سے منع کرنے اور اللہ ﷻ کی نافرمانی سے مسلسل روکنے والے۔

۳۔ وہ جو حیلہ تو نہیں کرتے تھے لیکن تبلیغ کر کے تھک چکے تھے اور اب حیلہ کرنے والوں کو منع بھی نہیں کرتے تھے۔

آیت میں تیسرے گروہ کا دوسرے گروہ کو وعظ و نصیحت سے روکنے کا بیان ہے۔ دوسرے گروہ کی طرف سے نہی عن المنکر کے فریضہ کو اختیار کرنے کی وجہ بیان کی گئی ہے کہ: ۱۔ وہ اللہ ﷻ کے سامنے اپنا فریضہ ادا کر کے بری الذمہ ہو جائیں۔ ۲۔ شاید نافرمانی کرنے والے اللہ ﷻ سے ڈر کر خلاف ورزی ترک کر دیں اور توبہ کر کے پھر عذاب الٰہی سے بچ جائیں۔

عملی پہلو: اُس بستی کے ایک گروہ نے اللہ ﷻ کے حکم کی مسلسل خلاف ورزی کی اور مختلف حیلوں بہانوں سے ہفتے کے دن مچھلی کا شکار جاری رکھا اور اللہ ﷻ کی قائم کردہ حرمت کو پامال کر دیا۔ اس وقت بنی اسرائیل کا وہ طبقہ جو نافرماوں سے الگ اور لاتعلق تھا وہ نصیحت کرنے والوں سے کہتا تم ان لوگوں کو نصیحت کرتے ہو جو تمہاری نصیحت کا کوئی اثر نہیں لیتے اور بظاہر ایسا لگتا ہے کہ اللہ ﷻ ان کو ضرور سخت عذاب دے گا۔ ایسے لوگوں کو نصیحت کرنے سے کیا فائدہ۔ اس کے جواب میں منع کرنے والے لوگوں نے کہا کہ اللہ ﷻ نے نیکی کا حکم کرنا اور برائی سے روکنا ہم پر فرض کیا ہے۔ اسی لئے ہم ان کو نصیحت کرتے ہیں کہ ہم اللہ ﷻ کے سامنے یہ کہہ سکیں کہ ہم نے اپنا فریضہ انجام دیا تھا نیز شاید وہ کسی وقت ہماری نصیحت کا اثر قبول کرتے ہوئے اپنی نافرمانی سے باز آجائیں اور توبہ کر لیں۔

عملی پہلو: مذکورہ واقعہ سے دو اہم ترین نکتے حاصل ہوئے ہیں، پہلا نکتہ یہ ہے کہ جب معاشرے میں نافرمانی کا دور دورہ ہو جائے تو مسلمان کی ذمہ داری صرف یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو بچا لے بلکہ دوسروں کو راہ راست کی دعوت دینا بھی اس کی ذمہ داری ہے جس کے بغیر وہ مکمل طور پر بری الذمہ نہیں ہو سکتا، دوسرا نکتہ یہ ہے کہ حق کی دعوت دینے والے کو کبھی مایوس ہو کر نہیں بیٹھنا چاہیئے بلکہ پُر امید رہ کر پیغام حق پہنچاتے رہنا چاہیئے کہ شاید کوئی اللہ ﷻ کا بندہ بات سمجھ کر راہ راست پر آجائے۔

آیت نمبر ۱۶۵: نہی عن المنکر کے فریضہ کی اہمیت: پھر جب انہوں نے اس نصیحت کو بھلا دیا جو ان کو کی گئی تھی اور وہ سرکشی میں حد سے بڑھ گئے تو اللہ ﷻ نے ان لوگوں کو تو بچا لیا جو ان کو برائی سے روکتے تھے اور گناہ کا ارتکاب کرنے والے ظالموں کو ان کی نافرمانی کے سبب سخت عذاب میں پکڑ لیا اور ان کی صورتیں مسخ کر کے ان کو بندر بنا دیا۔ پھر تین دن بعد وہ سب مر گئے۔

فرمان نبوی ﷺ: "جو شخص تم میں سے کوئی بُرائی دیکھے تو اسے چاہیئے کہ اپنے ہاتھ (قوت) سے بدل دے اور اگر ایسا نہ کر سکے تو زبان سے روکے، یہ بھی نہ کر سکے تو دل میں ہی بُرا سمجھے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے"۔ (صحیح مسلم)

فرمان نبوی ﷺ: سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب لوگ ظالم کو (ظلم کرتے) دیکھیں اور اس کے ہاتھ نہ پکڑیں تو قریب ہے کہ اللہ ﷻ کی طرف سے ان پر عمومی عذاب نازل ہو۔ (جامع ترمذی)

اللہ ﷻ کی نافرمانی کا ارتکاب کر کے اصحاب سبت نے اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ نیک لوگوں کی نصیحت نہ ماننے اور حیلہ سے باز نہ آنے پر ان پر عذاب کا نزول ہوا۔ بہر حال بُرائی سے روکنے والے عذاب سے بچائے گئے۔ نجات کے لئے نیک بننے کے ساتھ اپنی استطاعت کے بقدر بھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنا لازم ہے۔

فرمان نبوی ﷺ: "تم لازماً نیکی کا حکم دو گے اور بدی سے روکو گے اور اگر ایسا نہ کیا تو تم پر اللہ ﷻ کا عذاب آئے گا۔ پھر تم دعائیں کرو گے اور تمہاری دعائیں قبول نہ ہوں گی"۔ (جامع ترمذی)

آیت نمبر ۱۶۶: عذاب کے باوجود اصحاب سبت کا حد سے گزرنے پر انجام بد کا بیان ہے۔ ان کو بندروں کی شکل میں تبدیل کر دیا گیا۔ کچھ وقت کے بعد وہ مر گئے۔ اس واقعہ کو موجودہ اور آئندہ اور آنے والوں کے لئے باعث عبرت بنا دیا گیا ہے۔

یہ لوگ اپنی سرکشی کی وجہ سے دنیا میں بندر بنا دیئے گئے اور بنی اسرائیل کو کہہ دیا گیا تھا کہ اگر تم نے نافرمانی اختیار کی تو اللہ ﷻ تمہیں ہمیشہ ذلیل و رسوا اور غیر اقوام کا محکوم رکھے گا چنانچہ مدت سے یہودی کسی نہ کسی سلطنت کے محکوم و مقہور ہی چلے آئے ہیں اور اب جو یہود کی ظاہری حکومت قائم ہے وہ عیسائی حکومتوں کی دستِ نگر ہے یہاں بھی درپردہ عیسائی حکومتیں اس کی پشت پناہی کر رہی ہیں تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وقت قرب قیامت ہے اور عنقریب قیامت کی نشانیاں پوری ہونے کے بعد اس کا وقوع ہو جائے گا۔

آیت نمبر ۱۶۷: بنی اسرائیل پر ان کی بداعمالیوں کی پہلی دنیاوی سزا کا بیان ہے۔ ان پر قیامت تک ایسے سخت گیر افراد مسلط کیئے جائیں گے۔ جو انہیں سخت عذاب میں مبتلا کرنے کے ساتھ اپنا محکوم بنا کر رکھے گیں۔ اللہ ﷻ کی ایک صفت شان تو یہ ہے کہ وہ عَزِیْزٌ ذُو انْتِقَام اور سَرِیْعُ الْعِقَاب ہے اور اس کی دوسری شان یہ ہے کہ وہ غَفُوْرٌ رَّحِیْم ہے۔ اب یہ انسانوں کے طرز عمل پر منحصر ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس کی کس شان کا مستحق بناتے ہیں۔

دور نبوی ﷺ اور قیامت تک کے یہود کو تنبیہ کی گئی کہ توبہ کر کے اسلام قبول کر لیں تو ذلت و رسوائی سے بچ سکتے ہیں۔ کسی قوم پر ظالم حکمران کا تسلط بھی اللہ ﷻ کا عذاب ہے جو اس قوم کی نافرمانیوں کی وجہ سے آتا ہے۔

علمی بات: قوم یہود حضرت داؤد علیہ السلام کے بعد سے آج تک محکوم بنی رہی ہے۔ کبھی یونانی، کشدانیوں اور کلدانیوں نے ان کو غلام بنایا، کبھی نصرانیوں کے زیر تسلط رہے اور ان کو جزیہ و خراج دیتے رہے۔ تقریباً چودہ سو سال تک وہ مسلمان حکومتوں کے باجگزار رہے۔ اب تقریباً ۳۴ سال سے جو اسرائیل کے نام سے حکومت قائم ہے وہ یہودیوں کی حکومت نہیں ہے بلکہ حقیقت میں وہ امریکہ اور دیگر مغربی ممالک کی چھاؤنی ہے اور اس چھوٹے سے علاقے کے یہودی امریکہ اور مغربی ممالک کے سہارے سے زندہ ہیں اور امریکی حکومت کے غلام ہیں۔ آخر کار وہ دجال کے مددگار بن کر نکلیں گے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے بعد مسلمان ان کو قتل کر دیں گے۔ یہ سب قرب قیامت میں ہو گا۔ مسلمانوں کو اس میں ایک گونہ بشارت ہے کہ اگر آج بھی مسلمان اپنی منتشر جمیعت کو یکجا و باہمت بنالیں تو یہود کو دست نگر و پست کرنا کچھ مشکل نہیں۔

آیت نمبر ۱۶۸: اس آیت میں یہود کو ان کی بداعمالیوں کے نتیجہ میں دنیا میں دی گئی دوسری سزا کا بیان ہے۔ کہ ان کی آبادی دنیا کے مختلف حصوں میں منتشر کر کے اللہ ﷻ نے ان کی جمعیت کو منتشر کر دیا۔ وہ دنیا کے مختلف ممالک میں بے بس اقلیت بن کر رہ گئے۔ ان میں سے بعض نیکوکار بھی ہیں۔ یعنی ان میں سے بعض تورات کے احکام پر کاربند رہنے والے ہیں اور بعض بدکار بھی ہیں۔ اسی طرح یہود کو خوشحالی اور تنگدستی دونوں حالتوں سے آزمائے جانے کا بیان بھی ہے۔ کہ ان کو راہ راست پر لانے کے لئے ان کے ساتھ لطف و عنایت کا رویہ بھی اپنایا گیا اور ان سے شدت و سختی والا معاملہ بھی اختیار کیا گیا۔ ان کی آزمائش کا مقصد یہ تھا کہ وہ اپنی بداعمالیوں سے باز آ کر اللہ ﷻ کی طرف رجوع کریں۔

عملی پہلو: بنی اسرائیل نے اللہ ﷻ کی طرف رجوع کرنے کے بجائے خواہشات نفسانی اختیار کی جس سے ان کی بھلائی کی طاقت و قوت مفلوج ہو کر رہ گئی اور وہ اپنی غلطی کا احساس رکھنے کے باوجود بھی اسی پر اڑے رہے۔ اور اپنے آپ کو اس دھوکہ میں رکھا کہ ہماری بخشش کر دی جائے گی کہ ہم اللہ ﷻ کے پیارے اور اس کے لاڈلے ہیں وغیرہ۔ سو یہی ان لوگوں کی من گھڑت امیدیں اور بے بنیاد آرزوئیں تھیں جنہوں نے ان کا بیڑا غرق کر کے رکھ دیا اور یہ عزت و عظمت کی بلندیوں سے گر کر ذلت و رسوائی کے ہولناک گڑھے میں جا پہنچے۔

بنی اسرائیل کے دور انتشار کی مختصر تاریخ: بنی اسرائیل کا یہ دور انتشار (Diaspora) ۷۰ عیسوی میں شروع ہوا' جب رومن جنرل ٹائٹس نے ان کے معبد ثانی (2nd Temple) کو شہید کیا (جو حضرت عزیر علیہ السلام کے زمانے میں دوبارہ تعمیر ہوا تھا)۔ ٹائٹس کے حکم سے یروشلم میں ہزاروں یہودیوں کو ایک دن میں قتل کیا گیا اور بچ جانے والوں کو فلسطین سے نکال باہر کیا گیا۔ چنانچہ یہاں سے ملک بدر ہونے کے بعد یہ لوگ مصر' ہندوستان' روس اور یورپ کے مختلف علاقوں میں جا بسے۔ پھر جب امریکہ دریافت ہوا تو بہت سے یہودی خاندان وہاں جا کر آباد ہو گئے۔ اس آیت میں ان کے اسی انتشار کی طرف اشارہ ہے کہ پوری دنیا میں انہیں منتشر کر دیا گیا اور اس طرح ان کی اجتماعیت ختم ہو کر رہ گئی۔

آیت نمبر ۱۶۹: اس آیت میں یہود کے علماء کا دنیا کے حقیر مال کے عوض دین فروشی کا بیان ہے کہ وہ تورات میں تحریف کے مرتکب تھے۔ انہوں نے اللہ ﷻ سے کیئے گئے عہد کی پاسداری نہ کی۔ وہ طالب دنیا ہونے کے باوجود مغفرت کی امید رکھتے ہیں۔ اور اللہ ﷻ کی طرف ناحق باتیں منسوب کرتے ہیں۔ اسی طرح دنیا کے مقابلے میں آخرت کو ترجیح دینے والوں کے لئے بشارت کا ذکر بھی ہے۔

علمی بات: ایک زمانے میں بنی اسرائیل میں اچھے اور بُرے سب طرح کے لوگ تھے۔ پھر ان لوگوں کے بعد ان کے جانشین ایسے ناخلف لوگ بنے کہ وہ تورات کے وارث بننے کے باوجود محض تھوڑے سے دنیاوی فائدے کی خاطر اور اسے ہی سب کچھ سمجھتے ہوئے آخرت پر ترجیح دیتے رہے اور اپنے دل کو یہ کہہ کر بہلا لیتے ہیں کہ پھر توبہ کر لیں گے، اس کے بعد جب دوبارہ مالی نفع کی کوئی صورت نکل آتی تو پھر حسب سابق دنیا کے بدلے دین کو بیچ دیتے، تورات میں تحریف کر کے، غلط مسئلہ اور غلط حکم بتا دیتے چنانچہ اس طرح انہوں نے تھوڑے سے دنیاوی فائدے کے لئے اپنی آخرت خراب کر ڈالی۔ انبیاء علیہم السلام کے بعد یہی لوگ تورات و انجیل کے وارث تھے اور اللہ ﷻ نے ان سے اس بات کا عہد لیا کہ حق بات کے سوا کوئی دوسری بات اللہ ﷻ کی طرف منسوب نہ کرنا، لوگوں کو حق بات کی تلقین کرنا اور حق کو نہ چھپانا لیکن انہوں نے اس حکم کو پس پشت ڈال دیا۔ وہ بخشش کی آرزو تو رکھتے ہیں مگر گناہوں کو نہیں چھوڑتے اور نہ توبہ پر قائم رہتے ہیں۔ اللہ ﷻ سے ڈرنے والوں کے لئے تو آخرت کا گھر ہی بہتر ہے۔ مگر پھر بھی یہ لوگ دنیا پر فریفتہ تھے۔ اور اتنی سادہ بات بھی نہیں سمجھتے تھے۔

عملی پہلو: یہود کا یہ مرض لاعلاج تھا۔ اور اس سے باز آنے کی ایک ہی صورت تھی کہ ان کے دل میں عذاب الٰہی کا خوف پیدا ہو اور اپنے ہولناک انجام سے ڈر کر وہ توبہ کریں۔ لیکن وہاں تو اب اس کی کوئی گنجائش بھی نہ رہی تھی۔ کیونکہ وہ ایک شدید مغالطہ میں مبتلا تھے کہ ہم اللہ ﷻ کے لاڈلے اور پیارے ہیں۔ ہمیں دوزخ کی آگ نہیں جلا سکتی۔ نیز ہم تورات کے عالم ہیں۔ ہمارے لئے اللہ ﷻ کی جناب میں ایسی خصوصی رعایتیں ہیں جن کی وجہ سے اس قسم کی بے راہ روی ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ ہماری بخشش کا ہم سے پختہ وعدہ کیا گیا ہے۔

عملی پہلو: جب کسی قوم کے ذمہ دار اور تعلیم یافتہ طبقہ کی اخلاقی پستی اور دنیا کی مادہ پرستی کا یہ حال ہو تو ان کے عوام کی حالت کیسی ہو گئی۔ امت مسلمہ کے اہلِ علم حضرات کو اپنی اولاد کی دینی تعلیم و تربیت کی طرف خصوصی توجہ دینی چاہیئے۔ مبادا ان کی اولاد بھی ان روحانی بیماریوں میں مبتلا ہو جائے جن میں بنی اسرائیل کی اولاد مبتلا ہو گئی اور نتیجتاً اللہ ﷻ کے غضب کا شکار ہو کر اپنی آخرت تباہ و برباد کر ڈالی۔ (اللھم احفظنا)

آیت نمبر ۱۷۰: اس آیت میں نافرمانوں کے بعد نیک لوگوں کی تین صفات کا بیان ہے۔

۱۔ وہ کتاب اللہ ﷻ کے حقوق ادا کرتے ہیں۔ ۲۔ نماز قائم کرتے ہیں۔

۳۔ اپنی اصلاح کے ساتھ دوسروں کی اصلاح کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ ان صفات کے حامل بندوں کا اجر ضائع نہیں کیا جاتا۔

عملی پہلو: اگر کوئی شخص احکام الٰہی پر کاربند ہے تو اس کے آباء و اجداد کے اعمال بد کی وجہ سے اس کے اعمال غارت نہیں کئے جائیں گے بلکہ اس کو ان کا اجر عظیم عطا فرمایا جائے گا۔

علمی بات: مفسرین کرام کی ایک رائے کے مطابق کہ ان سے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور ان کے اہلِ کتاب مومنین ساتھی مراد ہیں جو تورات پر بھی ایمان لائے تھے اور تورات میں انہوں نے اس طرح کی تحریف نہیں کی تھی اور نہ اس کے احکام کو بگاڑ کر کمائی کا ذریعہ بنایا تھا بلکہ خالص تورات پر عمل کرتے تھے پھر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بھی ایمان لائے اور آپ علیہ السلام کی اتباع کی۔

علمی و عملی بات: ۱۔ کتاب سے مراد وہی کتاب ہے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے یعنی تورات اور یہ بھی ممکن ہے کہ تمام آسمانی کتب تورات، زبور، انجیل، قرآنِ حکیم سب مراد ہوں۔

۲۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی کتاب کو صرف تبرکاً، اور تعظیم کے ساتھ رکھ لینا کافی نہیں ہوتا بلکہ اس کے احکام کی پابندی بھی لازم ہے۔

۳۔ تیسرا یہ کہ یہاں احکام تورات کی تعمیل اور پابندی کا ذکر تھا اور احکام تورات سینکڑوں ہیں، ان سے اس جگہ صرف اقامت صلوۃ کے ذکر پر اکتفاء کیا گیا اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ کتاب اللہ کے احکام میں سب سے زیادہ اہم اور افضل واعلیٰ نماز ہے نیز یہ کہ نماز کی پابندی احکام الٰہیہ پر کاربند ہونے کی خاص نشانی ہے کہ اس کے ذریعہ فرماں بردار اور نافرمانوں کی پہچان ہوتی ہے اور اس کی پابندی میں یہ خاصیت ہے کہ جو نماز کا پابند ہو گیا اس کے لئے دوسرے احکام خداوندی کی پابندی بھی سہل ہو جاتی ہے اور جس نے نماز کی پابندی نہ کی اس سے دوسرے احکام کی پابندی بھی نہ ہو سکے گی، جیسا کہ حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ نماز دین کا ستون ہے (جس پر اس کی تعمیر کھڑی ہوئی ہے) جس نے اس ستون کو قائم کر لیا اس نے دین کو قائم کر لیا اور جس نے اس کو منہدم کر دیا اس نے پورے دین کی عمارت منہدم کر دی۔

آیت نمبر ۱۷۱: اس آیت میں بنی اسرائیل سے کیئے گئے ایک خاص وعدہ کا ذکر ہے جو ان سے اس وقت لیا گیا جب طور پہاڑ کو زمین سے اٹھا کر ان کے سروں پر معلق کر دیا گیا تھا۔ اور اسی کیفیت وحالت میں ان سے تمام شریعت پر عمل کرنے کا عہد لیا گیا۔

علمی بات: جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات عطا فرمائی تو انہوں نے بنی اسرائیل کو فریضہ تبلیغ سے متعلق اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا حکم سنایا اور انہیں تورات کو قبول کرنے اور اس کے احکام پر عمل کرنے کا حکم دیا۔ بنی اسرائیل کو یہ بات گراں گزری۔ چنانچہ انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ اس کتاب میں دیئے ہوئے احکام سخت اور دشوار ہیں اس لئے ہم سے اس پر عمل نہیں ہو سکتا۔ اس پر فرشتوں نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حکم سے کوہ طور کے ایک حصے کو اٹھا کر سائبان کی طرح ان کے سروں پر معلق کر دیا۔ پھر ان سے کہا گیا کہ یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی وحی اور اس کے احکام ہیں۔ اس میں حلال و حرام اور امر و نہی کا ذکر ہے۔ پس تم اس کو قبول کر لو۔ اگر تم تورات اور اس کے احکام کو نہیں مانو گے تو یہ پہاڑ تمہارے سروں پر گرا دیا جائے گا۔ جب انہیں یقین ہو گیا کہ پہاڑ اب ان پر گر ہی جائے گا، تب انہوں نے تورات اور اس کے احکام پر عمل کرنے کا عہد کیا۔

علمی بات: یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ قرآنِ حکیم کا عام اعلان ہے لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ یعنی "دین میں کوئی جبر واکراہ نہیں" کہ کسی کو زبردستی دین حق کے قبول کرنے پر مجبور کیا جائے، اور اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کو دین کے قبول کرنے پر مجبور کیا گیا۔ لیکن ذرا غور کیا جائے تو دونوں میں فرق نظر آئیگا کہ کسی غیر مسلم کو اسلام کے قبول کرنے پر کبھی کہیں مجبور نہیں کیا گیا، لیکن جو شخص مسلمان ہو کر اسلامی عہد ومیثاق کا پابند ہو گیا اس کے بعد وہ اگر احکام اسلام کی خلاف ورزی کرنے لگے تو اس پر ضرور جبر کیا جائے گا اور خلاف ورزی کی صورت میں سزا دی جائے گی، اسلامی تعزیرات میں بہت سی سزائیں ایسے لوگوں کے لئے مقرر ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کا تعلق غیر مسلموں سے ہے کہ ان کو بالجبر مسلمان نہیں بنایا جائے گا اور بنی اسرائیل کے اس واقعہ میں کسی کو اسلام قبول کرنے کے لئے مجبور نہیں کیا گیا بلکہ ان لوگوں نے مسلمان ہونے کے باوجود تورات کے احکام کی پابندی سے انکار کر دیا، اس لئے ان سے جبراً پابندی کا عہد لینا لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ میں شامل نہ ہو گا۔

علمی بات: بنی اسرائیل پر طور پہاڑ بدعہدی کی سزا میں اٹھایا گیا ہے جامع ترمذی اور سنن ابن ماجہ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہدایت کے بعد وہی قوم گمراہ ہوتی ہے جو دین کی باتوں کو زبردستی کے جھگڑوں میں ڈال دے۔ اس حدیث کو آیت کی تفسیر میں بڑا دخل ہے کیونکہ آیت اور حدیث کو مدِ نظر رکھ کر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ کے یہود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت تسلیم کرنے میں جو پس و پیش سے کام لیتے تھے ان کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یہ بات یاد دلائی ہے کہ جس تورات پر عمل کرنے کا عہد تمہارے بڑوں سے لیا جا چکا ہے اسی تورات میں نبی آخر

الزمان ﷺ کے اوصاف اور ان پر ایمان لانے کا عہد موجود ہے پھر پس وپیش سے کام لینا اور جان بوجھ کر انکار کرنا چنانچہ تورات کا عہد یاد رکھ کر اور اس کے مطابق عمل پیرا رہنا چاہیئے اور بدعہدی کے وبال سے ڈرنا چاہیئے۔

آیت نمبر ۱۷۲: اس آیت میں تا قیامت پیدا ہونے والے تمام انسانوں کی روحوں سے لیئے گئے "عہد الست" کا بیان ہے۔ جس میں اللہ ﷻ نے اپنے رب ہونے کا عہد لیا تھا۔ تمام روحوں نے اللہ ﷻ کے اپنے رب ہونے کا اقرار کیا۔ یہ عہد لینے ایک وجہ یہ تھی:

عہد کی پہلی وجہ کہ تمام انسانوں پر اللہ ﷻ کی طرف سے اتمام حجت ہو جائے تا کہ وہ قیامت کے دن انکار نہ کر سکیں کہ ہم تو اس سے بے خبر تھے۔

علمی بات: یہی عہد روز قیامت مواخذہ کی اصل بنیاد ہے کہ ان کو انکار کا موقع نہ مل سکے گا کہ جس کی وجہ سے وہ اپنی حجت قائم کر سکیں نیز اس سے یہ فائدہ بھی ہوا کہ اسی عہد کی بنیاد پر توحید کی معرفت ہر انسان کے باطن میں رکھ دی گئی ہے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: ہر پیدا ہونے والا بچہ دین فطرت (اسلام) پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی یا عیسائی یا مجوسی بنا دیتے ہیں (صحیح بخاری)۔

حدیثِ قدسی ہے اللہ ﷻ فرماتا ہے میں نے اپنے بندوں کو حنیف (اللہ ﷻ کی طرف یکسوئی سے متوجہ ہونے والا) پیدا کیا ہے۔ پس شیطان ان کو ان کے دین (فطرت) سے گمراہ کر دیتا ہے۔ (صحیح مسلم)

آیت نمبر ۱۷۳: اس آیت میں "عہد الست" کی دوسری وجہ کا بیان ہے کہ انسان اپنے آباءواجداد پر اپنی گمراہی کی ذمہ داری ڈال کر خود بری الذمہ نہ ہو جائے۔ دنیا میں اس عہد کی یاد دہانی انبیاء کرام علیہم السلام اور آسمانی کتب کے ذریعہ کرادی گئی۔ ہر شخص سے یہ عہد انفرادی طور پر لیا گیا تھا تا کہ وہ یہ نہ کہہ سکے کہ اصل میں مشرک یا قصوروار تو ہمارے آباواجداد تھے اور ہمیں محض ان کی اولاد ہونے کی سزا کیوں دی جارہی ہے؟

نوٹ: متعدد احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاملہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے موقع پر پیش آیا تھا۔ اس وقت جس طرح فرشتوں کو جمع کر کے انسان اوّل کو سجدہ کرایا گیا تھا اور زمین پر انسان کی خلافت کا اعلان کیا گیا تھا، اسی طرح پوری نسل آدم کو بھی، جو قیامت تک پیدا ہو گی، اللہ ﷻ نے بیک وقت وجود اور شعور بخش کر اپنے سامنے حاضر کیا تھا اور ان سے اپنی ربوبیت کی شہادت لی تھی۔

آیت نمبر ۱۷۴: ان آیات کا اطلاق احکام، دلائل اور معجزات سب پر ہوتا ہے۔ اللہ ﷻ کی آیات پر غور کرنے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان اللہ ﷻ کی ربوبیت کا اعتراف کرے اور یہ اعتراف اسے اطاعت باری تعالیٰ پر آمادہ کرے۔ آیات کے واضح بیان کے باوجود شرک اور کفر میں مبتلا ہونے والا خود مجرم ہے۔ آخرت میں ایسے شخص کا کوئی عذر قبول نہیں ہو گا۔

عملی پہلو: اللہ ﷻ لوگوں پر اپنی قدرت کی نشانیاں اس لئے ظاہر کرتا ہے تا کہ وہ اس میں غور وفکر کریں اور اللہ ﷻ کو پہچان کر اُسی کی عبادت کریں، غفلت اور کج روی سے باز آجائیں، مطلب یہ ہے کہ آیات الٰہیہ میں ذرا بھی غور کریں تو وہ اس عہد ومیثاق کی طرف لوٹ آئیں جو ازل میں کیا گیا تھا۔

آیت نمبر ۱۷۵: اس آیت میں ایک ایسے شخص کا ذکر ہے جس کو اللہ ﷻ نے اپنی آیات کا علم عطا فرمایا تھا۔ وہ شخص دنیا کی محبت میں ڈوب گیا اور خواہشات کی پیروی میں لگ گیا۔ چنانچہ آیات الٰہی کو فراموش کرنے اور ذکر الٰہی سے غفلت کی وجہ سے شیطان اس پر مسلط ہو گیا۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے "جو رحمٰن کے ذکر سے غافل ہوتا ہے اس پر شیطان مسلط کر دیا جاتا ہے" (سورۃ الزخرف ۴۳، آیت: ۳۶) بالآخر اس کا انجام گمراہی کی صورت میں سامنے آیا۔

علمی وعملی بات: سانپ کے اپنی پرانی کھال یعنی خول کو اتار دینے کو عربی میں انسلخت الحیۃ من جلدھا کہتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ جس طرح سانپ اپنی پہلی کھال (کینچلی) کو اتار پھینکتا ہے اسی طرح اس شخص نے بھی ان آیات وہدایات کو اتار کر پھینک دیا اور اس کی جگہ گمراہی اور ضلالت کا لباس اوڑھ لیا۔ "اَتْبَعَ" کا معنی ہے کسی کے پیچھے لگنا۔ جب انسان دانستہ آیات ربانی کو فراموش کرتا ہے اور انہیں پس پشت ڈال دیتا ہے تو شیطان اس پر مسلط ہو جاتا ہے اور ہر لمحہ اس کے دل میں وسوسہ اندازی کرنے لگتا ہے۔ نتیجتاً وہ اللہ ﷻ کی نافرمانی کر کے باغی بن جاتا ہے۔

آیت نمبر ۱۷۶: وہ ہر شخص اللہ ﷻ کی آیات پر ایمان لا کر اور ان کی قدر کر کے اور احکام الٰہی کی پیروی سے بڑا رتبہ حاصل کر سکتا ہے۔ مگر بسا اوقات انسان اللہ ﷻ کی آیات کو جانتے ہوئے بھی ان کی قدردانی نہیں کرتا اور محض دنیاوی مفادات کی خاطر اللہ ﷻ کا نافرمان بن جاتا ہے۔ زمین کی طرف مائل ہونے سے مراد مادی مفادات ہی میں کھو جانا ہے چنانچہ مذکورہ آیت میں ذکر کردہ وہ شخص اپنی خواہشاتِ نفس کی لالچ میں وہ اس انتہا کو پہنچ گیا کہ اسے کتے سے تشبیہ دی

گئی۔ ''یلھث'' تھکاوٹ یا پیاس وغیرہ کی وجہ سے زبان باہر نکال کر ہانپنے کو کہتے ہیں۔ کتا ہر وقت ہانپتا رہتا ہے۔ حرص و لالچ میں اس کی زبان لٹکتی اور رال (لعاب دہن) ٹپکتی رہتی ہے۔ اسی طرح شیطان کی پیروی کرنے والا شخص دنیا کی لالچ میں مبتلا ہو کر حلال و حرام کی تمیز کھو دیتا ہے۔ آیات کو جھٹلانا قول و عمل دونوں طرح سے ہوتا ہے۔ یہود نے تورات کو عملی طور پر جھٹلایا۔ ان کے لئے گدھے کی مثال بیان ہوئی۔ (سورۃ الجمعہ ۶۲، آیت:۱۰) ان واقعات کے بیان کا مقصد یہ ہے کہ لوگ اللہ ﷻ سے عہد کو توڑنے کا انجام یاد رکھیں اور اس واقعہ سے عبرت حاصل کریں۔

علمی بات: ''اَلَّذِیْنَ کَذَّبُوْا'' سے مشرکین مکہ مراد ہیں جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے وہ پہلے تمنا کیا کرتے تھے کہ ان کے پاس اللہ ﷻ کی طرف سے کوئی ہادی اور رہنما آئے۔ جب اللہ ﷻ کا پیغمبر ہادی بن کر آ گیا تو اللہ ﷻ کی آیتوں کی تکذیب کرنے لگے اور ہدایت کو اختیار نہیں کیا ان لوگوں کی مثال بالکل اسی شخص کی سی ہے جسے اللہ ﷻ نے ہدایت دی مگر وہ ہدایت سے نکل کر شیطان کے تابع فرمان ہو گیا۔ اللہ ﷻ کی آیتوں کو جھٹلا کر اپنی جانوں پر ظلم کرنیوالوں کی مثال بہت ہی بُری ہے کوئی عقل مند انسان اس کو اپنے پر چسپاں کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔

عملی پہلو: یہ خستہ حالی، پریشانی اور ہر وقت کا اضطراب منکرین حق کے کسی ایک فرد کے ساتھ مخصوص نہیں۔ بلکہ جو بھی حق کو حق پہچانتے ہوئے اس سے روگردانی کرتا ہے اس کا یہی حال ہوتا ہے۔ اس چیز کے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ غفلت کے مارے ہوش میں آئیں اور عبرت و نصیحت حاصل کریں۔

وہ شخص جس کی مثال یہاں پیش کی گئی ہے، آیات الٰہی کا علم رکھتا تھا، یعنی حقیقت سے واقف تھا۔ اس علم کا نتیجہ یہ ہونا چاہیئے تھا کہ وہ اس رویہ سے بچتا جس کو وہ غلط جانتا تھا اور وہ طرز عمل اختیار کرتا جو اس کے علم کے مطابق صحیح تھا۔ علم و عمل کی بدولت اللہ ﷻ اس کو انسانیت کے بلند مراتب پر ترقی عطا کرتا۔ لیکن وہ دنیا کے فائدوں، لذتوں اور آرائشوں کی طرف جھک پڑا، خواہشات نفس کے تقاضوں کو مغلوب کرنے کے بجائے اس نے ان کی پیروی کی اور ان تمام حدود کو توڑ کر نکل بھاگا جن کی حفاظت کا تقاضا خود اس کا علم کر رہا تھا۔ پھر جب وہ محض اپنی اخلاقی کمزوری کی بنا پر جانتے بوجھتے حق سے منہ موڑ کر بھاگا تو شیطان جو قریب ہی اس کی گھات میں لگا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے لگ گیا اور برابر اسے ایک پستی سے دوسری پستی کی طرف لے جاتا رہا یہاں تک کہ اُس ظالم نے اسے ان لوگوں کے زمرے میں پہنچا کر ہی دم لیا جو اس کے دام میں پھنس کر پوری طرح اپنی متاع عقل و ہوش گم کر چکے ہیں۔

کتے کی ناک چلتے پھرتے زمین سونگھنے ہی میں لگی رہتی ہے کہ شاید کہیں سے کچھ کھانے کو مل جائے۔ اسے پتھر ماریئے تب بھی وہ یہ توقع رکھتا ہے کہ شاید یہ پھینکی گئی چیز کوئی ہڈی یا روٹی کا کوئی ٹکڑا ہو۔ نفس کا بندہ بھی کچھ اسی صفت کا حامل ہوتا ہے۔ بہت کچھ مل جانے کے باوجود بھی وہ لالچ کا مارا توقعات کی ایک دنیا دل میں لیئے، زبان لٹکائے، ہانپتا رہتا ہے۔ ساری دنیا کو وہ بس حرص ہی کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ ایک کتا پورے مردار جانور سے صرف اپنا حصہ لینے پر اکتفانہ کرے گا بلکہ اسے صرف اپنے ہی لئے خاص کرنا چاہے گا اور کسی دوسرے کتے کو اس کے پاس نہ بھٹکنے دے گا۔ الغرض تشبیہ کا مدعا یہ ہے کہ دنیا پرست آدمی جب علم اور ایمان کی رسّی تُڑا کر بھاگتا ہے اور نفس کی اندھی خواہشات کے ہاتھ میں اپنی باگیں دے دیتا ہے تو پھر کتے کی حالت کو پہنچے بغیر نہیں رہتا۔

عملی پہلو: حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ مثال تمام کفار اور معاندین و مکذبین پر صادق آتی ہے جو حق واضح ہو جانے کے بعد بھی احکام الٰہیہ چھوڑ کر کتے کی طرح دنیا کی حرص و طمع میں پڑے رہے اور خسر الدنیا والآخرۃ یعنی دنیا و آخرت کی بربادی کا مصداق ٹھہرتے ہیں۔

اس واقعہ میں اہل علم کے لئے بالخصوص اور دیگر لوگوں کے لئے بالعموم تنبیہ اور مقام عبرت ہے کہ جس کو اللہ ﷻ علم کے نور اور ہدایت سے نوازے تو وہ نفسانی خواہش کی ہرگز اتباع نہ کرے اور یہ آیت اپنے عموم کے لحاظ سے ہر ہوا پرست عالم کو شامل ہے۔ چنانچہ اس میں یہ سبق مقصد ہے کہ جس شخص کو اللہ ﷻ نے علم و عبادت کے شرف سے نوازا ہو اس کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ احتیاط اور تقویٰ سے کام لینا چاہیئے اور اللہ ﷻ کی پناہ طلب کرتے رہنا چاہیئے۔

لمحہ فکریہ! یہ حقیقت ہے کہ امت قرآنِ حکیم کے احکام اور نبی کریم ﷺ کی تعلیمات کو پس پشت ڈال دینے کی وجہ سے زوال کا شکار ہے؟ اللہ ﷻ اور اُس کے رسول ﷺ کے احکامات پر انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر عمل کرنے سے ہی دنیا اور آخرت کی بھلائیاں میسر آئیں گی اور پستی بلندی میں اور کمزوری قوت میں بدل جائیگی۔

آیت نمبر ۱۷۷: اللہ ﷻ کی آیات کو جھٹلانے والوں کے لئے کتے کی مثال سب سے بُری مثال ہے۔ یہ مثال فقط ایک شخص کی نہیں بلکہ پوری قوم کے لئے بھی دی گئی ہے مثلاً مشرکین مکہ یا بنی اسرائیل۔ ایسے لوگ خود اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔ وہ اللہ ﷻ کا کوئی نقصان نہیں کر سکتے۔

اس قصّہ میں یہودیوں کے لئے خصوصی طور پر نصیحت اور عبرت حاصل کرنے کا موقعہ ہے کیونکہ انہیں بنی اسرائیل کے پرانے واقعات معلوم تھے اور اس میں مشرکین مکہ کے لئے بھی سامان عبرت اور نصیحت ہے اور یہ واقعات آنحضرت ﷺ کو کسی انسان نے نہیں بتائے بلکہ آپ ﷺ نے وحی الٰہی کے ذریعے لوگوں کو بتائے ہیں۔ حاصل کلام یہ ہے کہ یہود کے ساتھ ساتھ مشرکین مکہ کو بھی ایمان لانے کی طرف یہ واقعات مجبور کر رہے ہیں جو کہ آپ ﷺ کی دعوت کا عین منشاء ہے۔

آیت نمبر ۱۷۸: ہدایت یافتہ کو واحد اور گمراہی اختیار کرنے والوں کے لئے جمع کے صیغوں کا استعمال کرنے میں یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہدایت کا راستہ صرف ایک ہی دین حق ہے، جو حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر آنحضرت ﷺ تک تمام انبیاء علیہم السلام کا طریقہ رہا ہے۔ اس لئے حق کی پیروی کرنے والے خواہ کسی زمانے کے ہوں، کسی بھی نبی کی امت ہوں، وہ سب ایک ہیں اس کے برعکس گمراہی کے مختلف اور بیشمار راستے ہیں کیونکہ اس کے اسباب بے شمار ہیں۔

عملی و عملی بات: یعنی انسان کو اس کا علم و فضل صرف اس صورت میں فائدہ دے سکتا ہے جبکہ اللہ ﷻ کی طرف سے اس علم پر عمل کرنے کی توفیق بھی نصیب ہو لہذا کسی شخص کو اپنی علمی قابلیت اور فضیلت پر نازاں نہ ہونا چاہیئے۔ بلکہ عقل و فکر کی بُرائی سے بچنے اور سیدھی راہ پر چلنے کی توفیق کے لئے اللہ ﷻ سے دعا بھی کرتے رہنا چاہیئے۔ کیونکہ شیطان علم کی راہ سے بھی انسانوں کو گمراہ کر سکتا ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ اکثر گمراہ فرقوں کے پیشوا عموماً ذہین و فطین اور علم رکھنے والے ہی ہوا کرتے ہیں۔

علمی بات: یہاں نبی کریم ﷺ کے لئے تسلی واطمینان اور قریش کے لئے وعید ہے کہ ہدایت وضلالت کے معاملے میں اللہ ﷻ کا ایک قانون ہے۔ اس کے تحت ہدایت انہی کو ملتی ہے جو اس کے سچے طالب ہوتے ہیں اور جو خواہشوں کی غلامی اختیار کر لیتے ہیں، وہ گمراہی کے لئے چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ اُنہیں کبھی راہ ہدایت نصیب نہیں ہوتی۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے جس کی سیدھے راستے کی طرف ہدایت و رہنمائی کر دی وہی ہدایت یافتہ ہے اور جس کو فطری صلاحیت استعمال نہ کرنے کی بنا پر گمراہ کر دیا وہ خسارہ اور نقصان اٹھانے والا ہے۔ یہ مضمون قرآنِ حکیم میں متعدد بار آیا ہے۔ اللہ ﷻ نے انسان کو انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ صحیح اور غلط دونوں راستے بتا دیئے اور اس کو ایک خاص قسم کا اختیار بھی دے دیا ہے۔ اب اگر وہ چاہے تو اپنے اس اختیار کو استعمال کر کے صحیح اور سیدھا راستہ اختیار کر لے، جو اس کو ثواب اور جنت کا مستحق بنا دے گا اور چاہے غلط راستہ اختیار کر لے، جو اس کو عذاب اور جہنم کا مستحق بنا دے گا۔

آیت نمبر ۱۷۹: جنات اور انسانوں کی اکثریت جہنم میں جانے کی روش پر کاربند رہتی ہے گویا جہنم کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ ایسے لوگ اللہ ﷻ کی نعمتوں کو صحیح طور پر استعمال نہیں کرتے۔ ان کے دل معنوی اعتبار سے مردہ، نگاہیں عبرت حاصل کرنے سے قاصر اور کان حق سننے سے محروم ہیں۔ ایسے لوگوں کو چوپایوں سے بدتر کہا گیا ہے کیونکہ پالتو چوپائے بھی اپنے مالک کی خواہش کو اپنی خواہش پر مقدم رکھتے ہیں۔

علمی بات: یہاں ان کے عبرت ناک انجام کی وجہ بیان کی جا رہی ہے کہ ایسے لوگ جہنم کا ایندھن اس لئے بنائے گئے کہ دعوت حق کو سمجھنے، پیغام ہدایت کو سننے اور اس کے روشن شواہد کو دیکھنے کی جو صلاحیتیں انہیں عطا فرمائی گئی تھیں انہوں نے انہیں بیکار کر کے چھوڑ دیا اور بے عقل چوپایوں کی طرح ہو کر رہ گئے۔ جس طرح ان چوپایوں کی ساری قوتیں کھانے پینے اور خواہشات نفسانی کی تکمیل میں صرف ہوتی ہیں اسی طرح ان انسان نما حیوانوں کا مقصد بھی یہی ہے کہ اچھا کھائیں اور دوسری لذتوں سے لطف اندوز ہوں۔ زندگی کا کوئی اعلیٰ مقصد پیش نظر نہیں بلکہ بعض حالات میں تو یہ حیوانوں سے بھی بدتر ہیں کیونکہ وہ حیوانات بے عقل و بے سمجھ ہونے کے باوجود اپنے مالک کی خدمت گزاری سے منہ نہیں موڑتے اور اس کے بلانے پر بھاگے چلے آتے ہیں۔ مگر ان لوگوں کو تو یاد تک نہیں کہ ہمارا بھی کوئی خالق و مالک ہے اس لحاظ سے تو یہ حیوانوں سے بھی بدرجہا بدتر ہیں۔

علمی بات: یعنی جب انسان ہدایت سے منہ موڑتا ہے اور ہٹ دھرمی پر اتر آتا ہے تو نتیجتاً اللہ ﷻ ایسے لوگوں کے دلوں پر مہر کر دیتا ہے۔ ان کی آنکھیں انسانی آنکھیں نہیں رہتیں اور نہ ان کے کان انسانی کان رہتے ہیں۔ اب ان کا دیکھنا سننا حیوانوں جیسا رہ جاتا ہے۔ اسی وجہ سے قبول ہدایت سے محروم رہتے ہیں۔

آیت نمبر ۱۸۰: اسمائے حسنیٰ سے مراد اللہ ﷻ کے مبارک نام ہیں جن سے اللہ ﷻ کی صفات، عظمت اور اس کی قدرت کا اظہار ہوتا ہے۔ اسمائے حسنیٰ کے حوالہ سے دو ہدایات دی گئی ہیں:

۱۔ مشکلات و حاجات کے لئے اللہ ﷻ کو پکارا جائے۔ ۲۔ ان ہی ناموں سے اللہ ﷻ کو پکارا جائے جو بتائے گئے ہیں۔

نیز اللہ ﷻ کے ناموں میں ٹیڑھ اختیار کرنے والوں سے تعلق رکھنے کی ممانعت کی گئی ہے۔

ٹیڑھ اختیار کرنے کی تین صورتیں:

۱۔ اللہ ﷻ کے ناموں میں تبدیلی کرنا۔ ۲۔ اللہ ﷻ کے ناموں میں اضافہ کرنا یعنی ایسے نام گھڑ لینا جن کی اجازت نہیں۔ ۳۔ اللہ ﷻ کے ناموں کا غلط استعمال کرنا۔

علمی و عملی بات: غافلین کے ذکر کے بعد مومنین کو متنبہ فرمانے کے لئے اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ تم غفلت اختیار نہ کرنا، غفلت دور کرنے والی چیز اللہ ﷻ کا ذکر ہے۔ پس تم اس کو اچھے ناموں اور اچھی صفات سے یاد کرو۔ اچھے ناموں سے مراد وہ نام ہیں جو صفات کمال کے اعلیٰ درجے پر دلالت کرنے والے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ کسی کمال کا اعلیٰ درجہ جس سے اوپر کوئی اور درجہ نہ ہو وہ صرف خالق کائنات ہی کو حاصل ہے۔ اس کے سوا مخلوق میں سے کسی کو بھی یہ مقام حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ ہر کامل سے دوسرا شخص اکمل اور ہر فاضل سے دوسرا شخص افضل ہو سکتا ہے جب یہ معلوم ہو گیا کہ اسمائے حسنیٰ اللہ ﷻ ہی کی ذات کے ساتھ خاص ہیں تو اس کو انہی اسماء حسنیٰ کے ساتھ پکارنا ضروری و لازم ہے۔ یہ ہدایت بھی دی گئی ہے کہ جو لوگ اللہ ﷻ کے اسماء حسنیٰ میں تحریف و کج روی یعنی ٹیڑھ سے کام لیتے ہیں اور غلط راہ اختیار کرتے ہیں، آپ ایسے لوگوں سے قطع تعلق کر لیں اور ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ بہت جلد ان کو اللہ ﷻ کے اسماء وصفات میں کج روی کی سزا مل جائے گی۔

علمی بات: لغت میں الحاد کے معنی ہیں کسی ایک طرف مائل ہونا، اسی سے لحد ہے جو اس قبر کو کہا جاتا ہے جو ایک طرف بنائی جاتی ہے۔ حق سے تجاوز کرنا، سیدھی راہ سے منہ موڑنا۔ دین میں الحاد اختیار کرنے کا مطلب کج روی اور گمراہی اختیار کرنا ہے۔ الحاد کی دو قسمیں ہیں ایک اللہ ﷻ کے ساتھ شرک کرنا ہے یہ ایمان کے منافی ہے۔ دوسری قسم ہے اسباب کو شریک بنانا یہ ایمان کو کمزور کرتا ہے اور ایمان کی گرہ کو نہیں کھولتا۔ اللہ ﷻ کے اسماء میں الحاد کرنے کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم یہ ہے کہ اللہ ﷻ کی ایسی صفت بیان کی جائے جس کے ساتھ اس کو موصوف کرنا جائز نہیں ہے۔ دوسری قسم یہ ہے کہ اللہ ﷻ کی صفات کی ایسی تاویل کی جائے جو اس کی شان کے لائق نہیں ہے۔

محققین نے بیان کیا ہے کہ اللہ ﷻ کے اسماء میں الحاد تین قسم پر ہے:

۱۔ اللہ ﷻ کے اسماء مقدسہ طاہرہ کا غیر اللہ پر اطلاق کیا جائے جیسا کہ کفار نے اپنے بتوں پر اللہ ﷻ کے ناموں کا ان میں تصرف کر کے اطلاق کیا۔ مثلاً انہوں نے لفظ اللہ ﷻ سے ہی ایک بت کا نام لات بنایا اور العزیز سے عزیٰ بنایا اور المنان سے منات بنایا اور مسیلمہ کذاب کو اس کے پیروکار رحمٰن یمامہ کہا کرتے تھے۔

۲۔ اللہ ﷻ کا ایسا نام رکھنا جو اس کے حق میں جائز نہیں ہے جیسے عیسائی اللہ ﷻ کو "ابو المسیح" یعنی مسیح کا باپ کہتے ہیں۔ (نعوذ باللہ) یا اللہ ﷻ کے ناموں میں اپنی طرف سے اضافہ کر لینا جس کا حکم اللہ ﷻ نے نہیں دیا۔

۳۔ بندہ اپنے رب کا ایسے الفاظ کے ساتھ ذکر کرے جس کا معنی وہ نہیں جانتا، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی ایسے لفظ کا ذکر کرے جس کا معنی اللہ ﷻ کی شانِ عالی کے لائق نہیں ہے یا اس کے ناموں میں کمی کر دی جائے مثلاً اسے ایک ہی مخصوص نام سے پکارا جائے اور دوسرے صفاتی ناموں سے پکارنے کو بُرا سمجھا جائے اسی طرح اسماء الٰہیہ کو سحر وغیرہ کے لئے استعمال کرنا بھی الحاد کے طریقوں میں شامل ہے۔

آیت نمبر ۱۸۱: ایک رائے یہ ہے کہ اس گروہ سے مراد نبی کریم ﷺ کی امت ہے جس کا اصل مصداق حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں اور پھر وہ لوگ جو ان کے نقشِ قدم پر چلیں۔ ہر امت میں ایک گروہ حق پر قائم رہتا ہے خواہ اس کی تعداد کتنی ہی کم ہو۔ یہی الفاظ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے بارے میں آئے تھے۔ (سورۃ الاعراف ۷: آیت ۱۵۹) "اور موسیٰ (علیہ السلام) کی قوم میں ایک گروہ (ایسا بھی) ہے وہ حق کے ساتھ رہنمائی کرتے ہیں اور اسی کے مطابق انصاف کرتے ہیں۔"

عدل پر قائم اس گروہ کی دو صفات کا بیان ہے:

۱۔ خود بھی شریعت کی اتباع کرتے ہیں۔ ۲۔ اگر کبھی جھگڑا پیش آئے تو اس کا فیصلہ شریعت کے قانون کے مطابق کرتے ہیں۔

عملی بات: امت محمدیہ نے ہر قسم کی افراط و تفریط اور کج روی سے علیحدہ ہو کر سچائی اور انصاف و اعتدال کا طریقہ اختیار کیا اور وہ اسی کی لوگوں کو دعوت دیتی ہے۔ اگر ان میں آپس میں کوئی تنازع پیدا ہو جائے تو وہ اپنے جھگڑوں اور غیروں کے معاملات کا فیصلہ عدل و انصاف کے ساتھ کرتی ہے۔

انہوں نے اپنی پوری زندگی کو حق کے تابع بنایا۔ جس جماعت کی قیادت ورہنمائی کی وہ بھی محض حق کے تقاضوں کے تحت کی اور باہمی تنازعات میں بھی ہمیشہ حق کے سامنے سر تسلیم خم کیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین کرام کی پوری تاریخ اس کی آئینہ دار ہے۔ جب سے اُمّتِ محمدیہ نے ان صفات کو نظر انداز کرنا شروع کیا، اسی وقت سے اس کا تنزل وانحطاط شروع ہو گیا۔

آیت نمبر ۱۸۲: اللہ ﷻ کی آیات سے مراد احکام، معجزات اور دلائل ہیں۔ ''استدراج'' کا معنی درجہ بدرجہ یا آہستہ آہستہ آگے بڑھنا ہے۔ آیات سے اعراض کرنے والوں کو دنیاوی مال واسباب میں بڑھنے کی ڈھیل دی جاتی ہے۔ ان کی یکدم گرفت نہیں کی جاتی۔ ان کی توقع کے برخلاف ایسے موقع پر ان کی گرفت کی جاتی ہے کہ ان کو پتہ بھی نہیں چلتا۔ مطلب آیت کا یہ ہے کہ ہم انکو دنیاوی نعمتوں سے خوب نوازتے ہیں جب وہ ان نعمتوں میں خوب مست ہو جاتے ہیں تب یک لخت پکڑتے ہیں اور غفلت کی حالت میں ان کو ہلاک کر دیں گے۔

علمی بات: یہ کوئی ضروری نہیں کہ جو لوگ دنیا میں اللہ ﷻ کی آیتوں کو جھٹلاتے ہیں، اللہ ﷻ فوراً ان کا مواخذہ کرے اور نہ یہ کوئی معیار ہے کہ جس شخص پر دنیا میں مال، رزق اور صحت وغیرہ کے اعتبار سے تنگی وسختی ہے تو وہ جہنمی ہے اور عتاب الٰہی میں گرفتار ہے اور جو خوشحال ہے وہ اللہ ﷻ کے نزدیک محبوب ہے۔ بلکہ جو لوگ اللہ ﷻ کی آیتوں کو جھٹلاتے ہیں اللہ ﷻ ان کے کفر وگناہ اور تکذیب کے باوجود ان پر رزق کے دروازے کھول دیتا ہے اور ان کو ہر قسم کی نعمتوں اور آسائشوں میں رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ عیش وعشرت میں مست اللہ ﷻ کی سزا سے بے فکر ہو کر، جرائم کے ارتکاب پر زیادہ دلیر ہو جاتے ہیں اور منعم حقیقی کو بالکل بھول جاتے ہیں تو اللہ ﷻ ان کو دفعتاً ایسی ناگہانی بلا میں گرفتار کر دیتا ہے جس کی ان کو خبر بھی نہیں ہوتی یا جب ان کو موت آجاتی ہے تو ان کی ساری عیش و آسائش جاتی رہتی ہے اور وہ عذاب وذلت میں جا پڑتے ہیں۔

آیت نمبر ۱۸۳: گزشتہ آیت میں نافرمانوں کے حوالہ سے ''استدراج'' کا ذکر تھا۔ اب اللہ ﷻ کی آیات کو جھٹلانے والوں کو مہلت دیئے جانے کا بیان ہے۔ یہ مہلت افراد اور اقوام کو بطور امتحان دی جاتی ہے۔ مواخذہ کا وقت آنے پر انہیں ان کے انجام سے دوچار کر دیا جاتا ہے۔ اس وقت اللہ ﷻ کی گرفت سے کوئی نہیں بچ پاتا کیوں کہ اللہ ﷻ کی تدبیر بڑی مضبوط ہوتی ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ کی سنت یہ ہے کہ وہ مجرم لوگوں پر سرزنش اور تنبیہ کے طور پر پہلے چھوٹے چھوٹے دکھ اور تکلیفیں نازل فرماتا ہے اگر لوگ ان سے عبرت حاصل کر لیں تو خیر ورنہ انہیں ایک دوسرے طریقہ سے آزماتا ہے۔ یعنی ان پر خوش حالی اور آسودگی کا دور آتا ہے جس میں وہ ایسے مگن اور مستغرق ہو جاتے ہیں کہ انہیں سابقہ تکلیفیں یاد ہی نہیں رہتیں اور وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اللہ ﷻ ان پر مہربان ہے حالانکہ اللہ ﷻ انہیں محض اس لئے مہلت دے رہا ہوتا ہے کہ جس انتہا کو پہنچنا چاہتے ہیں پہنچ جائیں تو پھر یکدم انہیں ان کے انجام سے دوچار کر دیتا ہے اس وقت لوگوں کو کوئی طاقت اللہ ﷻ کے عذاب سے بچا نہیں سکتی۔

آیت نمبر ۱۸۴: ''صاحب'' سے مراد رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی ہے۔ دعوت حق پیش کرنے پر رسول اللہ ﷺ کو مشرکین مکہ کبھی ساحر اور کبھی مجنون کہتے تھے۔ (معاذاللہ) ایسا کہنا دراصل ان کی ہٹ دھرمی اور غور وفکر نہ کرنے کا نتیجہ تھا۔ جبکہ انہی لوگوں نے آپ ﷺ کو صادق وامین بھی کہا تھا۔ نیز اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کا مشرکین مکہ کی خیر خواہی کرنے اور ان کے انکار اور بد عملی کے نتائج سے خبر دار کرنے کا ذکر ہے۔

علمی بات: جب نبی کریم ﷺ نے کوہ صفا پر چڑھ کر شب کے وقت قبیلہ قبیلہ کو پکارا اور فرمایا کہ میں تمہیں عذاب الٰہی سے ڈرانے والا ہوں اور آپ نے انہیں اللہ ﷻ کا خوف دلایا اور پیش آنے والے حوادث کا ذکر کیا تو ان میں سے کسی نے آپ ﷺ کی طرف جنون کی نسبت کی۔ اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

مشرکین مکہ آنحضرت ﷺ کو پیغمبر ماننے کے بجائے کبھی (معاذاللہ) آپ کو مجنون قرار دیتے، کبھی شاعر یا جادوگر کہتے تھے، یہ آیت بتا رہی ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بارے میں ایسے بے سروپا تبصرے وہی کر سکتا ہے جو بے سوچے سمجھے بات کرنے کا عادی ہو، اگر یہ لوگ ذرا بھی غور کر لیں تو ان پر اپنے ان الزامات کی حقیقت واضح ہو جائے۔ آنحضرت ﷺ ہمیشہ انہی لوگوں کے درمیان رہے۔ یہ لوگ آپ ﷺ کے حال سے پوری طرح واقف ہیں۔ دنیاوی لذات سے کنارہ کشی اور ہمہ تن آخرت کی طرف متوجہ رہنا، دن رات لوگوں کو حکمت ودانائی کی باتیں بتانا اور ان کو وعظ ونصیحت کرنا اور آخرت کے عذاب سے خبر دار کرنا، یہ سب کسی مجنون اور دیوانے سے سرزد نہیں ہو سکتا۔ ان کے بارے میں جنون کا گمان کرنا خود جنون ہے۔

آیت نمبر ۱۸۵: اس آیت میں کفار کو کائنات کے نظام اور مخلوقات میں غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے۔ انہیں ان کی عمر کی مدت اور فرصت عمل پر نظر کی دعوت دی گئی ہے۔ مہلت عمل کبھی بھی ختم ہو سکتی ہے۔ لفظ حدیث کا لغوی مفہوم ہے "بات" یہاں لفظ "حدیث" سے مراد قرآنِ حکیم ہے۔ یہ لوگ اگر قرآنِ حکیم سن کر بھی ایمان نہ لائیں گے تو پھر کبھی ایمان نہ لا سکیں گے۔

علمی بات: اگر یہ لوگ اس حکمتوں بھری کائنات میں صحیح طریقے سے غور و فکر سے کام لیں، تو ان کے سامنے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جائے گی کہ جس چیز کی طرف ان کو اللہ ﷻ کے پیغمبر بلا رہے ہیں اس کی تصدیق و تائید اس پوری کائنات سے ہو رہی ہے اور اس کی صدا اس کے گوشے گوشے سے بلند ہو رہی ہے اور اس کائنات میں صحیح طریقے سے غور کرنے والا پکار اٹھے گا کہ اللہ ﷻ نے اس کائنات کو بے کار و بے مقصد نہیں پیدا فرمایا۔

نوٹ: یعنی اگر آیات قرآنیہ پر ایمان نہ لائے تو دنیا میں اور کون سی بات اور کون سا کلام ہے جس پر ایمان لانے کی امید کی جا سکتی ہے تو پھر سمجھ لو کہ ان بد نصیبوں کے لئے دولت ایمان مقدر ہی نہیں۔

آیت نمبر ۱۸۶: اس آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ ہدایت دینے اور گمراہ کرنے کا اختیار اللہ ﷻ کے پاس ہے۔ قانون ہدایت یہ ہے کہ جو جیسی طلب و تڑپ رکھتا ہے اس کے ساتھ اسی طرح کا معاملہ کیا جاتا ہے۔ نشانیاں دیکھنے اور قرآنِ حکیم سننے کے باوجود ایمان نہ لانے والوں کے انجام کا ذکر ہے۔ وہ سرکشی میں سرگرداں رہتے ہوئے اپنے بُرے انجام کو پہنچ جاتے ہیں۔

ہدایت و ضلالت، ہر چیز اللہ ﷻ کے قبضہ میں ہے۔ وہ نہ چاہے تو سارے سامان ہدایت رکھے کے رکھے رہ جائیں۔ آدمی کہیں سے بھی ہدایت نہ پا سکے عام طور پر وہ جب ہی ہدایت کی توفیق دیتا ہے جب بندہ خود اپنے کسب و اختیار سے اس راستہ پر چلنا چاہے۔ باقی جو دیدہ و دانستہ بدی اور شرارت ہی کی ٹھان لے تو اللہ ﷻ بھی راستہ دکھلانے کے بعد اسے اسی کے حال میں چھوڑ دیتا ہے۔

آیت نمبر ۱۸۷: قریش مکہ کے قیامت کے متعلق سوال پر اس آیت کا نزول ہوا۔ قیامت کا حتمی علم اللہ ﷻ کے پاس ہے۔ وہی مقررہ وقت پر اسے ظاہر فرمائے گا۔ قیامت کی آمد اچانک ہو گی۔ اس کا واقع ہونا آسمانوں اور زمین پر بہت بھاری بات ہے۔ نیز اس آیت میں قیامت کا علم پوشیدہ رکھنے کی حکمت کا ذکر ہے۔ اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یہ دنیا امتحان کے لئے ہے۔ قیامت کے بارے میں سوال کے بجائے اس کے لئے تیاری کرنا زیادہ اہم مسئلہ ہے۔

علمی بات: مشرکین مکہ نے تمسخر کے طور پر آپ ﷺ سے سوال کیا تھا کہ آپ قیامت کے آنے کی باتیں کرتے اور ہمیں اس سے ڈراتے ہیں۔ اگر آپ کا خیال صحیح ہے تو آپ ہمیں وہ سال، تاریخ اور وقت بتایئے جب قیامت آئے گی، تاکہ وقت آنے پر ہم اس کے لئے تیاری کر لیں۔ چنانچہ اللہ ﷻ نے آپ ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ آپ ﷺ ان کو بتا دیجئے کہ قیامت کے آنے کا صحیح وقت تو اللہ ﷻ کو معلوم ہے۔ پس اس کا جو وقت مقرر ہے، اللہ ﷻ کے حکم سے وہ اس پر ظاہر ہو جائے گی، اس لئے آدمی کو ہر وقت اس کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ قیامت کا حادثہ آسمانوں اور زمین پر بہت گراں گزرے گا کیونکہ وہ لوگوں کی بے خبری میں اچانک آئے گی۔

آیت نمبر ۱۸۸: اس آیت میں رسول کریم ﷺ کی عاجزی کا بیان ہے۔ اللہ ﷻ کی قدرت اور علم کامل کا بیان ہے۔ رسول علیہم السلام بھی اللہ ﷻ کے حکم کے تابع ہوتے ہیں۔ رسولوں کو اللہ ﷻ کی طرف سے علم اور رہنمائی عطا ہوتی ہے۔ اللہ ﷻ کا فضل سب سے بڑھ کر نبی کریم ﷺ پر ہوا۔ ہمارے لئے اس کا ادراک ممکن نہیں۔ مزید براں آپ ﷺ کے بشیر اور نذیر ہونے کا بیان ہے۔

اس آیت کریمہ میں حضور رحمۃ العالمین ﷺ اپنی ذات مقدسہ سے اُلوہیت کی نفی فرما رہے ہیں کہ میں اللہ نہیں۔ کیونکہ اللہ ﷻ وہ ہے جس کی قدرت کامل اور اختیار مستقل ہے جو چاہے کر سکتا ہے۔ نہ کسی کام سے اسے کوئی روک سکتا ہے اور نہ اسے کسی کام پر مجبور کر سکتا ہے۔ اور مجھ میں یہ اختیار کامل اور قدرت مستقلہ نہیں پائی جاتی۔ میرے پاس جو کچھ ہے میرے رب کا عطیہ ہے اور میرا سارا اختیار اسی کی عنایت ہے۔ "لَآ اَمْلِكُ" کے کلمات سے اپنے اختیار کامل کی نفی فرمائی اور "اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ" سے اس غلط فہمی کا ازالہ کر دیا کہ کوئی نادان یہ نہ سمجھے کہ حضور کو نفع و ضرر کا کچھ اختیار ہی نہیں۔ فرمایا مجھے اختیار ہے اور یہ اختیار اتنا ہی ہے جتنا میرے رب کریم نے مجھے عطا فرمایا ہے۔

علمی بات: شرعیات کا علم جو انبیاء علیہم السلام کے منصب سے متعلق ہے اور تکوینیات کا علم اللہ ﷻ جس کو جس قدر مناسب جانے عطا فرماتا ہے۔ اس نوع میں حضور ﷺ تمام اولین و آخرین سے فائق ہیں۔ آپ ﷺ کو اتنے بے شمار علوم و معارف اللہ ﷻ نے مرحمت فرمائے ہیں جن کا شمار کسی مخلوق کی طاقت میں نہیں۔

آیت نمبر ۱۸۹: "نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ" سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے بعد ان ہی سے ان کی زوجہ بی بی حوا کو پیدا کیا گیا۔ دونوں سے نسل انسانی کی ابتدا ہوئی۔ نکاح کا ایک اہم مقصد زوجین کا باہمی سکون اور دوسرا مقصد اولاد کا حصول ہے۔ ایک عمومی مثال کے ذریعہ اولاد کے حوالہ سے شرکیہ طرز عمل کو بیان کیا گیا ہے۔ ایسے زوجین کی مثال دی گئی ہے جو اللہ ﷻ سے تندرست اولاد کی التجا اور عطا ہونے پر شکر گزاری کا عہد کرتے ہیں۔

چند اہم باتیں: ان آیات میں چند باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں۔

۱۔ اللہ ﷻ نے اپنی قدرت سے پہلے انسان (حضرت آدم علیہ السلام) اور پہلی عورت (حضرت حوا) کو پیدا فرمایا۔ عمومی انداز سے ذکر ہے کہ میاں اور بیوی کا جوڑا بنانے کا مقصد یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی محبت سے ذہنی سکون، جسمانی لذت اور راحت حاصل کریں۔

۲۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ ان دونوں کے ملنے سے محض جسمانی سکون اور لذت ہی حاصل نہ ہو بلکہ ایسی نسلیں تیار ہوں جن سے دنیا میں دینی و ایمانی رونق پیدا ہو۔

۳۔ انسانوں کے عمومی رویئے کا ذکر ہے کہ جب میاں اور بیوی کا اختلاط ہوتا ہے تو اس سے ایک ہلکا سا حمل ٹھہر جاتا ہے جس کے ساتھ وہ عورت چلتی پھرتی ہے۔ وضع حمل کا وقت بہت نازک ہوتا ہے اس میں زچہ اور بچہ دونوں کی جان کو خطرہ ہوتا ہے۔ حمل اور وضع حمل کے دوران بچے کے ماں اور باپ بہت سی جذباتی کیفیات سے گزرتے ہیں۔ یہی فکر رہتی ہے کہ بچہ صحیح سالم بھی پیدا ہوگا یا نہیں، صورت شکل کیسی ہوگی، خوبصورت ہوگا یا بدشکل، بدعقل ہوگا یا صاحب عقل و فہم وغیرہ وغیرہ جیسے جیسے وضع حمل کا وقت قریب آنے لگتا ہے تو یہ جذباتی کیفیت اور بھی بڑھ جاتی ہے اور دونوں مل کر اللہ ﷻ سے دعائیں کرتے ہیں کہ اے اللہ ﷻ ہماری اولاد کو خیر و خوبی سے پیدا فرما اور وہ پیدا ہونے والا بچہ نیک بخت ہو، خوبصورت ہو وغیرہ۔ دونوں کی زبان پر یہی ایک دعا ہوتی ہے۔

ازدواجی حقوق و فرائض کا مقصد: ازدواجی زندگی کے جتنے حقوق و فرائض زوجین پر عائد ہوتے ہیں ان سب کا خلاصہ اور اصل مقصد سکون ہے، دنیا کی نئی معاشرت اور نئی رسموں میں جو چیزیں سکون برباد کرنے والی ہیں وہ ازدواجی تعلق کی بنیادی دشمن ہیں اور آج کی مہذب دنیا میں جو گھریلو زندگی عموماً تلخ نظر آتی ہے اور چاروں طرف طلاقوں کی بھرمار ہے، اس کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ معاشرت میں ایسی چیزوں کو پسندیدہ سمجھ لیا گیا ہے، جو گھریلو زندگی کے سکون کو سراسر برباد کرنیوالی ہیں، عورت کی آزادی کے نام پر اس کی بے پردگی اور بے حیائی جو طوفان کی طرح عالم گیر ہوتی جارہی ہے اس کو ازدواجی سکون کے برباد کرنے میں بڑا دخل ہے اور تجربہ شاہد ہے جوں جوں یہ بے پردگی و بے حیائی بڑھتی جاتی ہے اس رفتار سے گھریلو سکون و اطمینان ختم ہوتا جاتا ہے۔

عملی بات: انسان کی ازدواجی زندگی کا مقصدِ اصلی یہ ہے کہ ایک دوسرے سے مانوس ہو اور زندگی پُر سکون ہوں۔ آپس میں محبت اور ہمدردی کے تعلقات ہوں۔ بہت سے مرد عورتوں کے لئے مصیبت بن جاتے ہیں اور بہت سی عورتیں مرد کے لئے سوہان روح (اذیت ناک) بن جاتی ہیں۔ یہ ازدواجی مقصد کے خلاف ہے۔ جن میاں بیوی میں تلخی ہو وہاں سکون کہاں اور یہ سکون وہیں ہو سکتا ہے جبکہ خلاف طبع امور میں فریقین تحمل اور برداشت سے کام لیں۔ نکاح کرتے وقت اچھی طرح دیکھ بھال کر نکاح کریں۔ مال اور حسن و جمال ہی کو نہ دیکھیں۔ فریقین کی دین داری اور خوش خلقی کو بھی دیکھیں اور یہ بھی دیکھیں کہ آپس میں جوڑ بیٹھے گا یا نہیں؟ دونوں محبت و الفت کی راہ پر چل سکیں گے یا نہیں؟ اور نکاح کے معاملے میں دین داری کو ترجیح دینا یہ مطلوب ہے چنانچہ رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: چار چیزوں کی وجہ عورتوں سے نکاح کیا جاتا ہے؛ اس کے مال کی وجہ سے، حسب و نسب کی وجہ سے، خوبصورتی کی وجہ سے اور دینداری کی وجہ سے تو دیندار عورت سے نکاح کر کے کامیابی حاصل کر، تمہارے ہاتھ خاک آلود ہوں۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

آیت نمبر ۱۹۰: اس آیت کے اولین مخاطب مشرکین مکہ ہیں۔ صحت مند بچہ عطا کیئے جانے پر ناشکری کی روش کا بیان ہے۔ وہ اولاد کی عطا کو اللہ ﷻ کے ساتھ دوسری ہستیوں کی طرف منسوب کرتے تھے۔ اس کے علاوہ بچے کا مشرکانہ نام رکھتے تھے۔ نیز یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ ﷻ ان جھوٹے معبودوں سے بلند و برتر ہے جن کو وہ اللہ ﷻ کے ساتھ شریک کرتے تھے۔

علمی بات: کفار و مشرکین کو جھنجھوڑا جارہا ہے کہ جب انہیں اولاد کی امید لگتی ہے تو وہ اللہ ﷻ سے التجائیں کرتے ہیں اس کی بارگاہِ عالیہ میں دعائیں مانگتے ہیں کہ اے ہمارے رب! اگر تو نے ہمیں صحیح، سالم اور تندرست فرزند عطا کیا تو وہ عمر بھر تیرے شکر گزار رہیں گے۔ لیکن جب وہ کرم فرماتا ہے اور اُن کی شاخِ آرزو پر امید کا

پھول کھلتا ہے اوران کی اداس گود ایک خوبصورت بچے سے آباد ہو جاتی ہے یعنی اولادِ نرینہ کی نعمت ملتی ہے تو اس فوراً اس عطا فرمانے والے رب العالمین کو بھول جاتے ہیں اور اسے اپنے عمل کا طبعی نتیجہ سمجھتے ہیں۔ یا کہتے ہیں کہ یہ فلاں ستارے کی تاثیر ہے یا یہ انہیں فلاں بت نے بخشا ہے۔ یہ کتنی احسان فراموشی اور حق ناشناسی ہے جو یہ مشرکین کر رہے ہیں۔

حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم قیامت کے دن اپنے ناموں اور اپنے باپ دادا کے ناموں سے بلائے جاؤ گے لہٰذا تم اپنے نام اچھے رکھو۔ (سنن ابو داؤد)

عملی پہلو: انسان کا یہ معاملہ صرف اولاد تک نہیں بلکہ زندگی کے ہر نازک موڑ پر ایسا ہی ہوتا ہے کہ بندہ کہتا ہے کہ اے اللہ! میرا یہ کام کر دے مجھے صحت و تندرستی عطا فرما دے اور جب اس کو صحت و تندرستی اور راحتیں حاصل ہو جاتی ہیں تو اللہ ﷻ کی ناشکری کرتا ہے اور احسان فراموشی کرتا ہے کہ فلاں ڈاکٹر صاحب کی دوا سے مجھے یہ فائدہ ہوا۔ فلاں تدبیر کی وجہ سے مجھے یہ کامیابی نصیب ہوئی۔ اللہ ﷻ فرماتا ہے کہ جب انسان کی مشکلات حل ہو جاتی ہیں تو وہ اللہ ﷻ کا شکر ادا کرنے کے بجائے غیر اللہ ﷻ کی طرف وہ تمام خوبیاں منسوب کر دیتا ہے جو اللہ ﷻ نے اسے اپنی قدرت سے عطا فرمائی تھیں۔

آیت نمبر ۱۹۱: اس آیت میں اُلوہیت کا معیار بتا دیا گیا ہے۔ جو مخلوق اور فانی ہے وہ اِلٰہ یعنی معبود نہیں۔ اس معیار کے مطابق اللہ ﷻ کے سوا تمام معبود باطل ہیں خواہ وہ کوئی بھی ہو اور زندہ یا فانی ہو۔

علمی بات: اس آیت میں اللہ ﷻ نے بت پرستی کا رد بیان کیا ہے مٹی پتھر یا لکڑی کے مجسمے بنا کر ان کی پوجا کرنا شرک کی ایک صورت ہے اور بت پرستی کی یہ لعنت حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے سے لے کر تمام اقوام میں پائی جاتی رہی ہے اللہ ﷻ نے قرآنِ حکیم میں اس کا بار بار رد فرمایا ہے اس کے علاوہ جو لوگ ملائکہ اور جنات وانسان کو عبادت میں شریک کرتے ہیں اللہ ﷻ نے ان کا بھی رد فرمایا ہے شرک اللہ ﷻ کی صفات میں ہو یا عبادت میں یہ قابل مذمت ہے اس مقام پر اللہ ﷻ نے بت پرستی کا اس طرح رد فرمایا ہے کیا یہ لوگ ان کو شریک بناتے ہیں جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے وہ خود پیدا کیئے جاتے ہیں۔

آیت نمبر ۱۹۲: یہاں اولین مراد بت ہیں جن کی مشرکین پرستش کرتے تھے۔ ان کے اِلٰہ ہونے کی نفی کی گئی ہے۔ ان خود ساختہ بتوں کی بے بسی ظاہر کی گئی ہے کہ:

۱۔ وہ کسی چیز کو پیدا کرنے پر قادر نہیں۔ ۲۔ وہ نہ اپنی، نہ شرک کرنے والوں کی مدد کا اختیار رکھتے ہیں۔

یہ بے بسی ہر مخلوق کے ساتھ وابستہ ہے اس لئے مخلوق معبود نہیں ہو سکتی۔

علمی بات: مشرکوں کی کمال حماقت دکھائی ہے کہ ایسوں کے آگے جھکتے ہیں۔ جو کسی کو تو پیدا کیا کرتے خود اپنے پیدا کرنے پر بھی قادر نہیں۔ بلکہ اپنی پیدائش تک کے لئے دوسرے ہی کے تمام تر محتاج ہیں۔ پھر اتنا ہی نہیں بلکہ تخلیق الگ رہی وہ تو امداد تک پر قادر نہیں۔ نہ کسی دوسرے کی نہ خود اپنی ہی! حیرت اور کمال حیرت ہے کہ ایسی بے بس ہستیوں کو معبود کے درجہ پر رکھا جائے! (اللھم احفظنا)

علمی بات: معبود کے لئے ضروری ہے کہ وہ نفع پہنچانے اور ضرر دور کرنے پر قادر ہو اور بت اپنی پرستش کرنے والوں کو نہ نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان، تو ان کی پرستش اور عبادت کرنا کیونکر درست ہو گا۔ بلکہ بتوں کا حال تو یہ ہے کہ اگر کوئی ان بتوں کو توڑ دے تو وہ اپنے آپ کو اس سے بچا نہیں سکتے، تو جو اپنی ذات سے ضرر کو دور کرنے پر قادر نہیں ہے تو وہ تمہیں تکالیف اور مصائب سے کیسے بچا سکتا ہے۔

آیت نمبر ۱۹۳: اس آیت میں جھوٹے معبودوں کی بے چارگی ظاہر کی گئی ہے۔ وہ شرک کرنے والوں کی کسی پکار کا جواب دینے پر قادر نہیں ہیں۔ لہٰذا ان کو پکارنا یا نہ پکارنا دونوں کا نتیجہ یکساں ہوتا ہے۔

جو کام سب سے سہل تر ہے کہ کوئی بات بتلانے کے لئے پکار کو سن لینا یہ جھوٹے معبود اس سے بھی عاجز ہیں تو جو اس سے مشکل ہے کہ اپنی حفاظت کریں اور پھر جو اس سے بھی مشکل ہے کہ دوسروں کی امداد کرنا اور پھر جو ان سب سے دشوار تر ہے کہ کسی شے کو پیدا کرنا ان سے تو بدرجہ اولیٰ زیادہ تر عاجز ہوں گے پھر ایسے عاجز محتاج کب عبادت کے لائق ہو سکتے ہیں۔

علمی بات: یعنی جس طرح یہ بت اور معبودانِ باطل حصول نفع اور دفع ضرر پر قادر نہیں ہیں، اسی طرح ان کو کسی چیز کا علم بھی نہیں ہے، اس لئے جب تم انہیں کسی نیک کام کے لئے پکارو تو یہ تمہارے پیچھے نہیں لگیں گے، اور اس آیت کا یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ اگر تم ان کو کسی خیر اور اچھائی کے لئے پکارو تو یہ تمہاری پکار

کا جواب نہیں دیں گے یا تم ان سے کوئی دعا کرو تو یہ تمہاری دعا کو قبول نہیں کریں گے۔ اس لئے فرمایا کہ تمہارے لئے برابر ہے کہ تم ان کو پکارو یا خاموش رہو چنانچہ پتا چلا کہ اللہ ﷻ کے علاوہ کسی کی بھی عبادت کرنا اور اسی سے دعا مانگنا ناروا و ناجائز عمل ہے۔

آیت نمبر ۱۹۴: اس آیت میں بتوں کے معبود ہونے کی تردید ہے۔ یہ بھی اللہ ﷻ کے مملوک ہیں اور نفع و نقصان کا اختیار نہیں رکھتے ہیں۔ ان سے حاجت روائی اور مشکل کشائی کی توقع رکھنے والوں کی مذمت ہے۔

علمی بات: مفسر امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں بڑی نفیس بحث کی ہے فرماتے ہیں کہ مشرکین مکہ تو بتوں کے پرستار تھے اور بت پتھر اور لکڑی کے بے جان مجسمے ہوا کرتے تھے ان کو "عِبَادٌ اَمْثَالُكُم" (تمہارے جیسے بندے) کیوں کہا گیا؟ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے متعدد جواب دیئے ہیں۔ (۱) بتوں کو بندے کہنے کی وجہ یہ ہے کہ مشرکین کا یہ عقیدہ تھا کہ یہ بت زندہ ہیں اور سنتے سمجھتے ہیں اس لئے ان کے اعتقاد کے مطابق ان سے بات کی گئی۔ کہا جارہا ہے کہ اگر تمہاری بات بالفرض مان بھی لی جائے کہ یہ زندہ ہیں اور سنتے سمجھتے ہیں تو پھر بھی یہ زیادہ سے زیادہ تمہاری طرح کے انسان ہی ہوں گے۔ یہ آخر خدا کیونکر بن گئے اور اپنے جیسے انسان کی بندگی کا طوق گلے میں ڈالنا کہاں کی دانشمندی ہے۔ مزید براں مفسرین نے بتوں کو عباد کہنے کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی ہے کہ وہ بھی تمہاری طرح اللہ ﷻ کے مملوک ہیں اور تمہاری طرح اس کے پیدا کردہ ہیں۔

آیت نمبر ۱۹۵: خود ساختہ معبودوں کی لاچارگی کا بیان ہے۔ یہ تو تراشے گئے بت ہیں۔ یہ تو اپنے اعضاء سے کام لینے سے بھی محروم ہیں۔ مزید برآں نبی کریم ﷺ کی طرف سے مشرکین سے دوٹوک انداز میں گفتگو کا ذکر ہے۔

علمی بات: یہ بت مخلوق ہونے کے باوجود ان کمالات سے محروم ہیں جن سے کسی مخلوق پر امتیاز حاصل ہو سکتا ہے، نہ وہ چل سکتے ہیں، نہ وہ اپنے ہاتھوں سے کوئی چیز پکڑ سکتے ہیں، نہ آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔ تم ان کو پکارتے پکارتے تھک جاؤ گے مگر وہ تمہاری پکار کا کبھی جواب نہ دے سکیں گے، کیونکہ تمہارا ان کو پکارنا یا خاموش رہنا ان کے لئے سب برابر ہے۔ ان میں سننے، سمجھنے اور جواب دینے کی قوت ہی نہیں۔ پھر تم ایسی عاجز و بے بس مخلوق کو کیوں معبود بناتے ہو۔ پھر آنحضرت ﷺ کو مخاطب کرکے فرمایا کہ آپ ﷺ ان مشرکوں سے کہہ دیجئے کہ تم اپنے تمام باطل معبودوں کو جن کو تم اللہ ﷻ کا شریک قرار دیتے ہو، میری ضرر رسانی کے لئے بلالو اور جس قدر تدبیریں تم سے ہو سکیں وہ سب کرلو اور مجھے ذرا سی مہلت بھی نہ دو۔ مجھے تمہارے معبودوں کی ذرا بھی پرواہ نہیں کیونکہ میرا حامی و مددگار اور حفاظت کرنے والا تو اللہ ﷻ ہی ہے جس نے مجھ پر یہ کتاب نازل فرمائی۔ وہی دنیا و آخرت میں اپنے نیک بندوں کی مدد کرتا ہے۔ اس لئے مجھے نہ تمہاری طرف سے کوئی خوف ہے اور نہ تمہارے معبودوں کی طرف سے۔

شانِ نزول: حضور نبی کریم ﷺ نے جب بت پرستی کی مذمّت کی تو مشرکین نے دھمکایا اور کہا کہ بتوں کو بُرا کہنے والے تباہ ہو جاتے ہیں، برباد ہو جاتے ہیں، (معاذاللہ) اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی کہ اگر بتوں میں کچھ قدرت سمجھتے ہو تو انہیں پکارو اور میری نقصان دہی میں ان سے مدد لو اور تم بھی جو مکر و فریب کر سکتے ہو وہ میرے مقابلہ میں کرو اور اس میں دیر نہ کرو، مجھے تمہاری اور تمہارے معبودوں کی کچھ بھی پرواہ نہیں اور تم سب میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔

آیت نمبر ۱۹۶: "ولی" کے معنی محافظ، حمایتی اور مددگار کے ہیں۔ اللہ ﷻ ہی نبی کریم ﷺ اور اہل ایمان کا مددگار ہے۔ باطل معبودوں کے برعکس اللہ ﷻ اپنی بندگی کرنے والوں کی ہر اعتبار سے رہنمائی اور مدد کرنے پر قادر ہے۔ اللہ ﷻ ہی نے قرآنِ حکیم نازل فرما کر ہدایت کا سامان مہیا کر دیا جس کا انسان سب سے زیادہ محتاج ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ کی حمایت و نصرت ہمیشہ اپنے نیک اور فرمانبردار بندوں کے شامل حال رہا کرتی ہے۔ وہ جس کے ساتھ ہو دنیا کی کوئی طاقت اُس کا بال بیکا نہیں کر سکتی۔ سچ یہ ہے کہ اہل حق کے پاس یہی ایک قوت ہے جس کے بل بوتے پر وہ بڑی بے باکی سے ہر طاغوتی طاقت سے ٹکرا جاتے ہیں۔

اللہ ﷻ کی ذات ہی حامی و ناصر ہے کیونکہ اسی نے ہدایت و اصلاح کے لئے کتاب نازل فرمائی ہے۔ یہاں لطیف اشارہ ہے کہ اس کا حامی و ناصر ہونا اس بات پر موقوف ہے کہ اس کی نازل کردہ کتاب سے بندہ تعلق پیدا کرپاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ ﷻ اپنے سب نیک بندوں کی سرپرستی فرماتا ہے اور اللہ ﷻ کی یہ سرپرستی کیا کم ہے کہ اس نے قرآنِ حکیم جیسی بابرکت کتاب ہمارے لئے نازل فرمائی ہے جو زندگی کے ہر پہلو میں ہماری رہنمائی کرتی ہے۔

آیت نمبر ۱۹۷: اس آیت میں مشرکین کو مخاطب کرکے ان کے معبودانِ باطلہ کے بارے میں متنبہ کیا گیا ہے۔ یعنی اگر وہ ان کو اپنے مقاصد میں راہنمائی کے لئے پکاریں تو وہ ان کی پکار سن ہی نہیں سکتے تو مدد کیا کریں گے۔

علمی بات: اس آیت میں یہ اشارہ بھی تھا کہ عنقریب وہ وقت آئے گا کہ مشرک مغلوب ہوں گے تو یہ بت اس وقت بھی ان کی کچھ مدد نہ کر سکیں گے اور نہ وہ جن کے یہ بت بنائے گئے۔ پھر ان کی مدد کرنا تو ایک طرف رہا وہ اپنے آپ کو بھی تباہی سے نہ بچا سکیں گے اور اس طرح جو کچھ حضور نبی کریم ﷺ کی زبان مبارک سے فرمایا گیا وہ حرف بہ حرف پورا ہوا اور مشرکین مکہ باوجود اپنی ساری طاقت کے آخر کار مغلوب ہوئے اور بالآخر ٹوٹے ہوئے بتوں کو بھی بیت اللہ سے نکال کر اندھے کنوؤں میں پھینکوا دیا گیا۔ سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْم۔

آیت نمبر ۱۹۸: اس آیت میں فرمایا گیا کہ آپ ﷺ انہیں دیکھتے ہیں کہ وہ بظاہر آپ کی طرف دیکھ رہے ہیں، اس سے مراد بت ہیں یا مشرکین۔ اگر اس سے مراد بت ہیں تو ان کے دیکھنے کا معنی یہ ہے کہ وہ آپ ﷺ کے سامنے اور بالمقابل ہیں اور چونکہ دیکھنے والا بالمقابل ہوتا ہے اس لئے فرمایا وہ بظاہر دیکھ رہے ہیں حالانکہ حقیقت میں وہ بالکل نہیں دیکھ رہے اور اگر اس سے مراد مشرکین ہیں تو پھر معنی یہ ہے کہ یہ کفار اور مشرکین بظاہر آپ ﷺ کو دیکھ رہے ہیں لیکن یہ چونکہ آپ ﷺ کو محبت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے بلکہ عداوت سے دیکھتے ہیں تو گویا کہ وہ آپ ﷺ کو نہیں دیکھتے یا چونکہ وہ حق سے اعراض کرتے ہیں اور اللہ ﷻ نے آپ ﷺ کی ذات میں نبوت کے جو دلائل اور نشانیاں رکھی ہیں ان کا اثر قبول نہیں کرتے اس لئے گویا کہ وہ آپ ﷺ کو نہیں دیکھتے۔ مطلب یہ ہے کہ مشرکین اپنے بتوں کی صورتیں بناتے وقت ان کی آنکھیں ایسی بناتے کہ ان کی طرف دیکھنے والے کو ایسا معلوم ہو کہ وہ سچ مچ دیکھ رہے ہیں، مگر جب وہ بے جان بت ہیں تو دیکھیں گے کیسے؟ یا یہ کہ مشرکین بظاہر تو آنکھیں رکھتے ہیں مگر بصیرت کے اندھے ہیں، اس لئے کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔

آیت نمبر ۱۹۹: اس آیت کریمہ کے ذریعے مکارمِ اَخلاق کی نہایت عمدہ، مختصر، جامع اور موثر تعلیم دی گئی جو اللہ ﷻ کی طرف سے نبی آخر الزمان ﷺ کو اور آپ ﷺ کے توسط سے آپ ﷺ کی اُمت کو دی جاری ہے۔ خاص کر ان حضرات کو جو دعوت الی اللہ کے عظیم کام میں مشغول ہوں۔ اسی لئے بعض علماء کرام نے فرمایا کہ اخلاقیات کے ضمن میں کوئی نیکی یا خوبی و فضیلت ایسی نہیں جو اس آیت کریمہ کے اندر سمونہ دی گئی ہو۔ اسی لئے اس آیت کریمہ کو مکارم اخلاق کی سب سے جامع آیت قرار دیا گیا ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو حضور نبی کریم ﷺ نے جبریل امین علیہ السلام سے فرمایا "مَا هٰذَا يَا جِبْرِيْلُ؟" "یہ کیسی تعلیم ہے اے جبریل؟" تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے عرض کیا کہ "آپ ﷺ کا رب آپ ﷺ کو حکم دیتا ہے کہ آپ ﷺ درگزر فرمائیں اس سے جو آپ ﷺ سے زیادتی کرے، اور عطا فرمائیں اس کو جو آپ ﷺ کو محروم رکھے اور تعلق قائم فرمائیں اس سے جو آپ ﷺ سے قطع تعلقی کرے۔"

عملی پہلو: اس آیت میں مبلغ کو تین ہدایات دی گئی ہیں اور ایک ہدایت اگلی آیت میں دی گئی ہے۔

۱۔ اختلاف اور اشتعال کے مقابلہ میں حوصلہ رکھنا اور درگزر کرنا۔ ۲۔ نیکی کی تبلیغ کرنا۔ ۳۔ جُہلاء سے اعراض برتنا۔

۴۔ مخالفین حق کے رویہ سے طبیعت میں غصہ اور اشتعال پیدا ہو تو شیطان کے شر سے اللہ ﷻ کی پناہ مانگنا۔

۱۔ اشتعال کے بجائے درگزر: تبلیغ کے میدان میں ایک مبلغ کو ہر قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ اس لئے اسے سمجھ داری اور بردباری کا مظاہرہ کرنا چاہیئے اگر دین کا کارکن اور مبلغ مشتعل ہو جائے تو کام آگے بڑھنے کے بجائے نہ صرف رک جاتا ہے بلکہ معاملہ جنگ و جدال تک پہنچ جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ فطری اور جبلی طور پر حوصلہ اور بردباری کے پیکر تھے۔ آپ ﷺ کی حیات مبارکہ میں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں کہ آپ ﷺ نے اشتعال میں آکر کسی کو ترکی بہ ترکی جواب دیا ہو۔ اس کے باوجود آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ کے ذریعے اُمت کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ آپ ﷺ معافی اور درگزر کا رویہ اختیار کریں۔

۲۔ نیکی کی تبلیغ: عرف بمعنی معروف ہر اچھے، نیک اور مستحسن کام کو کہتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ جو لوگ آپ ﷺ کے ساتھ برائی اور ظلم سے پیش آئیں آپ ﷺ ان سے انتقام نہ لیں بلکہ معاف کر دیں مگر ساتھ ہی ان کو نیک کام کی ہدایت بھی کرتے رہیں، گویا بدی کا بدلہ نیکی سے ظلم کا بدلہ صرف انصاف ہی سے نہیں بلکہ احسان سے دیں۔

۳۔ اعراض: اس سے مراد بحث و تکرار اور جنگ و جدال سے بچنا ہے۔ مبلغ تبلیغ کے میدان میں مخالف کی بدکلامی کا جواب ترکی بہ ترکی دے تو سننے والے اس کو اچھا نہیں سمجھتے۔ مبلغین کو یہ بات اچھی طرح سمجھنی چاہیئے وہ کونسا الزام اور بدکلامی ہے جس سے نبی اکرم ﷺ اور انبیاء کرام علیہم السلام کو واسطہ نہیں پڑا لیکن آپ ﷺ اور کسی نبی علیہ السلام نے اپنے مخالف کو بُرا کہنا تو درکنار کوئی سطحی لفظ بھی نہیں بولا۔

۴۔ وعظ و نصیحت کے میدان میں درگزر کرنے اور حوصلہ مندی کے باوجود بعض دفعہ ایسے جہلاء سے واسطہ پڑتا ہے جو الجھے بغیر نہیں رہ سکتے ایسی صورت میں ایسے لوگوں سے اعراض کرنا چاہیئے اگر ان کی اشتعال انگیز باتوں پر طبیعت میں غصہ پیدا ہو تو اللہ ﷻ کی پناہ مانگنی چاہیئے کیونکہ غصہ شیطان کی طرف سے ہوا کرتا ہے۔
صاحب علم کے اخلاق فاضلہ میں یہ بھی شامل ہے کہ جاہلوں سے نہ الجھے اور ان سے دور رہے اور جاہل کی طرف سے کوئی زیادتی ہو تو اسے برداشت کرے اور درگزر کر دے۔ عالم اگر جاہل کے جاہلانہ افعال و اقوال اور اطوار و عادات کا مقابلہ کرے گا تو علم کا کام چھوڑ بیٹھے گا اور جاہلوں ہی سے بھڑتا رہے گا۔ اگر کوئی جاہل شخص شرعی مسئلہ پوچھے تو اسے بتا دے لیکن اس سے بحث نہ کرے نہ اسے بحث کرنے دے۔

آیت نمبر ۲۰۰: جو لوگ گناہوں سے بچنے اور اپنے رب سے ڈرنے والے ہیں جونہی انہیں شیطان کا غلبہ یا اس کے اثرات محسوس ہوں تو وہ اس پر چوکنے ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر شیطان سے اللہ ﷻ کی پناہ طلب نہ کی جائے تو شیطان اور اس کے ساتھی انسان کو گمراہی میں مبتلا کرنے میں کوئی کمی نہیں کرتے۔
غصہ اور اشتعال ہمیشہ شیطان کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس لئے اللہ ﷻ سے پناہ مانگنی چاہیئے۔ اللہ ﷻ ہر کسی کی فریاد سننے والا اور مبلغ کی نیت اور مخالف کی جہالت کو جاننے والا ہے۔

شان نزول: جب آیت شریفہ (خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ) نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے عرض کیا کہ اے رب! غصہ کی حالت میں کیا کیا جائے (غصہ انتقام پر ابھارتا ہے اور معاف کرنے سے روکتا ہے) اس پر اللہ ﷻ نے آیت "وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ" (آخر تک) نازل فرمائی۔
لفظ "نزغ" چونکہ دینے اور اُبھارنے اور وسوسہ ڈالنے اور کسی کام پر آمادہ کرنے کے لئے آتا ہے۔ شیطان انسان کے پیچھے لگا رہتا ہے۔ غصہ اور انتقام پر ابھارتا رہتا ہے اور ایسے وسوسے دل میں ڈالتا ہے کہ انسان معاف کرنے یا درگزر کرنے پر عمل پیرا نہ ہو سکے۔ خصوصاً دین کا کام کرنے والوں کو ورغلاتا اور طیش میں لا کر بُرے طرز عمل پر اُبھارتا ہے جس سے دعوتِ دین کا کام متاثر ہوتا ہے شیطان کا شر اور وسوسہ دفع کرنے کا یہ علاج بتایا کہ شیطان مردود سے اللہ ﷻ کی پناہ مانگی جائے اس سے شیطان ذلیل ہو گا اور وسوسہ ڈالنے سے پیچھے ہٹے گا۔
سورۃ المومنون میں فرمایا: "وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ" اور آپ (ﷺ) یوں کہئے کہ اے رب! میں آپ کی پناہ لیتا ہوں شیطان کے وسوسوں سے اور اے رب اس بات سے کہ وہ میرے پاس حاضر ہوں۔

علمی پہلو: وسوسہ اور غصہ کے دفع کے لئے (اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ) پڑھنا بہت مفید ہے۔

آیت نمبر ۲۰۱: علمی بات: انسان کو ورغلانے کے لئے انسان کے گرد گردش کرنے والے شیطان کو "طائف" کہتے ہیں، کسی چیز کا خیال یا اس کی صورت جو نیند اور بیداری میں دکھائی دے اس کو "طیف" کہتے ہیں۔
اس آیت میں شیطان سے بچنے والوں کا تذکرہ فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ اللہ ﷻ سے ڈرتے ہیں ان کا طریقہ یہ ہے کہ جب شیطان ان کے دل میں کوئی وسوسہ ڈالے اور بہکانے کی کوشش کرے تو فوراً اللہ ﷻ کو یاد کرنے لگتے ہیں۔ ان کے عموم میں مطلقاً اللہ ﷻ کا ذکر کرنا بھی شامل ہے اور اللہ ﷻ کے عقاب و ثواب کو ذہن میں لا کر شیطان کے وسوسوں سے بچنا اور ان پر عمل نہ کرنا بھی شامل ہے۔ اللہ ﷻ کا ذکر شیطان کو دور کرنے کے لئے بہت بڑا ہتھیار ہے۔ شیطان انسان کے دل پر مضبوطی کے ساتھ جما ہوا ہے۔ سو جب وہ اللہ ﷻ کا ذکر کرتا ہے تو شیطان پیچھے ہٹ جاتا ہے اور جب اللہ ﷻ کی یاد سے غافل ہوتا ہے تو شیطان وسوسے ڈالنے لگتا ہے۔

علمی بات: سورۃ الفلق میں جو "مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ الَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ" فرمایا ہے اس میں اس بات کا ذکر ہے کہ شیطان وسوسے ڈالتا ہے اور (اللہ ﷻ کا ذکر کرنے پر) پیچھے ہٹ جاتا ہے۔

علمی بات: "فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ" یعنی تقویٰ اختیار کرنے والے جب شیطان کا وسوسہ آنے پر اللہ ﷻ کو یاد کرتے ہیں اور اس سے پناہ طلب کرتے ہیں تو اس سے فوراً چونک جاتے ہیں اور آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ شیطان کی شرارت فوراً واضح ہو جاتی ہے اور خطا و صواب کا پتہ چل جاتا ہے۔

علمی و عملی بات: بُرے خیالات پر گرفت نہیں ہے۔ ہر انسان کو اچھے خیالات بھی آتے ہیں اور بُرے خیالات بھی آتے ہیں اللہ ﷻ کا فضل و کرم ہے کہ بُرے سے بُرا اور گندے سے گندا خیال بھی آئے تو اس پر کوئی پکڑ نہیں ہے اگر خیال پر پکڑ ہوتی تو کسی کی بھی خیر نہیں تھی خیال اسے کہتے ہیں کہ جو بغیر

ارادے کے خود بخود آ ئے اللہ ﷻ کے نیک بندوں متقیوں کو جب خیال آتے ہیں تو فوراً ان کو یاد آجاتا ہے کہ یہ شیطان کا وسوسہ ہے وہ صاحب بصیرت ہو جاتے ہیں سمجھ سے کام لیتے ہیں اللہ ﷻ کی پناہ لیتے ہیں اور باز آجاتے ہیں۔

آیت نمبر ۲۰۲: اس آیت میں شیطان سے دوستی کرنے والوں کا تذکرہ فرمایا گیا ہے یعنی متقین کا ذکر فرمانے کے بعد ان لوگوں کا ذکر فرمایا جو شیطانوں کے بھائی ہیں یعنی ان کا شیطان کے ساتھ بہت زیادہ تعلق ہے۔ وہ شیطان کے وسوسوں سے نہیں بچتے۔ بلکہ ان شیطانی وسوسوں پر عمل کرتے ہیں۔ لہٰذا جو شخص شیطان کا دوست بنے گا پھر اس پر شیطان کا حکم تو لازمی چلے گا۔ شیاطین اپنے بھائی بندوں کو گمراہی میں گھسیٹتے ہوئے دور تک لے جاتے ہیں اور گمراہی کی آخری حد یعنی دوزخ میں پہنچا کر چھوڑتے ہیں۔ لیکن جو اللہ ﷻ کے مخلص اور متقی بندے ہیں ان پر شیطان کا اختیار نہیں چلتا۔ ان کی کیفیت وہ ہوتی ہے جو اس سے پچھلی آیت میں بیان ہوئی ہے، یعنی جیسے ہی منفی اثرات کا سایہ ان کو اپنی طرف بڑھتا ہوا محسوس ہوتا ہے وہ یکدم چونک کر اللہ ﷻ کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔

آیت نمبر ۲۰۳: اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ مشرکین فرمائشی معجزات کا مطالبہ کرتے تھے۔ چنانچہ مطلوبہ معجزہ ظاہر نہ کرنے پر آپ ﷺ پر بے ہودہ اعتراض کرتے (معاذ اللہ) رسول اللہ ﷺ کی زبانی ان کو جواب دیا گیا کہ آپ ﷺ خود اللہ ﷻ کی وحی کی پیروی کرتے ہیں۔ قرآنِ حکیم بذات خود معجزہ ہے۔ ہدایت کے متلاشی کے لئے بے شمار نشانیاں موجود ہیں۔

شانِ نزول: بعض مشرکین شرارت اور کج بحثی کی بنا پر آنحضرت ﷺ سے خاص معجزے طلب کرتے تھے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

علمی بات: مشرکین کی بہت ساری گمراہیوں میں سے ایک گمراہی یہ بھی تھی کہ وہ وقتاً فوقتاً رسول اللہ ﷺ سے مخصوص نشانیوں کے مطالبے کرتے اور مقصود رسول اللہ ﷺ کو پریشان کرنا اور ان کا مذاق اڑانا ہوتا تھا ورنہ سب سے عظیم معجزہ قرآن کریم تورات دن ان کے سامنے اترتا ہی رہتا تھا اور اس کی آیتیں اہل ایمان کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی تھیں۔ جبکہ مشرکین کسی نشانی کا مطالبہ کرتے اور رسول اللہ ﷺ ان کے سامنے اِسے پیش نہیں کرتے تو بطور استہزاء کہتے کہ تم اسے اپنی طرف سے گھڑ کیوں نہیں لیتے؟ تو اللہ ﷻ نے آپ ﷺ سے فرمایا آپ ﷺ کہہ دیجئے کہ میں اللہ ﷻ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں مجھے تو بذریعہ وحی میں جو کچھ بتایا جاتا ہے اس کی اتباع کرتا ہوں اور یہ قرآن کریم تو دل کی آنکھیں کو کھولتا ہے اور اسے بصیرت عطا کرتا ہے اور بھلائی کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور اللہ ﷻ کی رحمت ہے۔

علمی بات: نبی ﷺ کا ہر قول و فعل وحی الٰہی کے مطابق ہوتا تھا آپ ﷺ، اللہ ﷻ کی وحی کے مطابق عمل پیرا رہتے تھے۔

آیت نمبر ۲۰۴: اس آیت میں قرآنِ حکیم سننے کے آداب اور اس سے مستفید ہونے کا طریقہ بیان کیا گیا ہے کہ قرآنِ حکیم کو پوری توجہ سے سنا جائے اور خاموش رہا جائے۔ قرآنِ حکیم جہاں پڑھا اور سنا جاتا ہے وہاں پر اللہ ﷻ کی رحمتوں کا نزول ہوتا ہے۔ قرآنِ حکیم کا رحمت ہونا اُس کے ان آداب کے بجالانے پر موقوف ہے۔ مشرکین اہل ایمان کے قرآنِ حکیم پڑھنے پر خوب شور و غل کرتے تا کہ قرآنِ حکیم کی آواز کانوں میں نہ پڑ سکے۔ ان کو یہ روش چھوڑنے اور قرآنِ حکیم کے آداب کی پیروی کرنے کا حکم ہے۔

شانِ نزول: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (پہلے) ہم نماز میں سلام کیا کرتے تھے اور کام کاج کی باتیں کر لیتے تھے، تو (ایک بار) میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا آپ ﷺ نماز پڑھ رہے تھے، میں نے آپ ﷺ کو سلام کیا آپ ﷺ نے جواب نہیں دیا تو مجھے پرانی اور نئی باتوں کی فکر دامن گیر ہو گئی جب آپ ﷺ نماز پڑھ چکے تو آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ ﷻ جو چاہتا ہے، نیا حکم نازل کرتا ہے، اب اس نے نیا حکم یہ دیا ہے کہ نماز میں باتیں نہ کرو پھر آپ ﷺ نے میرے سلام کا جواب دیا۔ (ابو داؤد)

حضرت عبداللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) بیان کرتے ہیں کہ ہم میں سے بعض، بعض کو نماز میں سلام کیا کرتے تھے کہ سلام علی فلاں، سلام علی فلاں۔ حتیٰ کہ یہ آیت نازل ہوئی۔ وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (اور جب قرآن پڑھا جائے تو توجہ سے سنا کرو اور خاموش رہا کرو تا کہ تم پر رحم فرمایا جائے)

(سورۃ الاعراف ۷، آیت، ۲۰۴)

علمی و عملی بات: دراصل قرآنِ حکیم کی تلاوت کے وقت توجہ اور ہمہ تن گوش ہو کر سننے کا حکم ہے، اس لئے کہ قرآنِ حکیم کے معانی سمجھ کر بھی سننا چاہیئے، اس نیت سے کہ اس کو ہم اپنائیں گے، اس کے رنگ میں اپنے آپ کو رنگ لیں گے۔

علمی بات: جب حضور نبی کریم ﷺ قرآنِ حکیم کی تلاوت فرماتے تو کفار شور وغل مچاتے۔ نہ خود سنتے نہ اوروں کو سننے دیتے۔ اللہ ﷻ فرماتا ہے کہ اے کفار! جب قرآنِ حکیم پڑھا جارہا ہو تو اسے غور سے سنو۔ اس کو سننے سے کچھ بعید نہیں کہ رحمت الٰہی کے دروازے تم پر کھل جائیں اور تم اس دعوت حق کو قبول کرنے کے لئے اپنے سینہ کو کشادہ پاؤ اور بہت ممکن ہے کہ ظاہری جمال اور معنوی حسن سے متاثر ہو کر تمہیں یقین ہو جائے کہ یہ کسی انسان کا نہیں بلکہ رب ذوالجلال کا کلام ہے۔

عملی پہلو: ہر شخص کو چاہیئے کہ جب قرآنِ حکیم پڑھا جارہا ہو تو وہ مؤدب ہو کر خاموشی سے بیٹھ جائے اور بڑے غور سے اس کی آیات کو سنے تاکہ اللہ ﷻ کی رحمت کا مستحق بن جائے۔

آیت نمبر ۲۰۵: اس آیت میں ذکر کے حوالے سے آداب کا بیان ہے جو درج ذیل ہیں:

۱۔ ذکر دل کی توجہ کے ساتھ ہلکی آواز سے کیا جائے اور آواز کو زیادہ بلند نہ کیا جائے۔ ۲۔ ذکر کے دوران انسان میں رقت اور اللہ ﷻ کا خوف طاری ہو۔

۳۔ خاص طور سے صبح وشام اللہ ﷻ کا ذکر کیا جائے۔ صبح وشام میں دونوں وقت کی نمازیں بھی داخل ہیں۔ ۴۔ اللہ ﷻ کی یاد سے کبھی بھی غفلت نہ برتی جائے۔

علمی بات: دل کے آئینہ سے غفلت کا غبار اور روح سے نافرمانی کے داغ دھونے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی کی صبح وشام یاد الٰہی میں بسر کرے۔ ذکر تب اپنا پورا اثر دکھاتا ہے جب اس میں مذکورہ شرائط موجود ہوں۔ (۱) ذکر کرتے وقت انسان عاجزی اور انکساری کا مجسمہ بنا ہوا ہو۔ کبر وغرور اور غفلت وکاہلی سے کوسوں دور ہو۔ (۲) اسے اس بات کا ہر وقت شدید احساس ہو کہ اس کے اعمال اور اس کا ذکر اُس بارگاہ رفعت وجلال کے شایان شان نہیں۔ (۳) ذکر گلا پھاڑ پھاڑ کر نہ کرے۔ جس میں بے ادبی کا شائبہ ہو بلکہ درمیانی آواز سے کیا جائے جس میں خشیت، ادب اور سنجیدگی ہو۔

علمی بات: ایک رات حضور رحمت عالم ﷺ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے گھر کے پاس سے گزرے تو دیکھا کہ وہ نماز میں چپکے چپکے تلاوت میں مشغول ہیں اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے گھر کے پاس سے گزرے تو ملاحظہ فرمایا کہ نماز میں بلند آواز سے تلاوت کر رہے ہیں۔ صبح ہوئی تو دونوں کو بلایا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو ہدایت فرمائی کہ ذرا بلند آواز سے تلاوت کیا کریں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ ذرا آہستہ تلاوت کیا کریں اور اہل علم نے لکھا ہے کہ ریاء کا اندیشہ ہو یا نمازیوں اور آرام کرنے والوں کی تکلیف کا اندیشہ ہو تو پھر آہستہ ذکر کرنا ہی مستحب ہے۔

آیت نمبر ۲۰۶: اس آیت میں اللہ ﷻ کے مقرب فرشتوں کی عاجزی کا بیان ہے۔ گناہوں سے مبرا ہونے کے باوجود وہ اللہ ﷻ کی عبادت میں لگے رہتے ہیں۔ وہ ہر وقت اللہ ﷻ کی تسبیح کرتے ہیں اور اسی کے آگے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ آیت کے اختتام میں سجدہ کا حکم ہے تاکہ انسانوں کا حال بھی مقرب فرشتوں کے مطابق ہو۔

علمی وعملی بات: رب کی یاد سے غفلت ایک قسم کا تکبر ہے۔ قرب خداوندی کے طالب اس سے حد درجہ اجتناب واحتراز کرتے ہیں۔ اسی لئے اللہ ﷻ کے مقرب فرشتے بھی مقرب ہونے کے باوجود اللہ ﷻ کی عبادت وبندگی سے تکبر نہیں کرتے۔ وہ دن رات اسی کی تسبیح وتقدیس میں لگے رہتے ہیں اور تھکتے نہیں۔ وہ خاص اسی کو سجدہ کرتے ہیں اور سجدہ قرب خداوندی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

فرمان نبوی ﷺ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سجدہ کی حالت میں بندہ اپنے رب سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ لہٰذا (سجدہ کی حالت میں) زیادہ دعا کیا کرو۔

عملی بات: ترتیب تلاوتِ قرآنِ حکیم کے مطابق یہ پہلی آیت ہے جس پر سجدہ کرنا واجب ہوتا ہے۔

صحیحین میں عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب غیر حالت نماز میں کوئی سجدہ والی سورت پڑھتے تو سجدہ کرتے اور ہم لوگ بھی سجدہ کرتے اور ازدحام کی وجہ سے لوگ اپنی پیشانی کے لئے جگہ نہیں پاتے تھے۔ احادیث میں اللہ ﷻ کے لئے سجدہ کرنے کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ امام مسلم نے حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ میں نے رسول ﷺ سے پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا اللہ ﷻ کے لئے کثرت سے سجدہ کیا کرو، اگر اللہ ﷻ کے لئے ایک سجدہ کروگے تو اللہ ﷻ تمہارا مقام ایک درجہ بلند کرے گا اور ایک گناہ مٹادے گا۔ (صحیح مسلم)

عملی بات: اس سورۃ کا اختتام فرشتوں کے ذکر خیر سے کیا جارہا ہے اور بتایا جارہا ہے کہ جب یہ نورانی اور پاک مخلوق ہر وقت اپنے پروردگار کے ہر حکم کے سامنے سر تسلیم خم کیئے ہوئے ہے۔ ان کی زبانیں اپنے رب قدیر کی حمد وثنا اور تسبیح وتحمید میں مدح سرا ہیں اور ان کے دل اس کی یاد میں محو ہیں اور ان کی پیشانیاں اس کی

بارگاہ میں سجدہ ریز ہیں تو انسان جو مسجودِ ملائکہ ہے اور اللہ ﷻ کا خلیفہ ہے اس کا بھی فرض ہے کہ وہ اپنے مولائے کریم کی عبادت اور اطاعت میں صبح و شام کوشاں رہے۔ ہر دم اس کی یاد، اس کا ذکر اور اس کی محبت میں سرشار رہے۔ وہ بھی ملاء اعلیٰ کے رہنے والوں کی موافقت میں سجدہ ریز ہو جائے۔

عملی اور علمی بات: سجدۂ تلاوت شیطان کے لئے بہت بڑی مار ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب ابن آدم آیت سجدہ پڑھتا ہے پھر سجدہ کرتا ہے تو شیطان روتا ہوا وہاں سے ہٹ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ ہائے میری بربادی! ابن آدم کو سجدہ کا حکم ہوا تو اس نے سجدہ کر لیا لہٰذا اس کے لئے جنت ہے اور مجھے سجدہ کا حکم دیا گیا اور میں نے انکار کیا لہٰذا میرے لئے دوزخ ہے۔ (صحیح مسلم)

علمی بات: ۱۔ یہ آیت سجدہ ہے اور اس طرح کی چودہ آیاتِ سجدہ ہیں جن کو جب انسان پڑھے یا سنے تو اس پر سجدہ کرنا لازمی ہے۔ اسے سجدہ تلاوت کہتے ہیں۔

۲۔ سجدۂ تلاوت کے ادا کرنے کی بھی وہی شرطیں ہیں جو سجدہ نماز کی ہیں۔ یعنی باوضو ہو، پاک جگہ ہو وغیرہ۔

۳۔ سجدۂ تلاوت کرنے لگے تو اس میں تکبیر تحریمہ کی طرح ہاتھ اٹھانا نہیں ہے بلکہ اللہُ اَکْبَر کہتا ہوا سجدہ میں چلا جائے اور ایک سجدہ کرے تکبیر کہتے ہوئے سر اٹھائے اس میں تشہد اور سلام نہیں ہے۔

۴۔ جیسے آیت سجدہ پڑھنے والے پر سجدہ واجب ہوتا ہے ایسے ہی سننے والے پر بھی واجب ہو جاتا ہے اگرچہ اس نے ارادہ کر کے نہ سنا ہو، البتہ تلاوت کرنے والے کے لئے بہتر یہ ہے کہ آیت سجدہ حاضرین کے سامنے زور سے نہ پڑھے، ہاں اگر حاضرین سننے ہی کے لئے بیٹھے ہیں تو سجدۂ تلاوت زور سے پڑھ دے۔

سجدۂ تلاوت کی دعا: سجدۂ تلاوت میں اگر سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْم تین مرتبہ کہے تو یہ بھی درست ہے اور اگر اس کے ساتھ دعاء ماثور پڑھ لے تو زیادہ بہتر ہے۔ دعاء ماثور یہ ہے: سَجَدَ وَجْهِي لِلَّذِيْ خَلَقَهٗ وَ شَقَّ سَمْعَهٗ وَ بَصَرَهٗ بِحَوْلِهٖ وَ قُوَّتِهٖ (سنن ابی داؤد، جامع ترمذی)

"میرے چہرہ نے اس ذات کے لئے سجدہ کیا جس نے اسے پیدا فرمایا اور اسے اپنی طاقت و قدرت کے ذریعہ آنکھ و کان نکال کر (زینت بخشی)"۔

سُوْرَۃُ یُوْنُس

ربطِ سورت:

سورۃ یونس میں بتایا گیا ہے کہ قتال فی سبیل اللہ سے پہلے اتمام حجت یعنی محکم دلائل کے ساتھ دعوت توحید کا پہنچ جانا ضروری ہے۔

آیت نمبر ۱: یہ حروف مقطعات ہیں۔ حروف مقطعات کا علم اللہ ﷻ کے پاس ہے اور یہ اللہ ﷻ اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان ایک راز ہے۔ "کتاب" سے مراد قرآنِ حکیم ہے۔ قرآنِ حکیم کی عظمت ہے کہ اس کی تمام آیات حکمت سے بھری ہیں۔

علمی بات: حکیم کا معنی ہے دانا، یعنی یہ حکمت اور دانائی والی کتاب کی آیتیں ہیں۔ اللہ ﷻ کی طرف سے جتنی کتابیں نازل ہوئی ہیں سب برحق ہیں مگر ان تمام کتابوں میں سے زیادہ دانائی اور حکمت اس کتاب میں ہے اور حکیم کا معنی محکم اور اٹل بھی کیا گیا ہے کہ یہ کتاب اپنی جگہ بڑی محکم اور اٹل ہے۔ دنیائے کفر نے اس کے خلاف بڑی کوشش کی ہے مگر کامیاب نہیں ہو سکی اور نہ قیامت تک کامیاب ہو سکے گی۔

علمی بات: قرآنِ حکیم کی آیات ایسی مضبوط و محکم کتاب کی آیات ہیں جو الفاظ کی تبدیلی اور معنوی تحریف سے محفوظ رہے گی نیز اس کتاب میں ذکر کردہ ہر بات پکی ہے، علوم و معارف ایسے جو فطرت انسان اور عقل و حکمت کے موافق ہیں۔ احکام ایسے پائیدار و مستحکم کہ قیامت تک کوئی دوسری کتاب اس کو منسوخ نہیں کر سکتی۔ خبریں اور قصے ایسے محکم کہ واقعہ کے عین مطابق ہیں۔ اور ایسا کیوں نہ ہو جب کہ یہ خدائے علیم و حکیم کا نازل کردہ اور اس کا کلام ہے۔ جو اللہ ﷻ کا کلام ہو اس کے تغیر و تبدیل کا کوئی امکان نہیں اور چونکہ یہ آخری اُمّت کے لئے اتاری گئی آخری کتاب ہے لہٰذا اس کے لئے کوئی ناسخ نہیں آئے گا، چنانچہ اب قرآن حکیم اللہ ﷻ کا آخری کلام قیامت تک کی انسانیت کے نام ہے۔

آیت نمبر ۲: اس آیت میں مشرکین کے ایک اعتراض کا جواب دیا گیا ہے وہ کہتے تھے کہ رسول انسان نہیں بلکہ فرشتہ ہونا چاہئے۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ رسول کا انسان ہونا ہی ضروری ہے تاکہ وہ انسانوں کے لئے نمونہ بن سکیں۔ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لا کر ان کی تعلیم کو تسلیم کرنے والے کو اعلیٰ درجات کی بشارت دی گئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کو تسلیم کرنے کے بجائے کفار نے ان کو جادوگر قرار دیا (معاذ اللہ)۔

علمی بات: مشرکین مکہ اس بات پر حیرت کرتے تھے کہ انہی جیسا ایک آدمی ان کی رہنمائی کے لئے بھیجا گیا ہے، اللہ ﷻ نے ان کی اس حیرت کی تردید فرمادی ہے کہ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں بلکہ اگر وہ رسول کوئی فرشتہ یا جن ہوتا تو حیرت کی بات تھی، اس لئے کہ بنی نوع انسان یا تو اسے دیکھ نہیں پاتے یا اگر دیکھ پاتے تو اس سے مانوس نہیں ہوتے، کیونکہ انسان اپنے ہی جیسے جسد خاکی رکھنے والے انسان کے ساتھ مانوس ہوتا ہے۔ اس لئے نبی کریم ﷺ کا مبعوث ہونا فطرت اور عقل کے تقاضے کے عین مطابق تھا اور جب آپ ﷺ کو نبوّت عطا فرمائی تو اللہ ﷻ نے آپ کو بذریعہ وحی حکم دیا کہ آپ لوگوں کو آخرت کے دن کے عذاب سے ڈرائیں اور مومنوں کو خوشخبری دیں کہ اللہ ﷻ قیامت کے دن ان کے ایمان اور عمل صالح کا اچھے سے اچھا بدلہ دے گا، اور شافع محشر محمد ﷺ ان کے لئے شفاعت فرمائیں گے۔ لیکن کفار قریش نے آپ کی دعوت قبول نہیں کی اور جب ان سے کچھ نہ بن پڑا، تو کہنے لگے کہ یہ آدمی تو صریح جادوگر ہے اور یہ قرآنِ حکیم کھلا جادو ہے (معاذ اللہ) جو انسانوں کو مسحور کر دیتا ہے، یہ آسمان سے نازل شدہ اللہ ﷻ کی کوئی کتاب نہیں ہے۔

علمی بات: کفار و مشرکین آپ ﷺ کو اس وجہ سے بھی جادوگر کہتے تھے کہ آپ اللہ ﷻ کا جو کلام پیش کر رہے تھے اس میں لطافت، شیرینی اور تاثیر اتنی زیادہ تھی کہ کافر بھی یہ کلام سن کر مسحور ہو جاتے تھے جیسا کہ نبی اکرم ﷺ کا اپنا ارشاد ہے کہ "اِنَّ مِنَ الْبَیَانِ لَسِحْرًا" (صحیح بخاری) یعنی کوئی بیان ایسا ہوتا ہے جو جادو کا سا کام کر جاتا ہے۔ قرآنِ حکیم کی ایسی تاثیر کی وجہ سے قریش نے بلند آواز سے قرآنِ حکیم پڑھنے پر پابندی لگا رکھی تھی اور کہتے تھے کہ اس سے ہماری عورتیں اور بچے متاثر ہوتے ہیں۔ حالانکہ یہ پابندی لگانے والے قریشی سردار خود قرآنِ حکیم سن کر اس سے لطف اندوز ہوتے تھے اور اپنے باہمی معاہدہ کے باوجود چوری چھپے قرآنِ حکیم سن لیا کرتے تھے۔ یہ کتاب حکمت سے پُر اور دانائی سے معمور ہے اور اتنی فصیح و بلیغ کہ قادر الکلام عرب شعراء اس کی آیت کی مثل تک نہ لا سکے پھر چونکہ یہی

قرآنِ حکیم آپ ﷺ ان پر پیش فرمارہے تھے تو کافر لوگ آپ ﷺ کو جادوگر کہہ دیتے تھے اور اکثر انبیاء ورسل علیہم السلام کو کفار ومشرکین کی جانب سے انہی القاب سے نوازا جاتا رہا ہے جن کو کوئی حسی معجزہ عطا کیا گیا تھا۔ حالانکہ ایک رسول علیہ السلام اور ایک جادوگر کی زندگی میں زمین وآسمان کا فرق ہوتا ہے

نبی اور جادوگر میں فرق: ۱۔ جادو ایک فن ہے جو سیکھنے سے حاصل ہوتا ہے ہر جادوگر کسی استاد کا شاگرد ہوتا ہے جبکہ معجزہ محض اللہ ﷻ کی طرف سے عطا ہوتا ہے یہ سیکھنے سکھلانے کی چیز نہیں ہوتی۔

۲۔ جادو ایک پیشہ ہے جسے مال ودولت کے حصول کے لئے اختیار کیا جاتا ہے اور اس معاملہ میں جادوگر انتہائی پست ذہنیت کے مالک ہوتے ہیں جیسا کہ فرعون نے جب جادوگروں کو بلایا تو ان کا پہلا سوال ہی یہ تھا کہ "کہ ہمیں اس کا کچھ معاوضہ بھی ملے گا؟" جبکہ نبی انسانیت کی بے لوث خدمت کرتا ہے وہ برملا لوگوں سے کہہ دیتا ہے کہ میں تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔

۳۔ جادو بالعموم ایسی باتوں کے لئے کیا جاتا ہے جن سے کسی کو دکھ اور تکلیف پہنچانا مقصود ہو جبکہ معجزہ بندوں کی ہدایت کے لئے نبوت کی علامت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے اور اس سے مقصود سراسر بھلائی ہوتی ہے۔

۴۔ جادوگر کے اخلاق وکردار دونوں مکروہ ہوتے ہیں اور لوگ اگر ان کی عزت کرتے ہیں تو ان کے شر سے بچنے کی خاطر کرتے ہیں جبکہ انبیاء علیہم السلام کے اخلاق اور کردار نہایت پاکیزہ ہوتے ہیں اور اسی بنا پر ان کی عزت کی جاتی ہے اور ان کی گذشتہ زندگی کو کفار کے سامنے معیار کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

ایسے واضح تضاد کے باوجود مخالفین اگر انبیاء کرام علیہم السلام کو جادوگر کہنا ان کی ضد، ہٹ دھرمی، عناد، اپنے آباواجداد کے مذہب کا تعصب اور اپنے مناصب اور سرداریوں کے ختم ہوجانے کے خوف سے تھا اور یہی چیز ان کے پیش نظر تھی جو قبول اسلام سے مانع تھی۔

آیت نمبر ۳: اس آیت میں اللہ ﷻ کے حقیقی رب ہونے کے دلائل بیان کئے گئے ہیں۔ اللہ ﷻ نے چھ دن میں پوری کائنات پیدا فرمائی، پھر عرش پر جلوہ فرما ہوا جیسا کہ اس کی شان کے لائق ہے۔ کائنات کا خالق بھی اللہ ﷻ ہے اور مدبر ومنتظم بھی وہی عظیم ہستی ہے۔ اللہ ﷻ کی اجازت کے بغیر کوئی کسی کے لئے سفارش نہیں کرسکتا۔ ان سب باتوں کا تقاضا ہے کہ اللہ ﷻ ہی کو اپنا رب تسلیم کرکے اسی کی بندگی اختیار کی جائے۔

علمی بات: اس آیت میں تخلیق کائنات اور نظام کائنات کو بیان فرمایا ہے کہ اللہ ﷻ ہی نے زمینوں اور آسمانوں کو چھ ایام میں پیدا کیا، یعنی یہ کائنات از خود وجود میں نہیں آگئی، جیسا کہ دہریوں کا عقیدہ ہے۔ پھر وہ اللہ ﷻ اپنی شان کے مطابق عرش پر جلوہ فرما ہوا۔ پھر وہ کائنات کو پیدا کرکے بیٹھ نہیں گیا، جیسا کہ بعض گمراہ لوگوں کا خیال ہے، بلکہ اس کا پورا انتظام چلا رہا ہے۔ چنانچہ سورج وچاند اور ستارے سب اسی کے حکم کے مطابق گردش کررہے ہیں وہ قادرِ مطلق اور اتنے رعب ودبدبے والا ہے کہ کوئی اس کے سامنے کسی دوسرے کی سفارش بھی کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا، اِلاَّ یہ کہ وہ خود ہی کسی کو سفارش کی اجازت دے۔ لہٰذا ان سب باتوں کا تقاضا یہ ہے کہ تم لوگ اس بااختیار اور مقتدر ذات کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرو کیونکہ وہی تمہارا پروردگار ہے۔

علمی بات: اس جگہ غور طلب بات یہ ہے کہ آسمان وزمین کی چھ ایام میں تخلیق سے کیا بتانا مقصود ہے؟ ایام یوم کی جمع ہے اور عام طور پر صبح سے لے کر شام تک کے وقت کو یوم کہا جاتا ہے لیکن اس جگہ ایّام کا ذکر ہورہا ہے جب کہ نہ سورج تھا اور نہ ہی صبح وشام کا کوئی وجود اس لئے آیت کریمہ میں یوم سے مراد وہ دن تو ہو نہیں سکتا جس کا ابھی وجود نہ تھا۔ ہاں! اس سے مراد محض وقت ہے اور جس کی مقدار اللہ ﷻ ہی کے علم میں ہے۔

آیت نمبر ۴: اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ لوگوں کو لازماً پلٹ کر اللہ ﷻ کی طرف جانا ہے۔ جس اللہ ﷻ نے مخلوق کو پہلی بار پیدا کیا وہی مرنے کے بعد اُسے دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہے۔ قیامت کے دن عدل کے فیصلے ہوں گے۔ ایمان اور عمل صالح اختیار کرنے والوں کو پورا بدلہ دینے کی بشارت دی گئی ہے۔ اس کے برعکس جھٹلانے والوں کے لئے کھولتا ہوا مشروب اور دردناک عذاب ہوگا۔

علمی بات: اکثر اوقات چور، ڈاکو اور لٹیرے جھوٹی گواہوں یا اپنے اثر ورسوخ اور دولت کے بل بوتے پر سزا سے بچ جاتے ہیں اور قوم وملّت کی نگاہوں میں اشراف بنے ہوتے ہیں لہٰذا اس امر کی شدّت سے ضرورت تھی کہ ایسا دن مقرر ہو جس میں پاکبازوں کو اُن کی نیکی کا صلہ اور اجر ملے اور بُروں اور مفسدوں کو ان کی بد اعمالیوں کی سزا ملے اسی کو عالمِ آخرت سے تعبیر کیا گیا ہے اور یہی چیز اسلام نے انتہائی کھلے انداز میں پیش کرکے اسے یوم الجزاء اور یوم الحساب قرار دیا۔

آیت نمبر ۵: اللہ ﷻ کی نشانیوں میں سے سورج اور چاند کا بیان ہے۔ سورج اور چاند کی مقررہ حساب کی مطابق اپنے مدار میں گردش کر رہے ہیں۔ دونوں کے ذریعہ سالوں کی گنتی اور حساب معلوم کرنے کے علاوہ انسانوں کے لئے بے شمار فوائد ہیں۔ یہ دلائل ان لوگوں کے لئے ہیں جو اللہ ﷻ کی دی ہوئی عقل سے غور و فکر کرتے ہیں۔

علمی بات: ان آیات میں مزید مظاہر قدرت بیان فرمائے جو اللہ ﷻ کی وحدانیت پر دلالت کرتے ہیں۔ اول آفتاب کی روشنی کا اور پھر چاند کی روشنی کا تذکرہ فرمایا کہ اللہ ﷻ نے ان دونوں کو سراپا روشنی بنایا۔ آفتاب کے لئے لفظ ضِیَاء اور چاند کے لئے لفظ نُور استعمال فرمایا۔ علمائے تفسیر نے لکھا ہے کہ ضِیَاء بڑی اور قوی روشنی کو کہتے ہیں اور نُور قوی اور ضعیف ہر روشنی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ لہٰذا آفتاب کے لئے لفظ ضِیَاء استعمال میں لایا گیا۔ اللہ ﷻ نے آفتاب کو زیادہ قوی روشنی دی جب وہ طلوع ہوتا ہے تو رات چلی جاتی ہے اور دن آجاتا ہے، چونکہ دن میں چلنے پھرنے اور کاروبار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے دن کو بہت زیادہ روشن بنایا اور رات کو سکون اور آرام کے لئے بنایا ہے۔ چونکہ آرام و سکون کے لئے دھیمی روشنی کی ضرورت ہے اس لئے چاند کو دھیمی روشنی عطا فرمائی جس کے لئے لفظ نور استعمال فرمایا۔ ایسی روشنی جو آنکھوں کو نہ چبھے بلکہ بھلی معلوم ہوتی ہو۔

علمی بات: یہ اللہ ﷻ کی قدرت کاملہ پر شاہد اور وحدانیت کے دلائل میں سے ہے، پھر اُن منزلوں کے تقرّر کے ساتھ انسانوں کے نفع کو بھی بیان فرمادیا کہ وہ ان کے ذریعہ یہ معلوم کر لیتے ہیں کہ فلاں معاملہ یا معاہدہ کو کتنے برس گزر گئے اور میعاد پورا ہونے میں کتنے برس باقی ہیں۔ آفتاب کی منازل کا پتہ تو ماہرینِ فلکیات وغیرہ کو ہی ہو سکتا ہے لیکن چاند کے طلوع اور غروب اور گھٹنے بڑھنے سے عام طور سے تاریخ کا پتہ چل جاتا ہے، پڑھا لکھا شہری انسان ہو یا دیہاتی ہر شخص آسانی سے مہینہ کی ابتداء اور انتہا سمجھ لیتا ہے اور شرعاً احکام شرعیہ میں چاند کے مہینوں ہی کا اعتبار کیا جاتا ہے زکوٰۃ کی ادائیگی بھی چاند ہی کے اعتبار سے بارہ مہینے گزرنے پر فرض ہوتی ہے، اور رمضان کا مہینہ بھی چاند ہی کے حساب سے پہچانا جاتا ہے جو قمری سال کا نواں مہینہ ہے، اور حج بھی چاند ہی کے حساب سے ذی الحجہ کی نویں تاریخ کو ہوتا ہے عدت کے مہینوں میں بھی چاند کا اعتبار ہوتا ہے۔

آیت نمبر ۶: رات اور دن کے نظام اور پوری کائنات میں اللہ ﷻ کی معرفت کی نشانیاں موجود ہیں۔ ان نشانیوں پر غور و فکر کرنے والوں پر اللہ ﷻ کی عظمت واضح ہو جاتی ہے۔ لہٰذا وہ اللہ ﷻ کی نافرمانی سے بچتے اور اس کے عذاب سے ڈرتے رہتے ہیں۔

علمی بات: اس کائنات کے جن حقائق کی طرف قرآنِ حکیم اشارہ فرماتا ہے اس کا ایک مقصد تو یہ ہے کہ کائنات کا یہ حیرت انگیز نظام جس میں چاند و سورج ایسے منظم و طے شدہ حساب کے پابند ہو کر اپنا کام کر رہے ہیں وہ اللہ ﷻ کی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ کی نشانی ہے، اس بات کو مشرکین عرب بھی تسلیم کرتے تھے کہ یہ سب چیزیں اللہ ﷻ ہی کی پیدا کی ہوئی ہیں، قرآنِ حکیم فرماتا ہے کہ جو ذات اتنے عظیم الشان کاموں پر قادر ہو اسے اپنی خدائی میں آخر کسی اور شریک کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے، لہٰذا یہ پوری کائنات اللہ ﷻ کی توحید کی گواہی دیتی ہے، دوسرا مقصد یہ ہے کہ ساری کائنات بے مقصد پیدا نہیں کی گئی، اگر اس دنیوی زندگی کے بعد آخرت کی ابدی زندگی نہ ہو جس میں نیک لوگوں کو اچھا صلہ اور بُرے لوگوں کو برائی کا بدلہ نہ ملے تو اس کائنات کی پیدائش بے مقصد ہو کر رہ جاتی ہے، لہٰذا یہی کائنات توحید کے ساتھ ساتھ آخرت کی ضرورت کو بھی بدرجہ اتم ثابت کرتی ہے۔

آیت نمبر ۷: اس آیت میں دنیا کے طلب گار اور اللہ ﷻ کی نشانیوں پر غور نہ کرنے والوں کی چار حالتیں بیان کی گئی ہیں:

۱۔ انہیں اللہ ﷻ سے ملنے کی توقع نہیں۔
۲۔ انہوں نے دنیاوی زندگی ہی کو سب کچھ سمجھ لیا۔
۳۔ اسی دنیاوی زندگی پر وہ خوش اور مطمئن ہیں۔
۴۔ ایسے غافل ہیں کہ توحید کی ہر طرف پھیلی ہوئی نشانیوں کو دیکھنے کے باوجود خوابِ غفلت سے بیدار نہیں ہوتے۔

عملی پہلو: اللہ ﷻ سے غافل لوگوں کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ انہوں نے دنیا میں ایسا دل لگایا کہ آخرت کی اور اللہ ﷻ کے پاس جانے کی کچھ خبر ہی نہ رہی۔ اسی چند روزہ حیات کو مقصود اصلی بنالیا۔ اور قدرت کی جو نشانیاں اوپر بیان ہوئیں، ان میں کبھی غور و تامل نہ کیا کہ ایسا مضبوط اور حکیمانہ نظام یوں ہی بیکار نہیں بنایا گیا۔ ضرور اس تخلیق کا کوئی خاص مقصد ہو گا۔ پھر جس نے پہلی مرتبہ ایسی عجیب و غریب مخلوقات پیدا فرمائی، اس کے لئے دوبارہ پیدا کرنا کیا مشکل ہے۔

آیت نمبر ۸: اللہ ﷻ سے ملاقات کو بھلانے والے دنیا پرستوں کے بُرے انجام کا ذکر ہے۔ ان کی غفلت کا بدلہ یہ ہے کہ انہیں جہنم کی آگ میں ڈالا جائے گا۔ یہ سزا ان کے اپنے عمل کا نتیجہ ہو گی۔

فرمان نبوی ﷺ: جہنم کو خواہشات سے اور جنت کو ناپسندیدہ (مشکل) امور سے ڈھانپ دیا گیا ہے۔ (مسند احمد)

علمی و عملی بات: معلوم یہ ہوا کہ جس کسی نے تمام ہمت اور کوشش اور عمر آرت سے غافل رہ کر خواہشات دنیا کے پورا کرنے میں گزار دی اس نے گویا دوزخ کے دروازہ کا پردہ اٹھایا اور دوزخ میں جانے کا قصد و ارادہ کیا اور جس کسی نے دین کے راستہ پر چلنے میں تکالیف اور مصائب کو صبر و تحمل کے ساتھ برداشت کیا اور اللہ ﷻ کی رضا پر راضی رہا گویا اس نے جنت کے دروازہ کا پردہ اٹھایا اور جنت میں جانے کا ارادہ کیا۔ غرض جو معنی اس حدیث کے ہیں وہی معنی ان آیتوں کے ہیں۔ گویا یہ حدیث ان آیتوں کی تفسیر ہے جس کا مفہوم یہ ہوا کہ خواہشاتِ دنیا میں ہی لگے رہنا اور آخرت کو پس پشت ڈالنا رحمت الٰہی اور جنت سے روکنے والی چیزیں ہیں۔

فرمانِ نبوی ﷺ: اللہ ﷻ اپنے جس بندے کی آخرت کی بھلائی چاہتا ہے اس کو دنیا اور خواہشات دنیا سے ایسا بچاتا ہے جس طرح کوئی آدمی اپنے بیمار کو بدپرہیزی کی چیزوں سے بچاتا ہے۔ (طبرانی اور مستدرک حاکم)

آیت نمبر ۹: اللہ ﷻ کی نشانیوں میں غور و فکر کرنے والوں کی رہنمائی کا بیان ہے۔ ان کے ایمان و نیک اعمال کا بدلہ ابدی نعمتوں اور راحتوں والے جنت کے باغات کی صورت میں دیا جائے گا۔

علمی بات: حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مومن جب اپنی قبر سے نکلے گا تو اس کا عمل ایک نہایت حسین اور خوشبودار صورت میں اس کے سامنے آئے گا۔ وہ اسے دیکھ کر کہے گا "تم کیا چیز ہو، اللہ ﷻ کی قسم میں تو تمہیں سراسر ایک سچا آدمی دیکھ رہا ہوں"۔ وہ کہے گا میں تمہارا عمل ہوں۔ "پھر وہ اس کی نور اور جنت تک رہنمائی کرے گا۔ اس کے برعکس جب کافر اپنے قبر سے نکلے گا تو اس کا عمل ایک نہایت مکروہ اور بدبودار شکل و صورت میں اس کے سامنے آئے گا وہ اس سے کہے گا تم کیا چیز ہو؟ میں تو تمہیں سراسر ایک برا آدمی دیکھ رہا ہوں"۔ وہ کہے گا: میں تمہارا عمل ہوں پھر وہ اسے لے کر جہنم میں جا پھینکے گا۔ (جامع البیان، امام ابن ابی حاتم)

ایمان اور عمل صالح والوں کو ان کے ایمان کی وجہ سے اللہ ﷻ دنیا میں صراط مستقیم کی ہدایت، یعنی سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرماتا ہے یا یہ مطلب ہے کہ دنیا میں ایمان لانے کی وجہ سے قیامت کے دن اللہ ﷻ کی طرف سے ان کی رہنمائی ہوگی، حتیٰ کہ وہ (پل) صراط سے گزر کر سیدھے جنت میں پہنچ جائیں گے۔ (سورۃ حدید ۵۷، آیات: ۱۲، ۱۳) میں فرمایا گیا ہے کہ ایمان والے مردوں اور عورتوں کا نور ان کے آگے اور ان کے دائیں طرف دوڑ رہا ہوگا جب کہ منافق مرد اور عورتیں ان سے درخواست کریں گے کہ ہمیں بھی اپنے نور سے فائدہ اٹھا کر ساتھ چلنے کا موقع دو۔ گویا مومن اپنے نور ایمان کی مدد سے چلتے ہوئے جنت میں پہنچ جائیں گے، جب کہ منافق اندھیرے میں رہ جائیں گے۔

آیت نمبر ۱۰: اہل جنت کے چند مخصوص حالات کا بیان ہے۔ ان کی زبانوں پر اللہ ﷻ کی حمد و تسبیح جاری ہوگی۔ ہر ملاقات پر وہ ایک دوسرے کو سلامتی کی دعائیں دیں گے۔ ان کی ہر مجلس کا اختتام اللہ ﷻ کی حمد و ثنا کے ساتھ ہوگا حدیثِ مبارک کے مطابق اہلِ جنت کے وجود میں تسبیح و تحمید سانس کی طرح جاری ہوگی۔ (صحیح مسلم)

فرمانِ نبوی ﷺ: "جنّتی جنت میں کھائیں گے اور پئیں گے، وہ نہ تھوکیں گے، نہ پیشاب کریں گے، نہ پاخانہ کریں گے اور نہ ناک صاف کریں گے"۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا: "جو کھانا وہ کھائیں گے وہ کہاں جائے گا؟" تو رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا: "بس ڈکار آئے گی اور پسینہ آئے گا جس سے مشک (کستوری) کی خوشبو آئے گی (اور ان کا کھانا تحلیل ہو جائے گا)۔ (ان کے دلوں میں اور ان کی زبانوں پر) تسبیح اور حمد خود بخود بے اختیار جاری ہوگی جس طرح سانس خود بخود جاری رہتی ہے"۔ (صحیح مسلم)

علمی بات: "تَحِيَّتُهُم" کے معنی ہیں زندگی کی دعا دینا کہ اللہ ﷻ تمہیں زندگی بخشے، یعنی وہ ایک دوسرے سے ملیں گے تو ایک دوسرے کو زندہ رہنے کی دعا سلام کے الفاظ سے دیں گے، جیسا کہ اللہ ﷻ نے (سورۃ ابراہیم ۱۴، آیت: ۲۳)، (سورۃ مریم ۱۹، آیات: ۶۰ تا ۶۲) اور (سورۃ واقعہ ۵۶، آیات: ۲۵، ۲۶) میں بیان فرمایا ہے۔ اور ان کی دعا اور گفتگو کا اختتام رب العالمین کی حمد کے ساتھ ہوگا، دنیا میں بھی ان کی گفتگو اور دعا کا خاتمہ اللہ ﷻ کی حمد و تسبیح کے ساتھ ہوا کرتا تھا، جنت میں بھی یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے گا۔

آیت نمبر ۱۱: اس آیت کے اصل مخاطب منکرین آخرت ہیں مگر اس کا حکم عام ہے کہ انسان جلد باز ہے اور فوری طور پر خیر اور بھلائی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اگر اس کے لئے اس کی بُرائی پر اتنی ہی جلد عذاب کا فیصلہ کر دیا جاتا تو جلد ہی وہ موت اور تباہی سے دوچار ہو جاتا لیکن اللہ ﷻ کا قانون یہ ہے کہ کوئی شخص نیکی کرتا ہے تو اس کا ثواب

فوراً اس کے اعمال نامہ میں شامل کر دیا جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص بُرائیوں کا مرتکب رہتا ہے تو اللہ ﷻ اس کو ڈھیل دیتا ہے تاکہ وہ کسی نہ کسی موڑ پر توبہ کر کے اپنی اصلاح کر لے۔ اللہ ﷻ کا یہ قانون انسان کے لئے بہت بڑی رحمت ہے، ورنہ انسان اپنے نفس پر بڑا ظُلم کرنے والا ہے کہ وہ ہر وقت بُرائی کرنے پر آمادہ رہتا ہے اور اگر لوگوں کی ان کی بُرائیوں پر فوراً گرفت کی جانے لگے تو ان کی مہلت عمر بہت جلد ختم ہو جائے اور زمین کی پشت چلنے والے انسانوں سے خالی ہو جائے۔

دنیا کی زندگی میں وہی لوگ سرکش بنتے ہیں جو دنیا میں اس تصوّر کے ساتھ جیتے ہیں کہ مرنے کے بعد انہیں اللہ ﷻ کا سامنا نہیں کرنا ہو گا۔ جو مؤاخذہ اور گرفت کے اندیشہ سے خالی ہو کر زندگی گزارتے ہیں جو اپنے آپ کو آزاد سمجھتے ہیں کہ جو جی میں آئے کر گزریں۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگوں کے درمیان سچائی اور انصاف کے ساتھ معاملہ کرنے کا ایک ہی حقیقی محرک ہے کہ انسان اس بات کا مکمل یقین رکھے کہ سب طاقتوروں کے اوپر ایک ایسا طاقتور ہے کہ ہر انسان اس کے آگے بے بس ہے۔ ایک دن تمام انسان اس کے حضور پیش ہوں گے اور ہر ایک مجبور ہو گا کہ اپنے بارے میں اس ذات کے فیصلہ کو تسلیم کرے۔

علمی بات: اس آیت کی دو تفسیریں بیان کی گئی ہیں۔ پہلی یہ کہ عذاب کے مطالبہ میں کفار جلدی مچاتے تھے کہ جس عذاب سے ہمیں ڈراتے ہو اس عذاب کو لے آؤ، فرمایا: (سورۃ الحج ۲۲، آیت: ۴۷) "اور وہ آپ سے عذاب جلدی مانگتے ہیں"۔ حتیٰ کہ انہوں نے اللہ ﷻ سے دعا کی کہ یا اللہ! اگر اسلام واقعی حق ہے تو ہم پر پتھروں کی بارش برسایا کوئی دردناک عذاب بھیج دے۔ دیکھیے (سورۃ انفال ۸، آیت ۳۲) اللہ ﷻ فرماتا ہے کہ ہم جس طرح انہیں خیر بہت جلدی عطا کر دیتے ہیں اسی طرح (ان کے مطالبے پر) عذاب بھی جلدی بھیج دیتے تو یہ کبھی کے ہلاک ہو چکے ہوتے، مگر ہم انہیں مہلت دے کر پورا موقع دیتے ہیں کہ واپس پلٹ آئیں یا اتمام حجت ہو جائے۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ اللہ ﷻ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے، انسان جب اپنے یا دوسروں کے لئے بھلائی کی دعا کرتا ہے تو اسے جلد قبول فرماتا ہے لیکن جب غصے یا رنج کی کیفیت میں اپنی زبان سے اپنے اہل و عیال یا دوسروں کے لئے بد دعا کے کلمات نکالتا ہے تو وہ انہیں قبول نہیں فرماتا، بلکہ ڈھیل اور مہلت دیتا ہے کہ شاید توبہ کر کے اپنی اصلاح کر لیں اور اگر بد دُعا بھی جلدی قبول کر لے تو لوگ جلد ہی ہلاک ہو جائیں۔

فرمانِ نبوی ﷺ: رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اپنے آپ پر بد دعا نہ کرو اور اپنی اولاد پر بد دعا نہ کرو اور اپنے خادموں پر بد دعا نہ کرو اور اپنے مالوں پر بد دعا نہ کرو، ایسا نہ ہو کہ تم کسی ایسے وقت میں دعا کر بیٹھو جس میں (مانگی ہوئی چیز) دے دی جاتی ہے اور وہ تمہاری بد دعا قبول کر لے۔ مطلب یہ ہے کہ ایسا نہ ہو کہ وہ قبولیّت کی گھڑی ہو اور وہ بد دعا قبول ہو جائے۔ (ابو داؤد)

آیت نمبر ۱۲: ناشکرے بندوں کا اللہ ﷻ کے ساتھ احسان فراموشی کا بیان ہے کہ جب اُن کو مصیبت پہنچتی ہے تو چلتے پھرتے اُٹھتے بیٹھتے ہر وقت میں گڑگڑا کر اللہ ﷻ سے رحم کی التجا کرتے ہیں اور تکلیف دور ہونے پر اللہ ﷻ سے ایسے غافل ہو جاتے ہیں گویا کہ اس کو کبھی پکارا ہی نہیں تھا۔ حد سے گزرنے والوں کے بُرے اعمال ان کے لئے خوشنما بنا دیئے جاتے ہیں۔

علمی بات: دنیا کا نظام اس طرح بنا ہے کہ آدمی بار بار کسی نہ کسی تکلیف یا حادثہ کی زد میں آجاتا ہے اور جب اسے کوئی راہ سجھائی نہیں دیتی اور خلاصی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو اس وقت آدمی محسوس کرنے لگتا ہے کہ خارجی طاقتوں کے مقابلہ میں وہ آدمی بے بس ہو کر بے اختیار اللہ ﷻ کو پکارنے لگتا ہے۔ وہ اللہ ﷻ کی قدرت کے مقابلہ میں اپنی عاجزی کا اعتراف کر لیتا ہے۔ مگر یہ حالت صرف اس وقت تک رہتی ہے جب تک وہ مصیبتوں کی گرفت میں ہو، مصیبت سے نجات پاتے ہی وہ دوبارہ ویسا ہی غافل اور سرکش بن جاتا ہے۔ اُن لوگوں کی اس طرح اظہارِ بندگی اللہ ﷻ کے ہاں معتبر نہیں کیونکہ اللہ ﷻ کو وہ اظہارِ بندگی مطلوب ہے جو خوشی و راحت رنج و تکلیف ہر حالت میں کی جائے اور اپنی غرض کی بندگی کی تو اللہ ﷻ کے نزدیک کوئی قیمت اور اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

فرمانِ نبوی ﷺ: جسے پسند ہو کہ اللہ ﷻ سختیوں اور مصیبتوں میں اس کی دعا قبول فرمائے تو وہ خوش حالی میں کثرت سے دعا کیا کرے۔ (جامع ترمذی)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان جب بھی کسی پریشانی، بیماری، رنج و ملال، تکلیف اور غم میں مبتلا ہو جاتا ہے یہاں تک کہ اگر اسے کوئی کانٹا بھی چبھ جاتا ہے تو اللہ ﷻ اسے اس کے گناہوں کا کفارہ بنا دیتا ہے۔ (صحیح بخاری)

علمی بات: جو لوگ گناہ اور بُرے اعمال و افعال کرنا نہیں چھوڑتے۔ دراصل شیطان ایسے لوگوں کے دلوں میں ان کی اچھائی کا تصور بٹھا دیتا ہے۔ انسان ان سے بچنے کے بجائے ان کو انجام دینے میں لذّت محسوس کرتے ہیں اور مصیبت دور ہو جانے کے بعد پھر سے اپنے معبودان باطلہ کی عبادت و پکار کو وہ بہت اچھا کام خیال کرتے ہیں۔

آیت نمبر ۱۳: گزشتہ اقوام کو ان کی ظلم کی پاداش میں ہلاک کر دیا گیا۔ ان کے رسولوں نے واضح نشانیوں کے ساتھ انہیں توحیدِ باری تعالیٰ کی دعوت دی۔ ظلم پر ڈھٹائی کرنے والوں سے سے ایمان لانے کی توفیق سلب کر دی جاتی ہے۔ ان کے حالات بیان فرما کر موجودہ کفار کو ہلاکت سے خبر دار کیا گیا ہے۔

علمی بات: پیغمبر اپنی قوموں کے پاس دلائل کے ساتھ آئے مگر ان نافرمان قوموں نے نہیں مانا۔ لفظ بینات (دلائل اور نشانیوں) میں اللہ ﷻ کی توحید اور پیغمبروں کی صداقت پر ہر قسم کے دلائل اور معجزات وغیرہ آجاتے ہیں۔ مگر معجزہ اتمام حجت کے لئے آتا ہے جس کے بعد انکار کی صورت میں عذابِ الٰہی سے دوچار ہو کر ہلاکت مقدر بن جاتی ہے۔

علمی بات: اس آیت میں پچھلی آیت کے مضمون کی مزید توضیح اور تاکید اس طرح کی گئی ہے کہ کوئی اللہ ﷻ کے ڈھیل دینے سے یہ نہ سمجھے کہ دنیا میں عذاب آ ہی نہیں سکتا، پچھلی قوموں کی تاریخ اور ان کی سرکشی و نافرمانی اور رسولوں کی تکذیب کی پاداش میں مختلف قسم کے عذاب اسی دنیا میں آچکے ہیں، اس اُمّت میں اگرچہ اللہ ﷻ نے سید الانبیاء ﷺ کے اکرام اور دُعاؤں کی وجہ سے یہ وعدہ فرمالیا ہے کہ اس اُمّت پر عمومی عذاب نہ آئے گا اور اللہ ﷻ کے اس لطف و کرم پر شکر گذار ہونے کے بجائے لوگ ایسے بے باک ہو جاتے ہیں کہ وہ بڑی جرأت سے عذاب الٰہی کو دعوت دینے اور اس کا مطالبہ کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں، لیکن یاد رہے کہ عذاب الٰہی سے بے فکر ہو جانا بہت بڑی نا سمجھی ہے، کیونکہ پوری اُمّت اور پوری دنیا پر عمومی عذاب نہ بھیجنے کا وعدہ ضرور ہے مگر خاص خاص افراد اور قوموں پر عذاب آجانا اب بھی ممکن ہے۔

آیت نمبر ۱۴: "خلائف" خلیفہ کی جمع ہے جس کے معنی ہے گزشتہ اُمتوں کا جانشین یا پہلے کے بعد دوسرے کا جانشین بننا۔ پچھلی قوموں کی ہلاکت کے بعد موجودہ قوموں کو ان کا جانشین بنا کر زمین پر بھیجا گیا۔ جانشین بنانے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ موجودہ قوم کا امتحان لیا جائے کہ پچھلی قوم کے انجام سے عبرت حاصل کر کے اپنی اصلاح کرتی ہے یا سرکشی کا راستہ اختیار کرتی ہے۔

علمی بات: اس آیت میں مخاطب وہ مشرکین عرب ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں موجود تھے کہ گزشتہ اقوام کے بعد اللہ ﷻ نے انہیں زمین کا مکین بنایا، تاکہ انہیں بھی آزمائے کہ وہ لوگ اس کی اطاعت اور اس کے رسول ﷺ کی اتباع کرتے ہیں یا نہیں۔

فرمانِ نبوی ﷺ: "یقیناً دنیا میٹھی، مزے دار اور سبز ہے (جیسے تازہ میوہ) اور اللہ ﷻ اس میں تمہیں خلیفہ بنا کر دیکھ رہا ہے کہ تم کیسے اعمال سر انجام دیتے ہو، دنیا سے ہوشیار رہو اور عورتوں سے ہوشیار رہو، کیونکہ بنی اسرائیل میں سب سے پہلا فتنہ عورتوں ہی کا آیا تھا" (صحیح مسلم)

آیت نمبر ۱۵: سرداران قریش کی طرف سے قرآنِ حکیم میں تبدیلی کے مطالبہ کا بیان ہے۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے دو مطالبات کئے:

۱۔ اس قرآنِ حکیم کی جگہ دوسرا قرآنِ حکیم لے آئیں۔ (معاذ اللہ)

۲۔ اس قرآنِ حکیم کی جو چیزیں ان کے مرضی کے خلاف ہیں ان کو تبدیل کر دیا جائے۔ (معاذ اللہ)

ان کے دونوں مطالبات کی تردید کی گئی اور رسول اللہ ﷺ کی زبانی ان کو یہ جوابات دیے گئے کہ:

۱۔ رسول اللہ ﷺ اپنی طرف سے قرآنِ حکیم میں کسی کمی بیشی یا تبدیلی کا اختیار نہیں رکھتے۔

۲۔ رسول اللہ ﷺ وحی الٰہی کے پابند ہیں۔ ۳۔ رسول اللہ ﷺ اللہ ﷻ کی نافرمانی سے ڈرتے ہیں۔

شانِ نزول: مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ مشرکین مکہ میں سے پانچ آدمی عبداللہ بن امیہ المخزومی، ولید بن مغیرہ، مکرز بن حفص، عمرو بن عبید اللہ بن ابی قیس العامری اور عاص بن عامر بن ہشام نے حضور سرورِ دوعالم ﷺ سے یہ کہا تھا کہ اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہم آپ پر ایمان لے آئیں تو آپ اس قرآنِ حکیم کے علاوہ کوئی اور قرآنِ حکیم لے آئیں جس میں لات، عزّیٰ اور منات کی عبادت سے ممانعت نہ ہو اور نہ ان کی مذمت کی گئی ہو یا آپ ﷺ اس قرآنِ حکیم کو بدل ڈالیں اور عذاب کی آیتوں کی جگہ رحمت کی آیتیں اور حرام کی جگہ حلال اور حلال کی جگہ حرام لکھ دیں، اللہ ﷻ نے ارشاد فرمایا: اے محمد! آپ کہئے کہ اس قرآنِ حکیم کو بدلنا میرے اختیار میں نہیں ہے۔ میں صرف اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں جس کی مجھ پر وحی کی جاتی ہے، اس کے مطابق میں حکم دیتا ہوں یا کسی چیز سے منع کرتا ہوں۔

علمی بات: قرآنِ حکیم میں تبدیلی کے مطالبہ کی وجوہات: کفار مکّہ کا یہ مطالبہ کہ آپ کوئی اور قرآنِ حکیم لے آئیں یا اسی قرآنِ حکیم کو بدل ڈالیں تو ان کا یہ مطالبہ بطور استہزاء تھا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سنجیدگی کے ساتھ آپ علیہ السلام سے اس مطالبہ کی غرض یہ ہو کہ اگر آپ علیہ السلام نے ان کا یہ مطالبہ مان لیا تو آپ کا یہ دعویٰ باطل ہو جائے گا کہ یہ قرآنِ حکیم اللہ ﷻ کا کلام ہے اور اس کا نازل کیا ہوا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ قرآنِ حکیم کو آپ ﷺ کی تصنیف سمجھتے ہوں اور واقعی کوئی اور کتاب چاہتے ہوں کیونکہ قرآنِ حکیم میں ان کے معبودوں کی مذمت بیان کی گئی ہے اور اُن کی پرستش کو باطل قرار دیا گیا ہے، اس لئے وہ کوئی اور کتاب چاہتے تھے جس میں یہ سب چیزیں موجود نہ ہوں۔ بہر حال کفار کے ان تمام خیالات کی واضح تردید کر دی گئی۔

آیت نمبر ۱۶: رسول اللہ ﷺ اللہ ﷻ کی مشیت کے مطابق اللہ ﷻ کے احکام کی تعمیل فرماتے ہیں۔ رسالت کی صداقت کے ضمن میں آپ ﷺ کی چالیس سالہ پاکیزہ زندگی کو بطور دلیل پیش کیا گیا کہ جس نے تمام تر زندگی کبھی جھوٹ نہیں بولا تو نبوت جیسے بڑے مسئلے پر جھوٹ کا ارتکاب کیسے کر سکتا ہے۔

علمی بات: اس آیت میں کفار اور مشرکین کے اس خیال کا رد ہے کہ یہ قرآنِ حکیم نبی ﷺ کا کلام ہے کیونکہ مشرکین مکہ نے اول سے آخر تک نبی ﷺ کی زندگی کا مشاہدہ کیا تھا اور ان کو آپ علیہ السلام کے تمام احوال معلوم تھے، وہ یہ جانتے تھے کہ آپ علیہ السلام نے کسی کتاب کا مطالعہ نہیں کیا اور نہ کسی استاذ سے علم حاصل کیا پھر آپ علیہ السلام پر اسی طرح چالیس سال کا عرصہ گزر گیا، پھر چالیس سال بعد آپ علیہ السلام اچانک اس عظیم کتاب کو لے آئے جس میں اولین اور آخرین کی خبریں ہیں اور تہذیب اخلاق، تدبیر منزل اور ملکی سیاست کے متعلق مفصل احکام اور پیشن گوئیاں ہیں اور بہت دقیق علوم ہیں اور تمام علماء، فصحاء اور بلغاء اس کی نظیر لانے میں عاجز اور ناکام رہے تو ہر وہ شخص جس کے پاس عقل سلیم ہو تو اس پر یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جائے گی کہ ایسا معجزانہ کلام اللہ ﷻ کی وحی کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا، اس لئے فرمایا کہ میں بیشک اس (نزول قرآن) سے پہلے تم میں عمر کا ایک حصہ گزار چکا ہوں کیا تم نہیں سمجھے! اس آیت کی دوسری تقریر یہ ہے کہ اس نزول قرآن سے پہلے میں نے تم میں چالیس سال زندگی گزاری اور تم میرے صدق اور امانت اور میری پاکیزگی کو جان چکے ہو، میں پڑھتا تھا نہ لکھتا تھا پھر میں تمہارے پاس اس کلام کو بطورِ معجزہ لے کر آیا تو اب کیا تم یہ نہیں سمجھ سکتے کہ یہ کلام میرا نہیں ہو سکتا یہ صرف اور صرف وحی الٰہی ہے، پھر میں نے تم میں اپنے شباب کی پوری عمر گزاری ہے جس میں میں نے اللہ ﷻ کی کوئی نافرمانی نہیں کی تو اب تم مجھ سے یہ توقع رکھتے ہو کہ میں اللہ ﷻ کی نافرمانی کروں گا اور اس کے کلام کو بدل ڈالوں گا کیا تم اتنی سی بات نہیں سمجھتے!

آیت نمبر ۱۷: اللہ ﷻ پر جھوٹ باندھنے سے مراد کسی شخص کا کوئی بات گھڑ لینا اور اس کو اللہ ﷻ کی طرف منسوب کر دینا ہے۔ اللہ ﷻ پر جھوٹ باندھنے والے اور اللہ ﷻ کی آیات کو جھٹلانے والوں کو مجرم قرار دیا گیا۔ ایسے مجرموں کو کامیابی نصیب نہ ہو گی۔

علمی بات: اللہ ﷻ پر جھوٹ باندھنے سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص ایک بات تو خود گھڑے یا تصنیف کرے پھر اسے اللہ ﷻ کی طرف منسوب کر دے ایسا شخص بھی سب سے بڑھ کر ظالم ہے اور جب ہر نبی علیہ السلام اپنے قول میں سچا ہے تو نبی علیہ السلام اور اللہ ﷻ کی آیات کا منکر بھی ویسا ہی سب سے بڑھ کر ظالم ہو گا اور دونوں کے ظلم میں کوئی فرق نہیں۔

علمی بات: فلاح سے مراد کامیابی سے ہم کنار ہونا ہے لیکن نظریہ کی تبدیلی سے کامیابی کا معیار بھی بدل جاتا ہے مثلاً ایک دنیادار اور آخرت کے منکر کے نزدیک انتہائی کامیابی یہ ہے کہ اسے امن و چین اور عیش و عشرت سے زندگی بسر کرنا نصیب ہو اور لمبی عمر حاصل ہو جبکہ ایک دیندار اور آخرت پر یقین رکھنے والے کے نزدیک کامیابی کا معیار اللہ ﷻ کی رضا اور اُخروی عذاب سے نجات پانا ہے اگرچہ وہ بھی اللہ ﷻ سے فلاح دارین کا طالب ہوتا ہے۔ چنانچہ اس دنیا میں بھی اسے وہ کچھ نصیب ہوتا ہے جو اس کے مقدر میں ہوتا ہے لیکن وہ اس کو کامیابی کا معیار قرار نہیں دیتا اس آیت میں جس کامیابی کا ذکر ہے اس سے مراد اُخروی فلاح ہے یعنی اللہ ﷻ پر جھوٹ باندھنے یا اس کی آیات کو جھٹلانے والوں کو کبھی اخروی فلاح نصیب نہیں ہو گی۔

آیت نمبر ۱۸: مشرکین اللہ ﷻ کے سوا ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو کسی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتیں۔ مشرکین کا دعویٰ ہے کہ ان کے خود ساختہ معبود اللہ ﷻ کے مقربین ہیں جو اللہ ﷻ کی بارگاہ میں ان کی شفاعت کریں گے۔ ان کے اس باطل دعویٰ کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ ایسا کوئی سفارشی نہیں ہے جو کوئی بات اللہ ﷻ سے جبراً منوائے۔ اللہ ﷻ پاک اور بلند ہے اور اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔

علمی بات: اس آیت سے مشرکین مکہ کا بنیادی عقیدہ ظاہر ہو رہا ہے۔ وہ لوگ اس کو مانتے تھے کہ اس کائنات کا خالق اور مالک اللہ ﷻ ہے۔ وہ اپنے بتوں کو کائنات کا خالق و مالک نہیں بلکہ اللہ ﷻ کے قرب کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ ان کا یقین تھا کہ جن ہستیوں کے نام پر یہ بت بنائے گئے ہیں وہ ہستیاں اللہ ﷻ کے ہاں بہت مقرب اور محبوب ہونے کے باعث اس کے ہاں ہماری سفارش کریں گی، لہٰذا اس وجہ سے ان کی عبادت کرتے تھے جو کہ سراسر حرام ہے۔

علمی بات: یہی مضمون قرآنِ حکیم میں دیگر مقامات پر یوں بیان ہوا ہے آپ ﷺ فرما دیجئے کیا تم اللہ ﷻ کے سوا اس چیز کی عبادت کرتے ہو جو تمہارے لئے نہ کسی نقصان کی مالک ہے اور نہ نفع کی اور اللہ ﷻ ہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔ (سورۃ المائدۃ ۵، آیت: ۷۶) "یہ باطل معبود کسی کو کیا نفع و نقصان پہنچائیں گے، یہ تو خود اپنے آپ کو نقصان سے نہیں بچا سکتے، جیسا کہ ارشاد فرمایا اور انہوں نے اس کے سوا کئی اور معبود بنا لئے، جو کوئی چیز پیدا نہیں کرتے اور وہ خود پیدا کیئے جاتے ہیں اور اپنے لئے نہ کسی نقصان کے مالک ہیں اور نہ نفع کے اور نہ کسی موت کے مالک ہیں اور نہ زندگی کے اور نہ اٹھائے جانے کے"۔ (سورۃ الفرقان ۲۵، آیت: ۳)

آیت نمبر ۱۹: ابتدا میں پوری نوع انسانی کا توحید پر کاربند ہونے اور ایک اُمّت ہونے کا بیان ہے۔ بعد میں لوگوں نے خود مشرکانہ طور طریقے اور تصوّرات اختیار کر کے آپس میں اختلاف کیا۔ اللہ ﷻ کی طرف سے اصلاح کی مہلت دینے کی سنّت نہ ہوتی تو یقیناً اُمّتوں کے درمیان اختلافات کا فیصلہ کر دیا جاتا۔

علمی بات: مطلب یہ ہے کہ جب پہلے پہل حضرت آدم علیہ السلام دنیا میں تشریف لائے تو تمام انسان توحید اور دین برحق پر عمل پیرا تھے۔ بعد میں کچھ لوگوں نے الگ عقیدے اور طریقے ایجاد کر لیئے۔ اللہ ﷻ اُس وقت دنیا میں ان کے اختلافات کا فیصلہ کر سکتا تھا، لیکن چونکہ اللہ ﷻ نے کائنات کی تخلیق سے پہلے ہی یہ طے فرمایا ہوا تھا کہ دنیا انسانوں کے امتحان کے لئے پیدا کی جائے گی، اور تمام اقوام کی طرف اللہ ﷻ کی طرف سے پیغمبر بھیجے جائیں گے جو لوگوں کو دنیا میں آنے کا مقصد بتائیں، اور دین حق کو واضح دلائل سے بیان کر دیں، پھر وہ اپنی مرضی سے جو راستہ چاہیں اختیار کریں، اور آخرت میں فیصلہ کیا جائے کہ کس کا راستہ صحیح اور انعام کے قابل تھا، اور کس کا غلط اور قابل سزا تھا، اس لئے اللہ ﷻ نے دنیا میں اس فیصلے کا مشاہدہ نہیں کروایا۔

آیت نمبر ۲۰: معجزات طلب کرنے والے مشرکین کو رسول اللہ ﷺ کی زبانی جواب دیا گیا ہے۔ غیب کا علم صرف اللہ ﷻ کو ہے اور اسے علم ہے کہ کون سی نشانی کب ظاہر ہو گی۔ اللہ ﷻ کے حتمی فیصلہ کے لئے انہیں بھی انتظار کرنے اور خود رسول اللہ ﷺ کو بھی منتظر رہنے کی تلقین فرمائی گئی ہے۔

علمی بات: بعض مفسرین نے اس کا یہ مطلب بتایا ہے کہ مشرکین مکہ نے موجودہ معجزات کی قدر نہ کی اور ایمان نہ لائے بلکہ عناد اور ضد کی وجہ سے فرمائشی معجزات کے درپے ہو گئے۔ ان کا یہ کفر اور عناد نزول عذاب کا باعث ہے غیب کا علم اللہ ﷻ ہی کو ہے وہی جانتا ہے کہ کب ان پر عذاب آجائے لہٰذا انہیں متنبہ کیا گیا ہے کہ وہ انتظار کریں۔

علمی بات: اس آیت میں نشانی سے مراد معجزہ ہے یوں تو اللہ ﷻ نے آنحضرت ﷺ کو بہت سے معجزات عطا فرمائے تھے، اور آپ کے اُمّی ہونے کے باوجود قرآنِ حکیم کا آپ کی زبان مبارک پر جاری ہونا بذات خود بہت بڑا معجزہ تھا۔ لیکن کفار مکہ آپ سے نت نئے فرمائشی معجزات کا مطالبہ کرتے رہتے تھے جن کا کچھ بیان (سورۃ بنی اسرائیل ۱۷، آیت: ۹۳) میں ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ ﷻ کے پیغمبروں کا یہ کام نہیں ہوتا کہ وہ کافروں کے اس قسم کے ہر مطالبے کو پورا کریں اور ہر ایک کی فرمائش پر ہر روز نئے معجزات دکھایا کریں، بالخصوص، جب یہ بات معلوم ہو کہ مطالبہ کرنے والے محض وقت گذاری اور بہانہ بازی کے لئے ایسی فرمائشیں کر رہے ہیں۔ اس لئے آنحضرت ﷺ کو مختصر جواب دینے کی ہدایت فرمائی گئی ہے کہ غیب کی ساری باتیں، جن میں معجزات کا ظاہر کرنا بھی داخل ہے، میرے اختیار میں نہیں، صرف اللہ ﷻ کے اختیار میں ہے، وہ تمہاری کونسی فرمائش پوری کرتا ہے اور کونسی پوری نہیں کرتا، اس کا تم بھی انتظار کرو اور میں بھی انتظار کرتا ہوں۔

آیت نمبر ۲۱: راحت اور تکلیف میں لوگ اپنی اصل حیثیت کو برقرار نہیں رکھتے۔ تکالیف و مصائب کے بعد نعمت کا مطلب تنگی قحط سالی اور بیماری کے بعد رزق کی فراوانی، صحت و عافیت اور خوشحالی وغیرہ ہے۔ اللہ ﷻ تکالیف کے بعد جب راحت بھیجتا ہے تو ناشکرا انسان احسان فراموشی کرتا ہے۔ مشرکین مکہ کی اس روش کی طرف اشارہ ہے جو غیر اللہ کی طرف راحت کو منسوب کرتے تھے۔ ان کی احسان فراموشی کے نتیجہ میں اللہ ﷻ ان کا مواخذہ کرنے پر قادر ہے۔

علمی بات: اہل مکہ پر حق تعالیٰ نے سات سال تک قحط مسلط کیا۔ جب ہلاکت کے قریب پہنچ گئے تو گھبرا کر حضور ﷺ سے دعا کی درخواست کی اور وعدہ کیا کہ یہ عذاب اٹھ جائے تو ہم ایمان لے آئیں گے آپ ﷺ نے دعا فرمائی اللہ ﷻ نے دعا قبول فرمالی اور اہل مکہ پر رحم فرمایا۔ قحط کی بلاء دور ہوئی تو پھر وہی شرارتیں کرنے

لگے، اللہ ﷻ کی آیتوں کو جھٹلاتے اور اس کی قدرت و رحمت پر توجہ نہ کرتے۔ بلکہ انعامات الٰہیہ کو ظاہری اسباب اور بے اصل خیالات و اوہام کی طرف منسوب کرنے لگتے۔ ان کی اس طرح کی باتوں کا جواب دیا کہ اچھا تم خوب مکر و فریب اور حیلہ سازی کر لو۔ مگر یہ یاد رہے کہ تمہاری حیلہ بازیاں ایک ایک کر کے لکھی جا رہی ہیں۔ وہ سارا دفتر قیامت کے دن تمہارے سامنے رکھ دیا جائے گا۔ پھر جب تمہاری کوئی حیلہ بازی فرشتوں سے مخفی نہیں، اللہ ﷻ کے علم محیط سے کہاں باہر رہ سکتی ہے۔ تم اپنے مکر و فریب اور حیلہ سازی پر مغرور ہو، حالانکہ اللہ ﷻ کی تدبیر تمہارے مکر و فریب سے کہیں تیز اور جلد اثر کرنے والی ہے اور وہ مجرم کی باگ اتنی ڈھیلی چھوڑ دیتا ہے کہ گناہ کرتے وقت اس کے دل میں سزا کا تصور بھی نہیں آتا۔ جب اس کی سرکشی اور نافرمانی حد سے بڑھ جاتی ہے تو دفعتاً پکڑ میں آجاتا ہے۔ لہٰذا عقلمند شخص کو چاہیئے کہ اللہ ﷻ کی طرف سے نرمی، بُردباری اور خوش کن حالات کو دیکھ کر دھوکہ میں نہ پڑے، نہ معلوم اس نرمی کے بعد کیسی سختی آنے والی ہے۔

آیت نمبر ۲۲: خشکی میں چلانے سے مراد یہ ہے کہ اللہ ﷻ نے خشکی میں سواریاں مہیا کیں۔ سمندر میں چلانے سے مراد کشتیاں اور جہاز بنانے کی سمجھ کا عطا کیا جانا ہے۔ توحید فطرت انسانی میں موجود ہے۔ مشرکین سمندر میں ہواؤں اور موجوں کے درمیان گھر جانے کی صورت میں خالصتاً اللہ ﷻ ہی کو پکارتے تھے۔

علمی بات: زمانہ نزول قرآن میں بادبانی کشتیاں ہوتی تھیں۔ ہوا موافق ہوئی تو کشتیاں چلنے لگیں۔ ہوا بند ہو گئی تو کھڑی ہو گئیں، ہوا موافق خوشگوار ہے تو خوش ہو رہے ہیں اور اگر تیز ہوا چلنے لگی اور ہر طرف سے موجیں اٹھ اٹھ کر آنے لگیں تو ڈرنے لگے اور یقین کر لیا کہ اب تو گھیرے میں آگئے اس وقت مدد اور پکار کے لئے اللہ ﷻ کے سوا کسی پر نظر نہیں جاتی جو ان کو اس مصیبت سے بچائے اور بھنور سے نجات دے لہٰذا اللہ ﷻ کے حضور میں خالص اعتقاد کے ساتھ دعا کرنے لگتے کہ اے اللہ اگر تو نے ہمیں اس مصیبت سے نجات دے دی تو ضرور ہم تیرے شکر گزار بندوں میں ہوں گے۔ جب اللہ ﷻ مصیبت سے نجات دے دیتا تو پھر وہی اللہ ﷻ کی زمین میں بغاوت، شرارت اور سرکشی کرنے لگتے جس کا انہیں کوئی حق نہیں تھا۔

آیت نمبر ۲۳: باحفاظت خشکی پر آجانے کے بعد مشرکین کا اللہ ﷻ سے بدعہدی اور بغاوت کا بیان ہے۔ ان کی بغاوت کا نقصان خود انہیں کو ہو گا۔ آخر کار انہیں اللہ ﷻ کے پاس حاضر ہونا ہے جہاں انہیں ان کے اعمال کا حساب دینا ہو گا۔

عملی پہلو: یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ انسان پر جب مشکلات آتی ہیں تو اس کے دل سے ایک ہی آواز نکلتی ہے کہ اے اللہ! میری اس مشکل کو آسان فرمادے۔ اور اللہ ﷻ اس کی مشکلات آسان بھی فرما دیتا ہے لیکن پھر وہ بھول جاتا ہے کہ اس کی ان مشکلات کو حل کرنے والی کون سی ذات تھی۔ اللہ ﷻ ہمیں شکر ادا کرتے رہنے، مداومت اور بندگی کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

علمی بات: فتح مکہ کے بعد ابو جہل کا بیٹا عکرمہ مسلمان نہ ہوا تھا۔ مکہ سے بھاگ کر بحری سفر اختیار کیا۔ تھوڑی دور جا کر کشتی کو طوفانی ہواؤں نے گھیر لیا، ملاّح نے مسافروں سے کہا کہ ایک اللہ ﷻ کو پکارو۔ یہاں تمہارے معبود کچھ کام نہ دیں گے۔ عکرمہ نے کہا کہ یہ ہی تو وہ اللہ ﷻ ہے جس کی طرف محمد ﷺ ہم کو بلاتے ہیں۔ اگر دریا میں ربّ محمد ﷺ کے بغیر نجات نہیں مل سکتی تو خشکی میں بھی اس کی دستگیری اور اعانت کے بغیر نجات پانا محال ہے۔ اے اللہ ﷻ! اگر تو نے اس مصیبت سے نکال دیا تو میں واپس ہو کر محمد (ﷺ) کے ہاتھ میں ہاتھ دوں گا۔ مجھے امید ہے کہ وہ اپنے اخلاق کریمہ سے میری غلطیوں کو معاف فرمائیں گے۔ چنانچہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف با اسلام ہوئے۔

آیت نمبر ۲۴: اس آیت میں دنیا کی زندگی اور اس کی حقیقت کا بیان ہے۔ دنیا کی زندگی کو کھیتی سے تشبیہ دے کر اس کے فانی اور ناپائیداری کو واضح کیا گیا ہے۔ کھیتی بارش کے پانی سے سرسبز و شاداب ہو جاتی ہے اور کھیتی والے اپنی ضرورتیں پوری ہونے پر خوش ہوتے ہیں۔ اچانک دن یا رات میں اس پر اللہ ﷻ کی طرف سے کوئی آفت آجاتی ہے جس سے وہ تباہ ہو جاتی ہے گویا کہ وہ تھی ہی نہیں۔ جس طرح کھیتی پر بہار آتی ہے انسانوں پر بھی جوانی آتی ہے پھر اچانک کسی آفت یا مصیبت کا شکار ہو کر موت کی آغوش میں سو جاتے ہیں۔ موت کے سبب انسان اس ناپائیدار دنیا سے کوچ کر کے آخرت کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔

علمی بات: اس سے پہلے اللہ ﷻ نے فرمایا کہ اے لوگو! تمہاری سرکشی اور بغاوت صرف تمہارے لئے ہی مضر ہے، اب اللہ ﷻ نے اس شخص کے متعلق ایک عجیب مثال بیان فرمائی ہے جو دنیا کی لذتوں اور خواہشات میں منہمک ہو کر آخرت کو بھلا دیتا ہے۔ آسمان سے جو پانی نازل ہوتا ہے اس کی وجہ سے زمین کی پیداوار خوب گھنی ہو جاتی ہے اور بارش کی وجہ سے رنگ برنگ کے پھول، خوشنما بیلیں، خوش ذائقہ پھل اور طرح طرح کے غلّوں کی اجناس پیدا ہوتی ہیں، حتی کہ باغوں اور کھیتوں کا مالک جب ان ہری بھری لہلہاتی ہوئی فصلوں اور پھلوں سے لدے ہوئے درختوں کو دیکھتا ہے تو خوشی سے پھولا نہیں سماتا، پھر وہ بڑے عمدہ منصوبہ بناتا

ہے کہ ان باغوں اور کھیتوں سے اتنے منافع اور فوائد حاصل کرے گا، پھر اچانک ٹِڈی دل یعنی فصلوں کو کھانے والے کیڑے مکوڑے کثیر تعداد میں آکر تمام کھیتوں اور باغوں کو چاٹ کر چلے جاتے ہیں، یا آسمان سے زبردست آندھی اور برف باری ہوتی ہے اور سب کچھ اجڑ جاتا ہے یا دریاؤں میں سیلاب آتا ہے اور تمام فصلوں کو بہا کر لے جاتا ہے، اور وہ غم اور افسوس میں ہاتھ ملتا ہوا رہ جاتا ہے، اسی طرح جو آدمی آخرت سے اعراض کر کے دنیا کمانے کی دھن میں لگا رہتا ہے، جب وہ آخرت میں اجر و ثواب سے محروم اور عذاب میں گرفتار ہو گا تو اس کا بھی یہی حال ہو گا۔

آیت نمبر ۲۵: سلامتی کے گھر سے مراد جنت ہے۔ آخرت ہی کی دائمی و ابدی زندگی کے طلب گار بننے کی تلقین کی گئی ہے۔ ہدایت دینا اللہ ﷻ ہی کے اختیار میں ہے۔

علمی بات: جنت کو دارالسّلام کہنے کی وجوہات جنت کو دارالسّلام کہنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ جنت کے سات نام ہیں اور ان میں سے ایک نام دارالسّلام ہے، وہ سات نام یہ ہیں: (۱) دارالسّلام (۲) دارالجلال (۳) جنت عدن (۴) جنت الماوی (۵) جنت الخلد (۶) جنت الفردوس (۷) جنت النعیم۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اہل جنت ہر ناپسندیدہ چیز سے سلامت اور محفوظ ہوں گے۔

علمی بات: جنت، میں ہر قسم کے رنج و بلا اور نقصان سے سلامتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو جنت کی طرف بلایا تھا۔ آپ کا بلانا اللہ ﷻ کا بلانا ہے اس لئے اللہ ﷻ نے فرمایا: اور اللہ ﷻ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے۔ حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہر روز جب سورج طلوع ہوتا ہے تو اس کی دونوں جانب دو فرشتے ندا کر رہے ہوتے ہیں۔: اے لوگو! اپنے رب کی طرف آؤ! بیشک جو چیز تھوڑی اور کافی ہو وہ اس سے بہتر ہے جو زیادہ ہو اور غافل کرنے والی ہو اور اس ندا کو جن اور انسانوں کے سوا تمام مخلوق سنتی ہے، اور اس کی تائید میں اللہ ﷻ نے قرآنِ حکیم میں یہ آیت نازل فرمائی: اور اللہ ﷻ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے اور جس کو چاہتا ہے سیدھے راستے کی طرف ہدایت دیتا ہے۔ (مسند احمد)

آیت نمبر ۲۶: اللہ ﷻ اور اُس کے رسول ﷺ کی اطاعت پر کاربند رہنے والوں کے لئے خیر اور بھلائی کی بشارت ہے۔ حدیث کے مطابق "مزید" سے مراد اہلِ جنت کو تمام نعمتوں سے نوازنے کے بعد دیدار الٰہی کا میسر آنا ہے۔ وہ ہر قسم کی ذلت اور رسوائی سے محفوظ ہوں گے اور ہمیشہ جنت میں رہیں گے۔

علمی بات: "زِیَادَۃٌ" سے مراد اللہ ﷻ کا دیدار ہے۔ یہی مفہوم (سورۃ نساء ۴، آیت: ۱۷۳)، (سورۃ النور ۲۴، آیت: ۳۸) اور (سورۃ ق ۵۰، آیت: ۳۵) میں بیان ہوا ہے۔ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی اور فرمایا: جب جنتی جنت میں اور جہنمی جہنم میں چلے جائیں گے تو اس وقت ایک منادی پکارے گا: "اے جنت والو! اللہ ﷻ نے تم سے ایک وعدہ کیا تھا، وہ چاہتا ہے کہ اسے بھی پورا کر دیا جائے۔" وہ کہیں گے: "وہ کون سا وعدہ ہے؟ کیا اس نے ہمارے میزان (نیک اعمال کے تول) بھاری نہیں کر دیے؟ کیا اس نے ہمارے چہرے روشن نہیں کر دیے، ہمیں جنت میں داخل اور آگ سے محفوظ نہیں کر دیا؟" آپ ﷺ نے فرمایا "اس وقت ان کے لئے پردہ ہٹا دیا جائے گا اور وہ اپنے پروردگار کا دیدار کریں گے۔" پھر فرمایا: "اللہ ﷻ کی قسم! انہیں اب تک ایسی کوئی نعمت عطا نہیں ہوئی ہو گی جو انہیں اس دیدار سے زیادہ محبوب ہو اور اس میں ان کی آنکھوں کے لئے اس سے زیادہ ٹھنڈک ہو۔" (مسند احمد، صحیح مسلم)

آیت نمبر ۲۷: اس آیت میں نیکو کاروں کے برعکس اللہ ﷻ کی نافرمانی کرنے والوں کا بیان ہے۔ "سیئات" سے مراد کفر، شرک اور اس کے ساتھ دیگر بُرائیاں ہیں۔ ان کی بُرائیوں کی سزا ان کی بُرائی کے برابر ہی ملے گی۔ ان کے چہرے ذلت و رسوائی کی وجہ سے اندھیری رات کی طرح سیاہ ہوں گے۔ انہیں ہمیشہ کے لئے جہنم کی وعید سنائی گئی ہے۔

علمی بات: روزِ قیامت کفار کی بدصورتی کا یہ حال ہو گا کہ گویا ان کے چہروں کو اندھیری رات کے ٹکڑوں سے ڈھانک دیا گیا ہے کافر دنیا میں کتنا ہی خوبصورت ہو قیامت کے دن نہایت ہی بدترین صورت میں ہو گا (سورۃ زمر ۳۹، آیت: ۶۰) میں فرمایا اور اے مخاطب تو قیامت کے دن ان لوگوں کو دیکھے گا جنہوں نے اللہ ﷻ پر جھوٹ باندھا کہ ان کے چہرے سیاہ ہیں کیا دوزخ تکبر کرنے والوں کا ٹھکانہ نہیں ہے۔ (سورۃ عبس ۸۰، آیات: ۴۲، ۴۱، ۴۰) میں فرمایا "اور اس دن بہت سے چہرے ایسے ہوں گے کہ ان پر بدرونقی ہو گی ان پر بدصورتی چھائی ہوئی ہو گی۔ وہ لوگ کافر اور فاجر ہوں گے"۔

آیت نمبر ۲۸: اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ میدان حشر میں تمام لوگوں کو جمع کیا جائے گا۔ مشرکین اور ان کے شرکاء بھی پیش ہوں گے۔ شرکاء میں وہ تمام اشیاء شامل ہیں جن کی دنیا میں پوجا کی جاتی تھی مثلاً بت، جنات، انسان وغیرہ اور یہ شرکاء مشرکین کی عبادت کا رد کریں گے۔

علمی بات: اس وقت وہ تمام شرکاء جن کو اللہ ﷻ کا شریک بنایا گیا تھا مشرکین سے کہیں گے کہ انہوں نے ہماری عبادت تو نہیں کی تھی ہم تو اُن کی پرستش سے بالکل غافل تھے ہم تک تو اُن کی کوئی التجا، شے، عبادت وغیرہ نہیں پہنچ رہی تھی۔ اسی لاتعلقی اور بے زاری کا ذکر سورۃ بقرہ ۲، آیت: ۱۶۶ میں بھی آیا ہے۔ منکرین توحید باری تعالیٰ کو تنبیہ کی جارہی ہے کہ آج معبود برحق کی عبادت چھوڑ کر جن مٹی، پتھر اور لوہے کے بتوں اور دیگر جھوٹے معبودوں کی وہ یہ سمجھ کر پرستش کرتے ہیں کہ وہ روزِ قیامت ان کی شفاعت کریں گے۔ تو وہ اچھی طرح جان لیں کہ یہ اس وقت اُن سے اپنی لاتعلقی اور بے زاری کا اظہار کریں گے۔

آیت نمبر ۲۹: اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ شرکاء اپنی بات کی صداقت کے لئے اللہ ﷻ کی گواہی کا ذکر کریں گے۔ وہ اپنے پوجنے والوں کی عبادت سے لاعلمی اور برأت کا اظہار کریں گے۔

علمی بات: باطل معبود انکار کی وجہ بیان کریں گے کہ اگر وہ ہماری پوجا کرتے بھی رہے ہیں تو ہمیں بالکل اس کی خبر نہیں، اس لئے ہم پر اس کا کچھ الزام نہیں۔ ہم اُن کے اس گھناؤنے فعل سے بالکل بری ہیں۔ اور ہم جھوٹ بول رہے ہوں تو ہمارے درمیان اللہ ﷻ گواہ ہے اور وہ کافی ہے، اس کی گواہی کے بعد کسی اور ثبوت اور گواہی کی ضرورت ہی نہیں رہ جاتی۔

آیت نمبر ۳۰: روز قیامت ہر شخص کی کارکردگی اس کے سامنے ہوگی جسے وہ دیکھ لے گا۔ تمام لوگ معبود برحق اللہ ﷻ کے پاس پہنچادیئے جائیں گے۔ مشرکین جن کو دنیا میں اپنا مددگار اور سفارشی سمجھا کرتے تھے وہ سب غائب ہو جائیں گے۔

علمی بات: اس آیت کے دو معنی ہیں: ایک یہ ہے کہ ہر شخص اپنے عمل کے نتیجہ کی پیروی کرے گا، اگر اس کے نیک اعمال تھے تو وہ جنت کی طرف جائے گا اور اگر اس کے بُرے اعمال تھے تو دوزخ کی طرف جائے گا، دوسرا معنی یہ ہے کہ ہر شخص اپنے اعمال نامے کو پڑھے گا اور اس کے مطابق اپنی جزا اور سزا کو جان لے گا۔ تمام مشرکین اس دن اللہ ﷻ کی طرف رجوع کریں گے جو ان کا مالک حقیقی ہے اور دنیا میں وہ اللہ ﷻ کو چھوڑ کر جن چیزوں کی عبادت کرتے تھے ان کا جھوٹ اور باطل ہونا ان پر منکشف ہو جائے گا۔

آیت نمبر ۳۱: مشرکین کو اعتراف حق کے لئے سوالیہ انداز میں پیش کئے جانے والے دلائل کا ذکر ہے۔

۱۔ کون آسمان وزمین سے انسان کے لئے رزق پیدا فرماتا ہے؟ ۲۔ انسان کی سماعت وبصارت کی قوتیں کس کے اختیار میں ہیں؟

۳۔ کون زندہ کو مردہ اور مردہ کو زندہ کر سکتا ہے؟ ۴۔ کائنات کے تمام معاملات کی تدبیر کون کرتا ہے؟

مشرکین بھی اللہ ﷻ ہی کی ربوبیت کا اعتراف کرتے تھے۔ سچائی کو جاننے کے بعد باوجود شرک پر اڑے رہنے پر انہیں عذاب کی تنبیہ کی گئی ہے۔

علمی و عملی بات: انسان دنیوی جھگڑوں میں کچھ ایسا پھنس گیا ہے کہ اسے بھول کر بھی یہ خیال نہیں آتا کہ اس کے معبود نے اس پر کیا کیا احسانات فرمائے ہیں۔ اگر وہ اس پر غور کرے کہ آسمان سے پانی نہ برسے اور زمین غلہ نہ اگائے تو وہ کیا شے کھا کر زندہ رہ سکتا ہے؟ ناشکرا بندہ اس کا دیا ہوا رزق کھائے چلا جاتا ہے مگر کبھی شکریہ کی دو کلمات تک زبان پر نہیں لاتا۔ غور کریں اگر وہ کسی کو بہرا اور اندھا بنادے تو اس کی زندگی کا لطف خاک میں مل جائے گا یا نہیں۔ لیکن کتنے لوگ ہیں جو ان نعمتوں پر اس کے شکر گزار ہیں؟ لوگ اس پر بھی غور نہیں کرتے کہ اس نے نطفہ کے ایک حقیر قطرہ سے رحم مادر میں ایک خوبصورت بچہ پیدا فرما کر بطن مادر سے اسے راہ سُجھائی اور پھر اُسے کچھ دن زندہ رکھنے کے بعد موت دیدی۔ یہ سب کام کیا اللہ ﷻ کے سوا کوئی اور کر رہا ہے؟ اگر اللہ ﷻ ہی کر رہا ہے تو لوگ اس سے ڈرتے کیوں نہیں اس کی نافرمانی کیوں کرتے ہیں؟

آیت نمبر ۳۲: اللہ ﷻ ہی حقیقی رب ہے۔ اس کے علاوہ دوسروں کو معبود بنانا اور انہیں پکارنا گمراہی ہے۔

علمی و عملی بات: کفار ومشرکین کو یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ تمہارے رزق، موت وحیات، تمہارے جسم کا خالق ومالک اور پوری کائنات کا منتظم اور مدبّر صرف اللہ ﷻ ہے اور تم بھی اللہ ﷻ ہی کو مانتے ہو تو جان لو کہ پھر تمہارا سچا اور برحق رب تو اللہ ﷻ ہی ہے۔ اب خواہ کوئی بھی چیز ہو وہ یا تو حق ہوگی یا باطل، یہ صحیح نہیں ہے کہ ایک شے حق بھی ہو باطل بھی، تو جب اللہ ﷻ کا رب اور مالک ہونا حق ہے تو پھر دوسرے باطل معبود کیسے حق ہو سکتے ہیں۔ اس کے باوجود تمہارا دل کیسے مانتا ہے کہ حق کو چھوڑ کر گمراہی اور توحید کو چھوڑ کر شرک کی راہ اختیار کرتے ہو۔ سوچو! راہ حق سے کیسے چھوڑے جارہے ہو؟

آیت نمبر ۳۳: تعصب اور ہٹ دھرمی سے کام لینے والوں کے متعلق اللہ ﷻ نے فیصلہ فرمادیا ہے۔ صحیح راستہ اختیار نہ کرنے پر وہ ہدایت اور ایمان سے محروم رہیں گے۔

علمی بات: یعنی جس طرح یہ مشرکین تمام تر اعتراف کے باوجود اپنے شرک پر قائم ہیں اور اسے چھوڑنے کے لئے تیار نہیں، اسی طرح آپ کے رب کی یہ بات ثابت ہوگئی کہ یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ غلط راستہ چھوڑ کر صحیح راستہ اختیار کرنے کے لئے تیار ہی نہیں ہیں، تو توحید اور ایمان کی دولت انہیں کس طرح نصیب ہوسکتی ہے؟ ارشاد فرمایا: (اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْھِمْ ءَاَنْذَرْتَھُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْھُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ) [البقرۃ:۶] "بیشک جن لوگوں نے کفر کیا ان پر برابر ہے، خواہ تو نے انہیں ڈرایا ہو یا انہیں نہ ڈرایا ہو، ایمان نہیں لائیں گے۔" یہ وہی بات ہے جسے دوسرے مقام پر اس طرح بیان فرمایا گیا ہے (وَلٰکِنْ حَقَّتْ کَلِمَۃُ الْعَذَابِ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ) (سورۃ الزمر ۳۹، آیت:۷۱) لیکن عذاب کی بات کافروں پر ثابت ہوگئی۔

آیت نمبر ۳۴: جھوٹے معبودوں کے رد میں مشرکین کو دو باتوں پر مطلع کیا جارہا ہے:

۱۔ جو ہستی پہلی بار پیدا کرسکتی ہے وہ دوسری بار بھی پیدا کرنے پر قادر ہے۔

۲۔ پہلی بار کی تخلیق میں جب ان کے معبودوں کا کوئی حصہ نہیں تو دوبارہ تخلیق میں بھی وہ شریک نہیں ہیں۔

علمی بات: مشرکین سے باطل خداؤں کے بارے میں براہ راست پوچھا جارہا ہے کہ تمہارے معبودانِ باطل میں سے کون ہے جس نے ابتدا میں اس کائنات کو پیدا کیا اور پھر اسے دوبارہ وجود بخشے گا؟ ظاہر ہے اس کا جواب نفی میں تھا اور ہمیشہ اس کا جواب نفی میں ہی رہے گا۔ لہٰذا نبی اکرم ﷺ کو حکم ہوا کہ آپ بے دھڑک فرمائیں کہ اللہ ﷻ ہی نے انہیں پہلی مرتبہ بغیر نمونے کے پیدا فرمایا اور وہی دوبارہ انہیں پیدا کرے گا۔ جب اللہ ﷻ کو ان کا خالق اور دوبارہ پیدا کرنے والا مانتے ہو تو پھر کہاں بھٹکے پھرتے ہو؟ جب پیدا کرنے والا اور تمہیں اپنے ہاں لوٹانے والا بھی ایک اللہ ﷻ ہی ہے۔ پھر تمہارے باطل معبود کہاں سے درمیان میں آگئے اور ان کا کیا اختیار ہے؟

آیت نمبر ۳۵: مشرکین سے ہدایت کے ضمن میں سوال کیا جارہا ہے کہ کون حق کے راستہ کی ہدایت دیتا ہے؟ دعوت الی الحق سے مراد زندگی گزارنے کا ایسا طریقہ جس میں معاشرے کے ہر فرد پر فرائض و حقوق کی پوری طرح رعایت ملحوظ رکھی گئی ہو۔ لہٰذا حق کی طرف رہنمائی کرنے والا ہی اتباع کا حقدار ہے نہ کہ وہ جو خود ہدایت کا محتاج ہو۔

علمی بات: مشرکین کو مخاطب کرکے مزید یہ سوال کیا گیا ہے کہ ان کے معبودوں میں کوئی ہے جو ان کی حق کی طرف راہنمائی کرسکے۔ یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ پتھر، مٹی اور لکڑی کے بت ہدایت و رہنمائی نہیں کرسکتے۔ اور نہ ہی جنات اور سورج، چاند، ستارے از خود ہدایت کا راستہ دکھا سکتے ہیں بلکہ یہ سب خود محتاج ہدایت ہیں۔ لہٰذا صرف اللہ ﷻ ہی ہے جو ہدایت کی رہنمائی کرتا ہے اور اس پر چلنے کی توفیق عطا فرماتا ہے۔ لہٰذا وہ سوچ بچار کریں کہ جو سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرے اس کی اتباع کرنا اور حکم ماننا چاہیئے یا اس کی اتباع کرنی چاہیئے جو کسی کی رہنمائی کرنے کی بجائے خود رہنمائی کا محتاج ہو۔ نیز یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ پیروی تو اس کی کرنی چاہیئے جو راہ حق کی رہنمائی کرتا ہے اور خود ہدایت والا ہے۔ درحقیقت مشرکین محض فرسودہ خیالات، سنی سنائی باتوں اور اپنے وہم و گمان کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ لیکن یاد رکھیں کہ اللہ ﷻ جانتا ہے جو کچھ وہ کررہے ہیں۔

آیت نمبر ۳۶: مشرکین کی اکثریت حق کے بجائے محض اپنے گمانوں کی پیروی کرتی ہے۔ بلاشبہ گمان، حق کا نعم البدل نہیں ہوسکتا۔ شرک کے لئے کوئی دلیل ہی نہیں۔ اللہ ﷻ کے علم میں ہے کہ کون حق پر ہے اور کون محض گمان کی پیروی کررہا ہے۔

عملی پہلو: یہاں نافرمان اور سرکش لوگوں کو سرزنش کی جارہی ہے کہ یہ مت سمجھیں کہ ان کی کارستانیوں کی کسی کو خبر نہیں۔ اور وہ جو کچھ کرتے ہیں اس پر کوئی محاسبہ نہ ہوگا۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ اللہ ﷻ ان کے کاموں سے خوب واقف ہے۔

آیت نمبر ۳۷: قرآنِ حکیم کسی کا گھڑا ہوا نہیں بلکہ اس ذات کا نازل کردہ ہے جس نے پچھلی آسمانی کتابیں نازل فرمائیں۔ اس میں تمام مطلوبہ احکام کی تفصیل موجود ہے۔ اس کی تعلیمات اور بیان کردہ واقعات میں کوئی شک نہیں۔

علمی بات: ان آیات میں قرآنِ حکیم کے اعجاز کا بیان ہے کہ اس کی فصاحت وبلاغت اور مختصر الفاظ کے کثیر معانی ہیں اور اس کی حلاوت اور شیرینی اس درجہ کی ہے کہ مخلوق میں سے کوئی اس پر قادر نہیں کہ وہ اس کی ایک سورت کی مثل بنا سکے یا کم از کم ایک آیت ہی بنا کر پیش کر دے۔

گزشتہ آیت میں گمان کی پیروی سے ممانعت کے بعد اب اس چیز کا بیان ہے جس کی پیروی کرنا فرض ہے مشرکین قرآنِ حکیم کو اللہ ﷻ کا کلام نہیں سمجھتے تھے۔ نبی کریم ﷺ کے بارے میں اُن کا گمان تھا کہ یہ قرآنِ حکیم وہ اپنی طرف سے بناتے ہیں اسی لئے انہوں نے نبی ﷺ سے درخواست کی آپ اس کے علاوہ کوئی دوسرا قرآنِ حکیم بنالائیے یا اس کو بدل دیجئے آپ علیہ السلام نے ان کو جواب دیا کہ میں اس کو نہیں بدل سکتا، یہ میرا یا کسی اور بشر کا کلام نہیں کہ میں اس کو بدل دوں یہ تو اللہ ﷻ کا کلام ہے کسی بندے کی مجال نہیں کہ وہ اس میں کمی بیشی کرے یا اپنی طرف سے کوئی کلام بنا کر اس کو اللہ ﷻ کی طرف منسوب کر دے۔ حقیقت میں یہ اللہ ﷻ کی طرف سے خاص وحی ہے۔ یہ قرآنِ حکیم ان آسمانی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے جو اس سے پہلے نازل ہو چکی ہیں جیسے تورات، زبور اور انجیل۔ اس میں ایسے احکام کی تفصیل بیان کی گئی ہے جو اللہ ﷻ نے اپنے بندوں کے لئے فرض کیے ہیں اور یہ گزشتہ انبیاء علیہم السلام کے واقعات کو صحیح صحیح بیان کرتا ہے۔

علمی بات: گزشتہ آیتوں میں اللہ ﷻ نے توحید کے دلائل بیان فرمائے تھے اور شرک کا باطل ہونا ظاہر فرمایا تھا اور ان آیتوں میں اللہ ﷻ نے سیدنا محمد مصطفی ﷺ کی نبوت کے دلائل بیان فرمائے ہیں اور آپ علیہ السلام کی نبوت پر مشرکین کے جو شبہات تھے ان کا ازالہ فرمایا ہے۔ ان کا ایک شبہ یہ تھا، کہ اس قرآنِ حکیم کو نبی کریم ﷺ نے از خود لکھ کر اللہ ﷻ کی طرف منسوب کر دیا ہے (معاذ اللہ)۔ اللہ ﷻ نے اس شبہ کا اس طرح ازالہ فرمایا، کہ یہ قرآنِ حکیم ایسی چیز نہیں ہے، کہ اللہ ﷻ کی وحی کے بغیر اس کو گڑھ لیا جائے۔

آیت نمبر ۳۸: مشرکین کو قرآنِ حکیم کے مقابلے میں اس جیسی ایک سورت بنا کر پیش کرنے کا چیلنج کیا گیا ہے۔ اور وہ اس میں اللہ ﷻ کے سوا تمام مددگاروں کو بھی اپنے ساتھ بلا لیں اور سب مل کر اس چیلنج کو قبول کریں۔

علمی بات: اللہ ﷻ کی توحید کے بیان اور شرک کی تردید کرنے کے بعد قرآنِ حکیم کی حقانیت کا بیان فرمایا گیا ہے کہ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ قرآنِ حکیم اللہ ﷻ کے سوا کوئی اور اپنے پاس سے بنالائے۔ اگر یقین نہ ہو کہ یہ اللہ ﷻ کی کتاب ہے اور مشرکین کا خیال ہے کہ یہ انسانی کلام ہے اور یہ نبی کریم ﷺ کا بنایا ہوا کلام ہے تو اپنے دعوے کی سچائی ثابت کرنے کے لئے مشرکین بھی اس کی مثل کلام بنالائیں، کیونکہ مشرکین بھی آپ ﷺ کی طرح انسان ہیں اہل زبان ہیں، انہیں اپنی زبان اور فصاحت وبلاغت پر بڑا ناز ہے۔ اور وہ تو مجلسوں میں اور میلوں میں جا کر اپنی زبان دانی کے جوہر دکھاتے ہیں۔ اگر محمد مصطفی ﷺ ایسا کلام بنا سکتے ہیں تو انہیں بھی ایسا کلام پیش کرنے کی قدرت ہونی چاہیئے، لہٰذا وہ سب مل کر بلکہ اللہ ﷻ کے سوا تمام جہان سے اپنے معاون و مددگار بھی جمع کر لیں اور اپنے ان معبودوں سے بھی اس کام میں مدد لے لیں جن کو وہ ہر طرح کا حاجت روا جان کر پوجتے ہیں۔ اگر پھر بھی ان سے ایک سورت کے برابر کلام نہ بن سکا اور وہ ہرگز نہیں بنا سکیں گے تو یقین کر لیں کہ یہ اس ذات واحد اور قادر مطلق کا کلام ہے اور وہی اللہ ﷻ عزوجل ہے۔

علمی بات: بنی اسرائیل آیت ۸۸ میں پورا قرآنِ حکیم، سورہ ھود آیت ۱۳ قرآنِ حکیم جیسی دس سورتیں اور سورہ یونس، یہاں ایک ہی سورت بنانے میں مقابلے کی دعوت دی گئی ہے۔ پھر اسی کو (سورۃ البقرۃ ۲، آیت: ۲۳) میں بھی دہرایا گیا۔

عملی پہلو: یہ قرآنِ حکیم کا وہ چیلنج ہے کہ جس نے چودہ سو سال سے دنیا، کفر و عناد میں تہلکہ بپا کر رکھا ہے، قرآنِ حکیم کہتا ہے تمہیں اگر میرے منزّل من اللہ ہونے میں شبہ ہے تو تم پوری قوت و استعداد کے ساتھ مقابلہ پر آجاؤ فصاحت وبلاغت کے ساتھ ہو کر آؤ تم میں یہ ہرگز جرات پیدا نہیں ہو سکے گی کہ تم ایک سورت بھی قرآنِ حکیم کے مقابلہ میں بنا ڈالو، یہ چیلنج ان لوگوں کو دیا گیا جن کا بچہ بچہ شاعر تھا، فصاحت وبلاغت جن کی گھٹی میں پڑی تھی مگر کسی بھی ذی ہمت نے قرآنِ حکیم کے اعلان مقابلہ کو قبول نہیں کیا، یہ چیلنج آج بھی موجود ہے، دنیا ترقی کی بہت سی منزلیں طے کر چکی ہے کیا کوئی قوم آج تک ایسا کلام پیش کر سکی ہے، جس میں قرآنِ حکیم کی سی معرفت اور حقائق ہوں، قرآنِ حکیم کی سی جامعیت ہو، جو قرآنِ حکیم کی طرح زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہو، اور پھر فصاحت وبلاغت میں کمال پر ہو۔ کفر آج بھی قرآنِ حکیم کی حقیقت سے انکاری ہے تو اسے آج بھی دعوت مقابلہ ہے، کہ تم اس جیسا کلام بنا کر پیش کرو اگر تم اس سے عاجز ہوں تو پھر اس کی اتباع کرو

کیونکہ قرآنِ حکیم اللہ ﷻ کی کتاب ہے، اس لئے انسانی طاقت سے باہر ہے کہ وہ اس جیسی کتاب لکھ کر لا سکے، اس لئے لوگوں کو چاہیئے کہ اللہ ﷻ نے انہیں جو فطری سمجھ بوجھ عطا فرمائی ہے اسے بروئے کار لاتے ہوئے اس حقیقت پر غور کریں اور قرآنِ حکیم کی برکات سے مستفید ہوں۔

آیت نمبر ۳۹: قرآنِ حکیم کو جھٹلانے والوں کی مذمت کی گئی ہے۔ وہ قرآنِ حکیم کے علوم کا ادراک اور اس کے پیغام کی حقیقت نہ پا سکے۔ سابقہ اقوام والے کا انجام بیان فرما کر اُن جھٹلانے والوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ ان کے جھٹلانے کا انجام اللہ ﷻ کے عذاب کی صورت میں ظاہر ہونے والا ہے۔ جو ابھی تک ان کے سامنے نہیں آیا، لیکن پچھلی قوموں کے انجام سے ان کو عبرت حاصل کرنی چاہیئے۔

علمی اور عملی بات: یعنی قرآنِ حکیم کے متعلق ان کا یہ معاندانہ رویہ اور اس کو کلام الٰہی ماننے سے انکار کسی تحقیق اور غور و فکر کا نتیجہ نہیں کہ انہوں نے قرآنِ حکیم کو پڑھا ہو اس میں غور و فکر کیا ہو اور پھر وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہوں کہ اس میں فلاں فلاں نقائص اور عیب موجود ہیں (معاذ اللہ) اس لئے یہ کلام الٰہی نہیں ہو سکتا۔ بلکہ انہوں نے قرآنی معارف پر آگاہی حاصل نہیں کی۔ اس میں غور و فکر کرنے کی زحمت ہی نہیں اٹھائی۔ اس انکار کی دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآنِ حکیم نے نیکوں کے لئے جس اجر و ثواب کا وعدہ کیا ہے اور نافرمانوں کو جس عذاب الیم کی دھمکی دی اور مستقبل میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کی خبر دی ہے وہ ابھی پردۂ غیب میں ہیں۔ ابھی ان کا وقوع نہیں ہوا۔ وہ ان وعدوں، وعیدوں اور پیشین گوئیوں کو محض ڈراوا سمجھ رہے ہیں وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اللہ ﷻ نے ہر چیز کے ظہور کے لئے ایک وقت مقرر کیا ہوا ہے۔ اس سے پہلے انہیں سوچنے اور حق قبول کرنے کی مہلت دی گئی ہے کہ وہ توبہ کر کے اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں اور جب عذاب کی فیصلہ کن گھڑی آ پہنچے گی تو اس وقت ان کا چیخنا چلانا سب بے کار ہو گا۔

فرصت کے ان لمحوں کو پہلی قوموں نے بھی ضائع کر دیا۔ انہوں نے بھی اپنے انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت کو قبول نہ کیا۔ ان کے روشن معجزات کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ نادانی سے تباہ کن عذاب کے نزول کو ہی نبی کی صداقت کی کسوٹی سمجھتے رہے۔ اور جب وہ عذاب آیا اور اس نے انہیں پیس کر رکھ دیا اس وقت ان کا شرمندہ ہونا، ندامت کے آنسو بہانا اور فریاد کرنا ان کے کسی کام نہ آ سکا۔ مشرکین کو تنبیہ کی جا رہی ہے کہ وہ بھی نزول عذاب سے پہلے توبہ کر لیں اور میرے محبوب رسول ﷺ کے دامن رحمت کو تھام لیں، ورنہ ان کا بھی وہی عبرتناک انجام ہو گا جو اُن سے پہلی نادان قوموں کا ہوا۔

آیت نمبر ۴۰: اس آیت میں مشرکین میں سے بعض کا قرآنِ حکیم پر ایمان لا کر فائدہ اٹھانے اور بعض کا اس کی تکذیب کرنے کا بیان ہے۔ قرآنِ حکیم پر ایمان لانے والوں کی تعریف کی گئی ہے۔ ایمان نہ لانے والوں کو فسادی قرار دیا گیا ہے کیونکہ وہ اسلام کی ترویج و اشاعت میں رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے اللہ ﷻ خوب واقف ہے اور ان کے فساد کی سزا انہیں ضرور ملے گی۔

علمی بات: کفار میں دو طرح کے لوگ ہیں، بعض ایسے ہیں جنہیں یقینی طور پر معلوم ہے کہ یہ قرآنِ حکیم اللہ ﷻ کا کلام ہے اور ایسا معجزانہ کلام بنانا کسی انسان کے بس میں نہیں ہے، مگر وہ ہٹ دھرمی سے اسے جھٹلائے جا رہے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو بالکل عقل کے اندھے اور سمجھ کے کورے ہیں، انہیں اس قرآنِ حکیم کے کلام الٰہی ہونے کا واقعی یقین نہیں ہے۔

اللہ ﷻ خوب جانتا ہے کہ کون ہیں جو محض تعصّب اور ہٹ دھرمی سے قرآنِ حکیم کے برحق ہونے سے انکار کیے جا رہے ہیں، حالانکہ وہ اپنے دل میں اس کے برحق ہونے کا یقین رکھتے ہیں یا ان میں سے کون کفر پر اڑا رہے گا یہاں مفسدین سے مراد اسلام قبول نہ کرنے والے ہیں۔

عملی پہلو: ایمان نہ لانے والے اللہ ﷻ کی نظر میں مفسد ہیں کیونکہ اپنی فطرت کے اعتبار سے کسی کے لئے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ وہ حق کو قبول کرنے سے باز رہے۔ ایسا آدمی اپنے ضمیر کی آواز کو دباتا ہے، وہ اپنے سوچنے کی صلاحیت کو استعمال نہیں کرتا، وہ صاف اور کھلے دلائل کو جھٹلا کر نظر انداز کر دیتا ہے وہ سن کر آن سنی کرتا ہے اور سمجھنے کے باوجود بھی سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا، وہ حق کے مقابلہ میں اپنے تعصب اور مفادات کو ترجیح دیتا ہے۔

آیت نمبر ۴۱: حق کی مخالفت میں کمربستہ رہنے والوں کے اعمال سے رسول اللہ ﷺ کو بَری ہونے کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ اپنے اعمال اور مشرکین اپنے اعمال کے خود ذمہ دار ہیں۔

عملی پہلو: بحث ومناظرہ کرنے والے لوگ آخر وقت تک بلاوجہ اپنی بات پر اڑے رہتے ہیں مگر داعی حق جب دیکھتا ہے کہ مخاطب ضد اور ہٹ دھرمی پر اتر آیا ہے تو مزید بات کرنے کے بجائے وہ یہ کہہ کر الگ ہو جاتا ہے کہ اصل فیصلہ اللہ ﷻ کے یہاں ہونا ہے۔ اللہ ﷻ کی میزان میں جو شخص جیسا نکلے گا ویسا ہی اس کا انجام ہو گا۔

علمی بات: یہ مضمون قرآنِ حکیم میں کئی آیات میں بیان کیا گیا ہے: مثلاً سورۃ ہود ۱۱، آیت: ۳۵ میں ارشاد ہوا "کیا وہ کہتے ہیں کہ اس نے اس (قرآن) کو از خود گھڑ لیا ہے! آپ فرما دیجئے کہ اگر میں نے اس کو گھڑ لیا ہے تو میرا گناہ مجھ پر ہے، اور میں تمہارے گناہوں سے بری الذمہ ہوں۔" اسی طرح سورۃ سبا، آیت: ۲۵ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے "آپ کہیئے (اگر بالفرض) ہم نے کوئی جرم کیا ہے تو تم سے اس کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا اور تمہارے کاموں کے متعلق ہم سے کوئی سوال نہیں کیا جائے گا۔"

دراصل اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو تسلی دی گئی ہے کہ اگر یہ مشرکین آپ کی مسلسل تبلیغ کے باوجود مسلمان نہیں ہوتے تو آپ غم اور فکر نہ کریں آپ کو دعوت الی الحق پر ثواب ملے گا اور ان کو اسلام قبول نہ کرنے کی سزا ملے گی کیونکہ ہر شخص اپنے اعمال کا خود جواب دہ ہے۔

آیت نمبر ۴۲: قریش مکہ کے بعض کافر سرداروں اور دیگر مشرکین کے مکر و فریب کا بیان ہے۔ وہ رسول اللہ ﷺ کی محفل میں حاضر ہو کر بظاہر بڑی توجہ سے قرآنِ حکیم سنتے ہیں۔ لیکن ان کی نیت ہدایت حاصل کرنے کی نہیں ہوتی۔ ان کو غیر عاقل بہرے سے تشبیہ دی گئی ہے۔

علمی بات: یعنی ظاہری طور پر وہ قرآنِ حکیم تو سنتے ہیں، لیکن سننے کا مقصد چونکہ طلب ہدایت نہیں، اس لئے انہیں اس طرح کوئی فائدہ نہیں ہوتا جس طرح ایک بہرے کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا، بالخصوص جب بہرا غیر عاقل بھی ہو، کیونکہ عقل مند بہرا پھر بھی اشاروں سے کچھ سمجھ لیتا ہے۔ لیکن ان کی مثال تو غیر عاقل بہرے کی طرح ہے جو بالکل ہی بے سمجھ رہتا ہے۔ ان باتوں سے نبی ﷺ کی تسلّی مقصود ہے، جس طرح ایک حکیم اور طبیب کو جب معلوم ہو جائے کہ مریض علاج کرانے میں سنجیدہ نہیں اور وہ میری ہدایات اور علاج کی پروا نہیں کرتا تو وہ اسے نظر انداز کر دیتا ہے۔

آیت نمبر ۴۳: سرداران قریش کا حق کے معاملے میں نابینا ہونے کا بیان ہے۔ دل کی بصیرت سے محروم ہونے کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کی صحبت ان کے لئے مفید نہیں ہوتی۔

علمی بات: بعض لوگ آپ کی طرف دیکھتے ہیں لیکن اُن کا مقصد چونکہ کچھ اور ہوتا ہے، اس لئے انہیں بھی اس طرح کوئی فائدہ نہیں ہوتا، جس طرح ایک اندھے کو نہیں ہوتا۔ بالخصوص وہ اندھا جو بصارت کے ساتھ ساتھ بصیرت سے بھی محروم ہو۔ کیونکہ بعض اندھے، جنہیں دل کی بصیرت حاصل ہوتی ہے، وہ آنکھوں کی بصارت سے محروم ہونے کے باوجود بہت کچھ سمجھ لیتے ہیں۔ لیکن ان کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی اندھا جو دل کی بصیرت سے بھی محروم ہو۔

عملی پہلو: حق کو نہ ماننے والوں میں ایک طبقہ وہ ہے جو شروع سے صاف انکار کر دیتا ہے۔ مگر دوسرے طبقے کے لوگ یہ کرتے ہیں کہ بظاہر وہ باتوں کو اس طرح سنتے ہیں گویا کہ وہ سچ مچ سمجھنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ اپنے دل میں نہ سمجھنے کا تہیہ کئے ہوتے ہیں۔ وہ داعی حق کی صداقت کی نشانیوں کو اس طرح دیکھتے ہیں جیسے وہ کھلے دل سے اس کا مشاہدہ کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ان کا ذہن پہلے سے یہ طے کیے ہوئے ہوتا ہے کہ اس کو ماننا نہیں ہے۔ ایسے لوگوں کی ظاہری حالت سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ قبولیت حق کے قریب ہیں۔ مگر اللہ ﷻ کی نظر میں وہ ایسے لوگ ہیں جو کان رکھتے ہوئے بہرے اور آنکھ رکھتے ہوئے اندھے بن جائیں۔ ایسے لوگوں کو کبھی اللہ ﷻ کی طرف سے قبول حق کی توفیق نہیں ملتی۔

آیت نمبر ۴۴: اللہ ﷻ کی دی ہوئی صلاحیتوں کا صحیح استعمال کر کے حق قبول نہ کرنے والے عذاب کے مستحق ہیں۔ یہ خود اپنے بُرے اعمال کے سبب اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔ اللہ ﷻ کسی پر بھی ظلم نہیں کرتا۔

علمی بات: اپنے اوپر ظلم یہ ہے کہ فکر و نظر یعنی عقل و بصیرت سے کام نہ لینا اور اپنے حواس اور صلاحیتوں کو استعمال نہ کرنا یعنی حق اور باطل میں فرق کو نہ پہچاننا اور اگر حق سمجھ میں آجائے تو عناداً اس کی طرف سے منہ موڑ لینا اور خود اپنے اختیار سے بُرے کام کرتے رہنا، قدرت کی نشانیوں کو سمجھنے کے باوجود لہو و لعب

میں مشغول رہنا یہ سب اپنی جانوں پر ظلم ہے ، ایسا شخص دوسروں پر ظلم کرنے والوں سے زیادہ ظالم ہوتا ہے کیونکہ اس کے نفس کا حق اس پر سب سے زیادہ ہے اور وہ اسی کو مستحق نار بنانے پر تلا بیٹھا ہے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، اے میرے بندو! میں نے اپنے آپ پر ظلم حرام کر لیا ہے اور تم پر بھی اسے حرام کر دیا ہے، (خبردار!) ایک دوسرے پر ہرگز ظلم نہ کرنا۔ "اور اس حدیث قدسی کے آخر میں فرمایا: "اے میرے بندو! یہ تمہارے اعمال ہیں جو میں تمہارے لئے شمار کر رہا ہوں، پھر تمہیں ان کا پورا پورا بدلہ عطا کروں گا، جو شخص خیر و بھلائی پائے تو وہ اللہ (ﷻ) کی تعریف کرے اور جو کسی اور صورت حال سے دوچار ہو وہ صرف اپنے آپ ہی کو ملامت کرے۔ "(صحیح مسلم)

عملی پہلو: اللہ ﷻ نے انسان کو بہترین صلاحیتیں دی ہیں۔ اگر وہ ان صلاحیتوں کو صحیح استعمال کرے تو وہ کبھی گمراہ نہ ہو۔ مگر انسان اپنے کو آزاد سمجھ کر غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے۔ وہ بے جا سرکشی کرنے لگتا ہے۔ کیوں کہ جو چیز اس کو آزمائش کے طور پر دی گئی تھی اس کو اس نے اپنا حق سمجھ لیا۔

آیت نمبر ۴۵: روز قیامت اللہ ﷻ کے سامنے حاضر ہونے پر لوگ دنیا کی زندگی کو انتہائی مختصر تصور کریں گے۔ مجرم ایک دوسرے کو پہچان لیں گے لیکن یہ پہچان مفید نہیں ہوگی۔ قیامت کے دن کو جھٹلا کر گمراہی میں پڑے رہنے والے ابدی عذاب میں مبتلا ہوں گے۔

علمی و عملی بات: یہ آخرت اور عذاب کے جھٹلانے والوں کی جلد بازی کا جواب ہے۔ فرمایا کہ آج تو ان کو آخرت بہت بعید معلوم ہوتی ہے لیکن جس دن وہ اکٹھا کیے جائیں گے اس دن اس دنیا کی زندگی کے متعلق ان کی سوچ یہ ہوگی کہ وہ اس دُنیا میں ایک گھڑی سے زیادہ نہیں رہے۔ وہ ایک دوسرے کو اس طرح پہچانتے ہوں گے گویا ان کی ملاقات صبح و شام کا قصہ ہے۔ ہر بات ذہن میں اس طرح تازہ ہوگی گویا اس پر کوئی زمانہ گزرا ہی نہیں۔ مطلب یہ کہ اصل شے تو وہ احساس ہے جو اس دنیا کی زندگی سے متعلق روز آخرت میں ان پر طاری ہوگا تو اب یہ انسان کی محرومی ہی ہے کہ وہ اس دنیا کی زندگی کو بہت طویل اور سب کچھ سمجھ کر آخرت سے بے پرواہو بیٹھے اور جب اس سے ڈرایا جائے تو یہ رٹ لگانا شروع کر دے کہ اگر وہ آنی ہے تو آ کیوں نہیں جاتی۔

عملی پہلو: آخرت سے تکذیب و انکار سب سے بڑے خسارے کی چیز ہے کہ اس سے انسان بے فکر اور لاپرواہ ہو کر نور ہدایت سے محروم ہو جاتا ہے اور یہ محرومی سب سے بڑی محرومی ہے۔ جن لوگوں نے قیامت کو جھٹلایا اور اس کے نتیجے میں انہوں نے اپنی زندگی اور اپنی تمام تر صلاحیتوں کو دنیا کی عارضی اور فانی لذتوں کے حصول ہی میں گنوا دیا۔ اس طرح وہ ہدایت کے نور سے ہمیشہ محروم ہی رہے اور دنیا کی کھیتی سے انہوں نے آخرت کے لئے کچھ نہ کمایا اور کفر و ظلمت کے اندھیروں میں بھٹک کر انہوں نے اپنی عمر کی متاع عزیز کو گنوا دیا وہ بڑے ہی سخت خسارے میں پڑ گئے اور یہ اس قدر بڑا خسارہ ہوگا کہ اس کی تلافی و تدارک کی پھر کوئی صورت ممکن نہ ہوگی اور یہ لوگ رہ رہ کر تمنا و آرزو کریں گے کہ کاش ہم ایمان لے آتے۔ مگر اس تمنا و آرزو سے ان کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا سوائے اس کے کہ اپنی حسرت میں اور اضافہ کریں آج دنیا میں پیسے کی ریل پیل، اس کی چمک دمک اور اس کے وقتی فائدوں اور فانی لذتوں کی بناء پر یہ لوگ اس طرف متوجہ ہونے اور اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں اور آخرت کا انکار کر کے گھاٹے اور خسارے کا سودا کئے بیٹھے ہیں۔

آیت نمبر ۴۶: نافرمانوں کی گرفت اور ان پر عذاب کی دو صورتوں کا بیان ہے۔ ان مجرمین کی سزا رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ میں یا پھر رسول اللہ ﷺ کے دنیا سے پردہ فرما جانے کے بعد ظاہر کی جائے گی۔ ان کے تمام جرائم پر اللہ ﷻ گواہ ہے۔ وہ آخرت کے عذاب سے نہیں بچ سکیں گے۔

علمی بات: اگر ان کافروں اور منکرین پر عذاب کا کچھ حصہ آپ ﷺ کی زندگی میں آجائے یا آپ ﷺ کے دنیا سے رحلت فرمانے کے بعد آئے یا دنیا میں چھوٹ دے کر آخرت میں پکڑا جائے بہر حال عذاب نے آکر رہنا ہے اور انہیں اپنی بداعمالیوں کا نتیجہ بہر حال بھگتنا ہے۔ یہ اللہ ﷻ کی گرفت سے نہ تو چھوٹ سکتے ہیں اور نہ ہی بچ سکتے ہیں کہ ان سب نے آخر کار لوٹ کر اللہ ﷻ ہی کے پاس آنا ہے اور اُن کے خود ساختہ معبود جن کو انہوں نے حاجت روا و مشکل کشا بنا رکھا ہے ان میں سے کوئی بھی ان کے کام آنے والا نہیں۔ وقت آنے پر یہ حقیقت ان کے سامنے پوری طرح آشکار ہو جائے گی کہ ان کے ایسے تمام سہارے محض اوہام اور حقیقت کے برعکس تھے۔

عملی پہلو: اس میں یہ اشارہ ہے کہ نیک لوگوں کا انجام اچھا ہوگا اور رسوائی بدکاروں کا مقدر ٹھہرے گی۔ یہ بات بھی سمجھ لینی چاہئے کہ اللہ ﷻ کو کفار و مشرکین کے سب کاموں کا علم ہے وہ اپنے علم کے مطابق سزا دے گا۔ دنیا میں خواہ سزا ملے یا نہ ملے مگر روزِ آخرت سزا ضرور مل کر رہے گی۔

آیت نمبر ۴۷: لوگوں کی ہدایت کے لئے ہر اُمّت میں ان ہی میں سے رسول بھیجے جانے کا بیان ہے۔ رسول کی دعوت کا ساتھ دینے والوں کی نصرت اور ٹھکرانے والوں کو سزا دی جاتی ہے۔ یہ فیصلہ انصاف پر مبنی ہوتا ہے۔ اللہ ﷻ اتمام حجت سے پہلے کسی کو سزا نہیں دیتا۔

علمی بات: اس سے پہلے اُمّت محمدیہ ﷺ اور آپ ﷺ کا ذکر تھا۔ اب عام اقوام اور اُمتوں کا ضابطہ بیان فرمایا ہے کہ ہر اُمّت کے پاس اللہ ﷻ کے احکام پہنچانے والے رسول بھیجے گئے ہیں۔ تاکہ اللہ ﷻ کی حجت تمام ہو، اتمام حجت سے پہلے کسی کو عذاب نہیں دیا جاتا۔ جب لوگوں کے بُرے اعمال حد درجہ کو پہنچ جاتے ہیں تو اللہ ﷻ اُن کی طرف رسولوں اور نبیوں کو بھیجتے ہیں اور اُن کو سزا رسول علیہ السلام کے آنے اور حجت تمام کرنے کے بعد دی جاتی ہے۔ اللہ ﷻ کے یہاں ظلم اور ناانصافی کا تصوّر نہیں کہ مجرموں کے لئے فوراً عذاب اور سزا کا فیصلہ اتمام حجت سے پہلے سنا دیا جائے۔ اِسی طرح قیامت میں بھی باقاعدہ پیشی ہو گی، فردِ جُرم لگانے کے گواہ پیش ہوں گے ہر قوم کے ساتھ ان کے پیغمبر موجود ہوں گے۔ ان کے بیانات وغیرہ کے بعد نہایت انصاف سے فیصلہ ہو گا۔ قرآنِ حکیم میں اللہ ﷻ نے ارشاد فرمایا "ونضع الموازین القسط" (ہم ترازو کو انصاف پر رکھیں گے)

آیت نمبر ۴۸: مشرکین کی ہٹ دھرمی کا بیان ہے۔ عذاب کی تنبیہ کئے جانے پر وہ عذاب لے آنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔

شانِ نزول: جب گزشتہ آیت نمبر:۴۶ میں عذاب کی وعید سنائی گئی تو کافروں نے سرکشی کے طور پر یہ کہا کہ اے محمد (ﷺ)! جس عذاب کو لانے کا وعدہ کرتے ہیں وہ کب آئے گا۔ اس میں تاخیر کیوں ہے، اس عذاب کو جلد لائیے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور فرمایا کہ اے رسول (ﷺ)! آپ ان سے کہہ دیجئے کہ دشمنوں پر عذاب نازل کرنا اور دوستوں کی مدد کرنا اور انہیں غلبہ دینا یہ سب مشیت الٰہی پر منحصر ہے۔ اور مشیت الٰہی میں ان باتوں کا ایک وقت متعین ہے جو لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔ جب آجاتا ہے تو گھڑی بھر بھی دیر نہیں لگتی۔

عملی پہلو: موجودہ دور میں انسان اپنے آپ کو مادر پدر آزاد سمجھتا ہے۔ وہ بظاہر دیکھتا ہے کہ وہ جو چاہے کرے نہ تو کوئی اس کی گرفت کر سکتا ہے اور نہ کوئی اسے سزا دے سکتا ہے۔ یہ صورت حال اس کو غفلت میں ڈال دیتی ہے۔ حتی کہ اللہ ﷻ کا داعی جب اس کو اس کے انجام سے ڈراتا ہے تو وہ اللہ ﷻ کے داعی کا مذاق اڑانے لگتا ہے۔ وہ کہتا ہے ہماری سرکشی پر تم جس عذاب کی دھمکی دے رہے ہو وہ کب پوری ہو گی۔

آیت نمبر ۴۹: مشرکین کے مطالبہ کا جواب دو طریقوں سے دیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ عذاب نہیں لائیں گے۔ اللہ ﷻ جب چاہے گا عذاب لے آئے گا۔ ہر اُمّت کے لئے مہلت کی ایک مدت مقرر کر دی گئی ہے۔ عذاب کا وقت آجانے پر اس میں قطعاً تاخیر نہیں ہو سکتی۔

علمی و عملی بات: اللہ ﷻ کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ جس وقت رسول کی دعوت کسی شخص یا گروہ کو پہنچی اور اس نے اس کو ماننے سے انکار کیا یا ماننے میں تامل کیا اس پر فوراً عذاب کا فیصلہ نافذ کر دے بلکہ اللہ ﷻ کا قاعدہ یہ ہے کہ ہر فرد کو اس کی انفرادی حیثیت کے مطابق اور ہر گروہ کو اس کی اجتماعی حیثیت کے مطابق سوچنے سمجھنے کے لئے کافی وقت دیتا ہے اور اس بات کو اللہ ﷻ ہی بہتر جانتا ہے کہ کس کو کتنی مہلت ملنی چاہئے۔ پھر وہ مہلت جب پوری ہو جاتی ہے اور وہ شخص یا گروہ اپنی باغیانہ روش سے باز نہیں آتا تب اللہ ﷻ اس پر عذاب کا فیصلہ نافذ کرتا ہے۔ یہ فیصلے کا وقت اللہ ﷻ کی مقرر کردہ مدت سے نہ ایک گھڑی پہلے آسکتا ہے اور نہ وقت آجانے کے بعد ایک لمحہ ٹل سکتا ہے۔

علمی بات: کفار بار بار حضور ﷺ سے پوچھتے کہ وہ عذاب کب آئے گا؟ آپ اسے جلدی کیوں نہیں اتارتے۔ ہم تو آپ کو ستانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رہے۔ اگر آپ کچھ کر سکتے ہیں تو ہمیں تہس نہس کر دیجئے۔ انہیں کیا خبر تھی کہ جس ذات پاک کے ساتھ وہ الجھ رہے ہیں اس نے تو اپنی مشیت اور اپنی مرضی کو اپنے خالق و مالک کی مشیت کے تابع کیا ہوا ہے۔ یہاں تو اذن الٰہی کے بغیر نہ قدم اٹھتا ہے اور نہ زبان کھلتی ہے۔ جہاں تسلیم و رضا کا یہ عالم ہو وہاں تمہارے طعن و تشنیع کے ان تیروں کا کیا اثر ہو سکتا ہے۔ کفار کی ایسی بیہودہ سرائی کا چپ کرا دینے والا جواب دینے کے لئے اللہ ﷻ نے اپنے محبوب کو یہ فرمانے کا حکم دیا یعنی آپ اعلان فرما دیجئے کہ میں تو اپنی ذات کے لئے بھی نفع و نقصان پہنچانے کا کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ بجز اس کے جو اختیار اور جو قدرت میرے رب نے مجھے عطا فرمائی ہے تو میں اس کی مرضی کے بغیر تم پر عذاب کیسے اتار سکتا ہوں۔

علمی بات: اہل حق کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان کے پاس اللہ ﷻ کا دیا ہوا اختیار اور بخشی ہوئی قدرت ہے اور یہی عطا کردہ اختیار کسی کام کے ہونے اور نہ ہونے میں مئوثر ہوتا ہے نفع و نقصان کا اصلاً اختیار اللہ ﷻ کے ہاتھ میں ہے۔ رسول اللہ ﷺ بھی اُمّت کی بھلائی کے لئے جو کچھ کہتے اور کرتے ہیں وہ سب کچھ اللہ ﷻ کے عطا کردہ اختیار اور حکم کے مطابق ہی ہوتا ہے۔ جیسا کہ سورۃ الاعراف کی آیت: ۱۸۸ میں فرمایا گیا کہ: ''آپ فرما دیجئے! کہ میں خود اپنی ذات کے لئے کسی نفع کا اختیار نہیں رکھتا اور نہ کسی ضرر کا مگر اتنا ہی کہ جتنا اللہ ﷻ نے چاہا'' یعنی میں از خود کچھ نہیں کرتا بلکہ وہی کرتا ہوں جو اللہ ﷻ نے مجھے اختیار عطا فرمایا ہے۔ کسی کا یہ سمجھنا کہ اللہ ﷻ نہ چاہے تب بھی حضور ﷺ نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں تو یہ شرک اور کفر ہے اور یہ کہنا کہ آپ ﷺ کو عطا کردہ علم عام بندوں کی طرح ہے تو یہ صرف واقعہ کے خلاف ہی نہیں بلکہ شانِ مصطفوی ﷺ کا بھی انکار ہے کیونکہ آپ ﷺ کو ہر اعتبار سے اُمّت میں انتہائی اعلیٰ درجے اور فضیلت کو بدرجہ کمال حاصل کئے ہوئے ہیں۔

آیت نمبر ۵۰: عذاب کی جلدی کرنے کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں:

۱۔ عذاب مانگنے والے عذاب جیسی خوفناک چیز کے لئے جلدی کر رہے ہیں۔ حالانکہ اس سے پناہ مانگنی چاہیئے۔

۲۔ رات یا دن کسی بھی وقت عذاب آجائے تو اس وقت کیا یہ فوراً اپنا بچاؤ کر سکتے ہیں؟

علمی بات: آپ ان سے فرما دیجئے کہ اگر تم پر اللہ ﷻ کا عذاب رات کو آپڑے یا دن کو آجائے تو عذاب میں ایسی کون سی چیز ہے جس کی وجہ سے مجرمین عذاب کے لئے جلدی مچاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ عذاب تو رات یا دن میں کسی وقت بھی نازل ہو سکتا ہے یہ جانتے ہوئے کہ عذاب سخت چیز ہے اس کے آنے کی جلدی کیوں مچاتے ہیں، عذاب میں ایسی کون سی چیز مرغوب ہے جسے جلد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ حقیقتاً یہاں عذاب اُن کا مطلوب نہیں بلکہ وعدۂ عذاب کی تکذیب مقصود ہے۔

آیت نمبر ۵۱: عذاب کا مطالبہ کرنے والوں کو در حقیقت عذاب پر یقین نہیں ہے۔ ان کا یہ تقاضا محض جھٹلانے اور مذاق اڑانے کی نیت سے ہے۔ فی الواقع عذاب کے ظاہر ہونے پر انہیں یقین آجائے گا جو اس وقت بے سود ہو گا۔

علمی بات: اللہ ﷻ کا دستور اور قانون یہ ہے کہ وہ انسانوں کی توبہ کو اس وقت تک قبول فرماتا ہے جب تک موت کے فرشتے سامنے نہ آجائیں یعنی اس پر جاں کنی شروع نہ ہو جائے۔ لیکن جب موت کے فرشتے سامنے آجاتے ہیں تو پھر کسی طرح اس کی توبہ قبول نہیں کی جاتی۔ کیونکہ حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ ﷻ بندے کی توبہ قبول کرتا ہی رہتا ہے جب تک کہ وہ غرغرہ موت میں گرفتار نہ ہو جائے یعنی غرغرہ موت کے وقت کا ایمان اور توبہ اللہ کے نزدیک معتبر نہیں، اسی طرح دنیا میں وقوعِ عذاب سے پہلے پہلے توبہ قبول ہو سکتی ہے، جب عذاب آپڑے پھر توبہ قبول نہیں ہوتی، اس لئے خواہ یہ معاملہ انفرادی ہو یا اجتماعی اللہ ﷻ کا یہی قانون کسی فرد یا قوم پر جاری ہوتا ہے۔ اجتماعی عذاب اور معافی کی دونوں مثالیں قرآنِ حکیم میں موجود ہیں۔

علمی بات: قرآنِ حکیم میں فرعون کا واقعہ بیان کرتے ہوئے اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو سمندر کے بیچ میں راستوں سے نکال کر دوسرے کنارے پر لے آئے۔ بعد میں فرعون اپنے لشکر کے ساتھ جب ان راستوں کے اندر پہنچ گیا تو دریا کا پانی آپس میں پھر مل گیا اور فرعون اور اس کے لشکری ڈوبنے لگے اس وقت فرعون کو عقل آئی اور اس نے کہا'' میں ایمان لاتا ہوں کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں فرماں برداروں میں سے ہوں''۔

اللہ ﷻ نے اپنے دستور کے مطابق فرعون کی توبہ قبول نہیں کی کیونکہ جب ایمان لانے کا وقت تھا اس وقت تو وہ خود ہی معبود بنا ہوا تھا غرور، تکبر اور کفر میں سب سے آگے تھا لیکن جب اس کو موت نظر آئی تو اس کو بنی اسرائیل کا پروردگار یاد آنے لگا۔ اللہ ﷻ نے اس کی اس توبہ نامنظور فرما دی۔

اس کے برخلاف حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کو جب اس بات کا اچھی طرح اندازہ ہو گیا کہ حضرت یونس یہ کہہ کر چلے گئے ہیں کہ اب تم اللہ ﷻ کے عذاب کا انتظار کرو اور انہیں یقین ہو گیا کہ اگر ہم نے توبہ نہ کی تو واقعی اللہ ﷻ کا عذاب ہمیں آگھیرے گا۔ اس وقت پوری قوم نے عذاب کے آثار کو دور سے آتا ہوا دیکھ کر سچے دل سے گڑگڑا کر آہ وزاری کے ساتھ اپنے کفر و شرک سے اللہ ﷻ کے حضور توبہ کر لی، چونکہ عذاب آنے سے پہلے ہی انہوں نے توبہ کر لی تھی تو ان کی توبہ قبول ہو گئی۔ اس لئے عذاب ہٹا لیا گیا اگر وہ عذاب آنے کے بعد توبہ کرتے تو ان کی توبہ قبول نہ کی جاتی۔

ان آیات میں اللہ ﷻ نے اپنا قانون بیان فرمایا ہے کہ آج یہ کفار مکہ جس عذاب الٰہی کو نظر انداز کر رہے ہیں اور اپنے کفر و شرک سے توبہ نہیں کرتے۔ اگر وہ عذاب آ گیا تو پھر توبہ کے دروازے بند کر دیئے جائیں گے۔

آیت نمبر ۵۲: واقعتاً عذاب آجانے پر ظالموں کا انجام بیان ہوا ہے۔ ان کے اعمال کے بدلے انہیں ہمیشہ جہنّم کا عذاب چکھنے کا حکم دیا جائے گا۔

علمی بات: موت کے بعد ظالموں سے کہا جائے گا کہ اب ہمیشہ کے اس عذاب کا مزہ چکھو جس نے کبھی ختم نہیں ہونا۔ اور ان لوگوں سے مزید کہا جائے گا کہ انہیں اُن کے اپنے ہی اعمال کا بدلہ دیا جا رہا ہے جو وہ لوگ زندگی بھر کرتے رہے تھے۔ اس لئے دین حق سے منہ موڑنا ظلم ہے اپنے خالق و مالک اللہ ﷻ کے حق میں اپنے رسول کریم رؤف رحیم ﷺ کے حق میں اور خود اپنی جانوں کے حق میں بھی اور اس ظلم کے نتیجے میں ایسے لوگوں کو اس روز ذلّت و تحقیر کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اُن کی مہلت عمل ختم ہو چکی۔ اب جس عذاب سے انہیں واسطہ پڑنے والا ہے وہ دائمی عذاب ہے جس سے بچ نکلنے کی کوئی صورت ممکن نہیں۔

عملی پہلو: زلزلے اور طوفان اللہ ﷻ کے حکم ہی سے آتے ہیں۔ انسان اس پہلو پر غور نہیں کرتا کہ جب معاملہ اللہ ﷻ اور انسان کے درمیان ہو تو فیصلہ کا اختیار تمام تر صرف فریق اول کو ہوتا ہے۔ وہ صرف یہ دیکھتا ہے کہ اللہ ﷻ کا قانون فوراً حرکت میں نہیں آ رہا ہے اس لئے وہ غفلت میں پڑا رہتا ہے۔ مگر جب اللہ ﷻ کا فیصلہ آئے گا تو اس وقت انسان اپنے آپ کو بے بس پا کر سب کچھ مان لے گا حالانکہ اس وقت کا ماننا کچھ کام نہ آئے گا کیونکہ وہ عمل کا انجام پانے کا وقت ہو گا نہ کہ عمل کرنے کا۔

آیت نمبر ۵۳: مشرکین کا تمسخر آمیز لہجہ میں قیامت کے متعلق سوال کرنے کا بیان ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو رب کی قسم بیان فرما کر قیامت کے وقوع کا اعلان کرنے کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ مشرکین اللہ ﷻ کو عاجز نہیں کر سکتے اور اس کی پکڑ سے بھاگ نہیں سکتے۔

علمی بات: اہلِ عرب سے رسول اللہ ﷺ نے کہا کہ اگر تم نے اپنی اصلاح نہ کی تو تم کو آخرت کا عذاب پکڑ لے گا۔ اس کے جواب میں وہ آپ کی بات کا مذاق اڑانے لگے۔ وہ دراصل پیغمبر اسلام کی تنبیہ کو بہت ہلکا سمجھ کر نظر انداز کر رہے تھے وَمَا نَحنُ بِمَبعُوثِین۔

آیت نمبر ۵۴: روز قیامت اللہ ﷻ کی بارگاہ میں ظلم کرنے والوں کی حالت زار بیان کی گئی ہے۔ اس دن وہ زمین کے تمام خزانے بطور فدیہ دے کر عذاب سے نجات پانے کے لئے تیار ہوں گے اور اپنی ندامت کو چھپائیں گے تاکہ سب کے سامنے مزید رُسوائی نہ ہو مگر بالآخر اس میں ناکام رہیں گے اور اللہ ﷻ کی بارگاہ میں حق اور انصاف کے ساتھ فیصلے ہوں گے۔

علمی بات: کفار آج تو مال و دولت پر مغرور اور نازاں ہیں۔ اپنی عزت، اپنی سلامتی اور اپنے عیش و آرام کو اس مال و دولت سے وابستہ سمجھ رہے ہیں لیکن کل جب یہ اللہ ﷻ کی بارگاہ میں حاضر کیے جائیں گے اور ان کے گناہوں کا بوجھ ان کی گردن پر لاد دیا جائے گا دوزخ کے شعلے ان کی طرف لپک رہے ہوں گے اس وقت ان کی یہ خواہش ہو گی کہ کاش ان سے یہ سب کچھ لے لیا جائے اور ان کی جان بخشی کر دی جائے۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے اس آیت میں قیامت کے دن کی تین صفات بیان فرمائی ہیں: (۱) ظالم کے اگر بس میں ہوتا تو وہ دنیا کی پوری دولت دے کر بھی اپنے آپ کو عذاب سے چھڑا لیتا۔ (۲) ظالم عذاب کو دیکھ کر اپنی ندامت اور پشیمانی چھپائیں گے۔ (۳) ان کے درمیان عدل و انصاف سے فیصلہ کیا جائے گا۔

۱۔ ظالم تمام دنیا کی دولت دے کر بھی اپنے آپ کو عذاب سے نہیں چھڑا سکے گا، اس کی وجہ اولاً تو یہ ہے کہ وہ قیامت کے دن تنہا آئے گا اور کسی چیز کا مالک نہیں ہو گا، اللہ ﷻ فرماتا ہے اور ان میں سے ہر ایک قیامت کے دن اکیلا حاضر ہو گا۔ (سورۂ مریم ۱۹، آیت: ۹۵) اور اس لئے بھی کہ اللہ ﷻ نے فرمایا کہ قیامت کے دن ان سے کوئی فدیہ نہیں لیا جائے گا۔ اور کسی نفس سے کوئی فدیہ نہیں لیا جائے گا اور نہ ان کی مدد کی جائے گی۔ (سورۃ البقرۃ ۲، آیت: ۴۸)

۲۔ ندامت کہتے ہیں اس حسرت کو جو کسی چیز کے وقوع پذیر ہونے سے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ ظالموں کی پشیمانی اور پچھتاوے کو چھپانے کی وجہ یہ ہو گی کہ وہ دنیا میں اس عذاب کا انکار کرتے رہے تھے اور جب ان پر سخت عذاب آجائے گا تو وہ بہت اخلاص کے ساتھ ندامت کا اظہار کریں گے اور جو شخص اخلاص کے ساتھ کوئی کام کرتا ہے وہ اس کو مخفی رکھتا ہے، اس آیت میں ان کی مذمت کی گئی ہے کہ اخلاص کے ساتھ توبہ کرنے کی جگہ دنیا تھی، اب یہ اخلاص بے موقع اور بے محل ہے۔ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عربی زبان میں اسر کا لفظ دو متضاد معنوں میں استعمال ہوتا ہے اس لفظ کا معنی چھپانا بھی ہے اور ظاہر کرنا بھی تو اس معنیٰ کے اعتبار سے مطلب

یہ ہے کہ جب مجرم لوگوں کے سامنے فرد جرم عائد کیا جائے گا تو اس وقت بڑا واویلا کریں گے اپنے کئے پر پچھتائیں گے اور اپنی ندامت کا کھلے عام اظہار کریں گے کہ ہم نے دنیا میں بہت بُرا کیا مگر وہاں چھٹکارے کی کوئی صورت نہیں ہوگی۔ غرضیکہ ندامت کو چھپانا یا ظاہر کرنا ان کے کسی کام نہ آئے گا۔

عملی پہلو: توبہ کا تعلق اس دنیا سے ہے۔ آخرت میں اخلاص کے ساتھ کی ہوئی توبہ بھی قبول نہیں ہوگی، کیونکہ توبہ کا وقت گزر چکا اگر اس دنیا میں صدق دل سے توبہ کرلی جائے تو اللہ ﷻ کی بارگاہ سے معافی مل جاتی ہے مگر قیامت کے دن صدق دل سے معافی بھی کارآمد نہیں ہوگی۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ "ندامت توبہ ہی ہے۔" (مسند احمد)

۳۔ ظالموں کے درمیان عدل سے فیصلہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ مومنوں اور کافروں کے درمیان فیصلہ کیا جائے گا، ایک قول یہ ہے کہ کفار اور ان کے عذاب کے درمیان عدل کیا جائے گا۔ ہر چند کہ تمام کفار دوزخ کے عذاب میں مشترک ہوں گے لیکن عذاب کی کیفیات میں ان کے درمیان فرق ہوگا، کیونکہ دنیا میں بعض کافروں نے بعض کافروں پر ظلم کیا ہوگا، اور بعض کافروں نے بعض کافروں سے خیانت کی ہوگی، اس لئے بعض کافر ظالم اور بعض مظلوم ہوں گے اور عدل اور حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ مظلوم کا عذاب ظالم سے کم ہو اور ظالم کا عذاب مظلوم کے عذاب سے زیادہ ہو، اس لئے اللہ ﷻ نے فرمایا: ان کے درمیان عدل سے فیصلہ کیا جائے گا اور ان پر بالکل ظلم نہیں کیا جائے گا۔ مفسرین نے اس سے یہ مراد بھی لی ہے کہ کافروں کے بڑوں اور چھوٹوں کے درمیان سرداروں اور چیلوں کے درمیان فیصلہ حق وانصاف ہی سے ہوگا۔ ہر ایک کو اپنے اپنے عمل کا بدلہ ضرور ملے گا۔ کسی کو ناکردہ گناہ میں نہیں پکڑا جائے گا۔ اللہ ﷻ کی بارگاہ میں بالکل حق وانصاف کے ساتھ فیصلہ ہوگا۔

آیت نمبر ۵۵: اللہ ﷻ ہی کائنات کا حقیقی مالک ہے۔ قیامت ضرور قائم ہوگی اور انسانوں کا حساب وکتاب ضرور ہوگا۔ انسانوں کی اکثریت آخرت سے غافل رہتی ہے۔

عملی پہلو: آدمی جسمانی ساخت کے لحاظ سے کمزور مخلوق ہے۔ وہ زیادہ تکلیف کو برداشت نہیں کرسکتا۔ دنیا میں جب تک اس کو عذاب کا سامنا نہیں ہوتا وہ حق کا مذاق اڑاتا ہے۔ وہ اس کو شانِ بے نیازی کے ساتھ ٹھکرا دیتا ہے۔ مگر جب آخرت کا عذاب سامنے ہوگا تو اس پر اتنی گھبراہٹ طاری ہوگی کہ دُنیا کا سب کچھ اس کو حقیر معلوم ہونے لگے گا۔ ساری دنیا کی مال ودولت اور تمام نعمتیں عذابِ الٰہی کے مقابلے میں حقیر اور ہیچ نظر آئیں گی اور اس کی خواہش ہوگی کہ دنیا کا سب کچھ فدیہ میں دے کر اس تکلیف دہ عذاب سے نجات پا جائے۔

آیت نمبر ۵۶: زندگی اور موت پر صرف اللہ ﷻ کا اختیار ہونے اور تمام انسانوں کا اسی کی بارگاہ میں حاضر ہونے کا بیان ہے۔ ہر ایک کو اپنے اعمال کے بارے میں خود جواب دینا ہوگا۔ صرف زمین وآسمان کی ملکیت ہی نہیں، بلکہ زندگی اور موت دینا بھی اللہ ﷻ ہی کے اختیار میں ہے اور لوگوں کو دوبارہ زندہ ہو کر اسی کے پاس جانا ہے۔

علمی بات: مشرکین کے عقیدے کے مطابق کہ تخلیق تین خُداؤں میں تقسیم ہے۔ ایک خدا پیدا کرنے والا۔ ایک خدا قائم، سلامت رکھنے والا اور ایک خدا موت لانے والا۔ لیکن اصلاً انشاء، بقا اور فنا طاری کرنا سب ایک ہی اللہ ﷻ کے اختیار اور قدرت میں ہیں۔

آیت نمبر ۵۷: قرآنِ حکیم کی چار صفات کا بیان ہے جو باہمی مربوط ہیں۔

۱۔ موعظہ: قرآنِ حکیم ایسی نصیحت ہے جس سے دلوں میں نرمی، دنیا سے بے رغبتی اور آخرت سے لگاؤ پیدا ہوتا ہے۔

۲۔ شفاء: یہ انسانوں کی باطنی بیماریوں یعنی دل کی بیماریوں کا علاج ہے۔ ۳۔ ھُدیٰ: یہ انسانوں کے عقائد واعمال کی اصلاح کے لئے ہدایات فراہم کرتا ہے۔

۴۔ رحمۃ: اس پر ایمان لانے اور اس کی پیروی کرنے والوں کے لئے دنیا اور آخرت میں رحمت کا باعث ہے۔

علمی وعملی بات: قرآنِ حکیم بہترین راہ نما ہے:

ایک گمراہ شخص جب ہدایت قبول کرتا ہے، اور یقین واطمینان کی نعمتوں سے بہرہ ور ہوتا ہے تو لازم ہے کہ چار منزلوں سے ہو کر گزرے۔

اول: گناہوں سے آگاہ ہو۔ دوم: شکوک وشبہات اور باطنی امراض سے نجات حاصل کرے۔ سوم: صراط مستقیم کو دیکھ لے، چہارم: اپنے مقصود سے ہم کنار ہو جائے۔

علمی بات: اس آیت کے الفاظ کی ترتیب (موعظہ شفا ہدایت اور رحمت) حکمت سے پُر ہے۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۷۴ میں انسان کے دل کی سختی کا ذکر ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ (پھر تمہارے دل سخت ہوگئے) کے الفاظ سے کیا گیا ہے۔ دراصل دل کی سختی ہی وہ بنیادی مرض ہے جس کے باعث اعلیٰ سے اعلیٰ کلام بھی کسی انسان پر

بے اثر ہو کر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ قبول ہدایت کے لئے سب سے پہلے دلوں کی سختی کو دور کرنا ضروری ہے۔ جیسے بارش سے فائدہ نرم زمین کو ہوتا ہے پتھریلی زمین بارش سے کچھ فائدہ نہیں اٹھا سکتی، بارش کا پانی اوپر ہی اوپر بہہ کر نکل جاتا ہے، اس کے اندر جذب نہیں ہوتا۔

دلوں کی سختی کو دور کرنے کے لئے مؤثر ترین نسخہ وعظ و نصیحت (موعظہ) ہے۔ جب وعظ اور نصیحت سے دلوں میں گداز پیدا ہو گا تو پھر قرآنِ حکیم ان پر دوا کی مانند اثر کر کے تکبر، حسد، بغض، حب دنیا وغیرہ تمام امراض کو دور کر دے گا۔ حبّ دنیا میں مال و دولت، اولاد، بیوی شہرت وغیرہ کی حد سے بڑھی ہوئی تمام محبتیں شامل ہیں۔ ملاحظہ ہو سورۃ آل عمران کی آیت ۱۴ : (زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ)۔ آیت زیر مطالعہ میں الفاظ کی ترتیب پر غور کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ایک انسان کے حق میں قرآنِ حکیم سب سے پہلے وعظ اور نصیحت ہے، پھر تمام امراضِ قلب کے لئے شفاء اور پھر ہدایت۔ کیونکہ جب دل سے بیماری نکل جائے گی، دل شفایاب ہو گا تب ہی انسان قرآنِ حکیم کی ہدایت اور راہنمائی کو عملاً اختیار کرے گا اور جب انسان یہ سارے مراحل طے کر کے قرآنِ حکیم کی ہدایت کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھال لے گا تو پھر اس کو انعام خاص سے نوازا جائے گا اور وہ ہے اللہ ﷻ کی خصوصی رحمت۔ کیونکہ یہ قرآنِ حکیم ربِّ رحمان کی رحمانیت کا مظہر اتم ہے: (اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ)۔

عملی پہلو: اس قرآنِ حکیم نے ان لوگوں کی زندگیوں کی کایا پلٹ دی تھی جو کفر و شرک میں ڈوب کر انسانیت اور اخلاق کے ہر اصول کو بھول چکے تھے۔ کفر و شرک ہی جن کی زندگی بن چکی تھی۔ جہالت و ظلم میں ڈوبے ہوئے یہ لوگ قرآنِ حکیم کی برکت سے انسانیت کے دوست اور خیر خواہ بن گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے جو راہزن تھے وہ راہبر بن گئے اور کفر و شرک اور نفاق کی تاریکیوں میں بھٹکنے والے ساری دنیا کو ہدایت کی روشنی میں لانے کا ذریعہ بن گئے قرآنِ حکیم ڈیڑھ ہزار سال پہلے بھی یہی تاثیر رکھتا تھا۔ وہ تاثیر آج بھی ہے اور قیامت تک اس کی تاثیر برقرار رہے گی بات صرف عمل کرنے کی ہے۔ نبی کریم ﷺ کے جاں نثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے قرآنِ حکیم اور اپنے نبی ﷺ کی سنت پر عمل کیا تو وہ ساری دنیا پر چھا گئے، تمام قوتیں اور طاقتیں ان کی غلام اور محکوم بن کر رہ گئیں۔ پہلے کی طرح آج بھی ہماری بلندی، نجات، کامیابی اور روحانی بیماریوں کا علاج قرآن و سنت ہی میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

آیت نمبر ۵۸: قرآنِ حکیم اللہ ﷻ کی رحمت کا سب سے بڑا مظہر ہے۔ قرآنِ حکیم سب سے بڑی دولت ہے۔ اس دولت کو سعادت اور خوش نصیبی سمجھنا چاہئے۔ اس دولت میں کچھ مل گیا تو بہت کچھ مل گیا۔ اس کے سوا باقی بہت کچھ ملا تو کچھ بھی نہ ملا۔

علمی بات: فضل سے مراد قرآنِ حکیم ہے اور یہی اللہ ﷻ کی رحمت کا سب سے بڑا مظہر بھی ہے جیسے فرمایا کہ الرّحمٰن علم القرآن۔ ایک رائے کے مطابق رحمت سے مراد صاحب قرآن رسالت مآب ﷺ بھی ہیں جیسا کہ ارشاد ہے: وما ارسلنٰك الا رحمة للعلمين۔

قرآنِ حکیم صاحب قرآن کی صورت میں ہم پر اللہ ﷻ کا سب سے بڑا فضل اور رحمت کا نزول ہوا ہے۔

عملی پہلو: انسان صرف اللہ ﷻ کی رحمت اور اس کے فضل کی وجہ سے مسرور ہو نہ کہ مادی اسباب میں زیادتی کی وجہ سے کیونکہ مادی اسباب اور اس کی لذّتیں فانی ہیں ان کے زوال کا خدشہ انسان کو لاحق رہتا ہے اور جب انسان کو روحانی ترقی نصیب ہو کیونکہ وہ اللہ ﷻ کے فضل اور راحت کی دلیل ہے کیونکہ روحانی ترقی اخلاص سے مزّین اعمال اور تقویٰ کی بدولت ملتی ہے اور اس انسان کی نیک بختی اور سعادت مندی کی دلیل ہے۔

آیت نمبر ۵۹: مشرکین کے مذہبی پیشواؤں کو سرزنش کی گئی ہے۔ وہ اپنی من گھڑت رسموں کے ذریعے اللہ ﷻ کے عطا کردہ رزق کو حلال یا حرام ٹھہراتے تھے۔ رزق کا اطلاق صرف خوراک پر ہی نہیں ہوتا بلکہ مال، صحت، علم، لباس، مکان، سواری وغیرہ بھی رزق میں شامل ہیں۔

عرب کے مشرکین نے مختلف جانوروں کو بتوں کے ناموں پر مخصوص کر کے انہیں خواہ مخواہ حرام قرار دے دیا تھا۔

علمی و عملی بات: اپنی طرف سے کسی بھی چیز کو حلال یا حرام قرار دینا اللہ ﷻ پر جھوٹ باندھنا ہے۔ اللہ ﷻ نے بندوں کو پیدا فرمایا ان کو رزق بھی عطا فرمایا۔ ان کی ہدایت کے لئے انبیاء کرام علیہم السلام کو مبعوث فرمایا اور اپنی کتابیں نازل فرمائیں۔ اللہ ﷻ کے رسولوں نے اللہ ﷻ کی کتابوں کے احکام بتائے اور حلال و حرام کی وہ تفصیلات بتائیں جو اللہ ﷻ کے نزدیک حلال اور حرام تھیں۔ خاتم الانبیاء سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ پر دین کو کامل فرما دیا اور آپ ﷺ پر قرآنِ حکیم نازل فرمایا قرآن و حدیث میں حرام و حلال کی تفصیلات موجود ہیں۔ مشرکین نے جو اپنی طرف سے حرام و حلال تجویز کر رکھا ہے اس کی بھی تردید فرمائی اور اُمّتِ

محمد یہ ﷺ کے لئے بھی پیش بندی کے طور پر فرمادیا کہ اللہ ﷻ کی ہدایات سے ہٹ کر اپنے طور پر حرام و حلال کے فیصلے کرنا کسی کے لئے روا اور جائز نہیں ہے جو کتاب و سنّت نے حلال ٹھہرایا وہی حلال ہے اور حلال کو حرام اور حرام کو حلال کرنا بندہ کے دائرہ اختیار سے باہر ہے۔

آیت نمبر ۶۰: خود ساختہ حلال و حرام کو اللہ ﷻ کی طرف منسوب کرنے والوں کو قیامت کے دن شدید وعید سنائی گئی ہے۔ اللہ ﷻ بلا تفریق سب کو رزق عطا فرماتا ہے۔ انسانوں کی اکثریت شکر کرنے کے بجائے اللہ ﷻ کی حدود کی خلاف ورزی کرتی ہے۔

علمی و عملی بات: کفار روز قیامت کے متعلق کیا خیال کر رہے ہیں کہ کیا معاملہ ان کے ساتھ ہو گا سخت پکڑے جائیں گے، یا سستے چھوٹ جائیں گے۔ عذاب بھگتنا پڑے گا یا نہیں۔ کن خیالات میں پڑے ہیں۔ یاد رکھیں جو دردناک سزا ملنے والی ہے وہ ٹل نہیں سکتی۔

اللہ ﷻ اپنے فضل سے دنیا میں بہت کچھ مہلت دیتا ہے۔ بہت سی تقصیرات کو تاہیوں سے درگزر فرماتا ہے۔ لیکن بہت سے لوگ اس نرمی اور ستّاری کو دیکھ کر بجائے شکر گذار ہونے کے اور زیادہ دلیر اور بے خوف ہو جاتے ہیں۔ بالآخر مستحق عقاب ٹھہرتے ہیں اور اللہ ﷻ کی پکڑ اور گرفت میں آتے ہیں۔

آیت نمبر ۶۱: اس آیت میں بیک وقت رسول اللہ ﷺ اور مشرکین دونوں کو خطاب ہے۔ ایک طرف رسول اللہ ﷺ لوگوں کی ہدایت کے لئے قرآنِ حکیم سناتے ہیں اور اس کے ذریعے جہاد کر رہے ہیں۔ دوسری طرف مخالفین رسول ﷺ اور اہل ایمان کو تکلیفیں پہنچا کر اسلام کی راہ سے روکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کائنات میں اللہ ﷻ کے اِذن سے کوئی چیز باہر نہیں۔ بندوں کا کوئی کردار اس کی نظروں سے اوجھل نہیں۔ اس کے ساتھ تلاوت قرآنِ حکیم کا خاص طور ذکر کیا گیا ہے اور فضیلت قرآنِ حکیم کو بیان فرمایا ہے اور یہ کہ ہر چھوٹی بڑی چیز کا اندراج لوح محفوظ میں ہے۔ اللہ ﷻ کی وسعت علم کے بیان کی حکمت یہ ہے کہ مخالفین کو تنبیہ ہو جائے اور رسول اللہ ﷺ اور آپ علیہ السلام کے ذریعہ اہل ایمان کو تسلّی و تشفّی نصیب ہو۔

علمی بات: اس آیت میں اللہ ﷻ کے علم محیط اور اس کی بے مثال وسعت کا ذکر رسول کریم ﷺ کو مخاطب کر کے کیا گیا ہے کہ آپ جس کام اور جس حال میں ہمیشہ ہوتے ہیں یا قرآنِ حکیم پڑھتے ہیں اس کا کوئی جزء ہم سے مخفی نہیں اسی طرح تمام انسان جو کچھ عمل کرتے ہیں وہ ہماری نظروں کے سامنے ہیں اور آسمان و زمین میں کوئی ایک ذرہ بھی ہم سے چھپا ہوا نہیں ہے بلکہ ہر چیز کتاب مبین یعنی لوح محفوظ میں لکھی ہوتی ہے۔

بظاہر اس جگہ علم الٰہی کی وسعت اور ہر چیز کو محیط ہونے کے بیان میں حکمت یہ ہے کہ اس کے ذریعہ نبی کریم ﷺ کو تسلی دی جائے کہ اگرچہ مخالف اور دشمن آپ علیہ السلام کے بہت ہیں مگر آپ ﷺ اللہ ﷻ کی حفاظت میں ہیں آپ علیہ السلام کو کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔

علمی بات: قیامت میں انسانوں کے دوبارہ زندہ ہونے کو مشرکین عرب اس وجہ سے ناممکن سمجھتے تھے کہ اربوں انسان جب مر کر مٹی کے ذرات میں تبدیل ہو چکے ہوں گے، اس کے بعد ان سب کو اکٹھا کر کے دوبارہ زندگی کیسے دی جاسکتی ہے؟ یہ کیسے معلوم ہو گا کہ مٹی کا کونسا ذرہ کس انسان کے جسم کا حصہ تھا۔ اس آیت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ تم اللہ ﷻ کی قدرت اور علم کو اپنے اوپر قیاس مت کرو۔ اللہ ﷻ کا علم اتنا وسیع ہے کہ اس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔

آیت نمبر ۶۲: اللہ ﷻ کے فرماں برداروں کا ذکر جنہیں اللہ ﷻ کے اولیاء کہا گیا ہے۔ ولایت کا معنی ہے قرب، کسی چیز کا انتظام کرنا، اولیاء۔ ولی کی جمع ہے جس کے معنی قریب، محب، صدیق اور مددگار وغیرہ کے ہیں۔ مومن کے لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اللہ ﷻ کا ولی ہے، یعنی وہ اللہ ﷻ کی معرفت اور اس کے جمال اور جلال کے نور میں مستغرق رہنے کی وجہ سے اس کے قریب اور مقرب ہو چکا ہے۔ ولی وہ مومن کامل ہے جو اللہ ﷻ کو پہچاننے، اخلاص کے ساتھ دائمی عبادت کرنے اور ہر قسم کے گناہوں سے اجتناب کرنے والا ہے۔ جس کا دل اللہ ﷻ کی یاد اور اس کے دھیان میں مشغول رہے۔ شب و روز وہ تسبیح و تہلیل میں مصروف ہو۔ اس کا دل محبت الٰہی سے لبریز ہو اور کسی غیر کی وہاں موجودگی کا شائبہ تک نہ ہو۔ وہ اگر کسی سے محبت کرتا ہے تو اللہ ﷻ کے لئے اگر کسی سے نفرت کرتا ہے تو اللہ ﷻ کے لئے۔ یہی وہ مقام ہے جسے حدیث مبارکہ میں تکمیل ایمان کہا گیا۔

علمی بات: قرب کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ قرب جو ہر انسان بلکہ کائنات کے ذرہ ذرہ کو اپنے خالق سے ہے اور اگر یہ قرب نہ ہو تو کوئی چیز موجود نہ ہو سکے۔ نحن اقرب الیہ من حبل الورید (ہم شہ رگ سے بھی زیادہ اس سے قریب ہیں) میں اسی قرب کی طرف اشارہ ہے۔ دوسرا قرب وہ ہے جو صرف خاص بندوں کو میسر ہے اسے قرب محبت کہتے ہیں۔ قرب محبت کے بیشمار درجے ہیں اس قرب محبت کا سب سے بلند اور ارفع مقام وہ ہے جہاں محبوب رب العلمین ﷺ فائز ہیں۔

علمی بات: خوف مستقبل اور غم ماضی کے واقعات سے تعلق رکھتا ہے۔ اولیاء اللہ نہ ماضی کے حادثات اور فوت شدہ چیزوں پر اور نہ مستقبل کے اندیشوں اور پریشانیوں کا خوف رکھتے ہیں۔ راضی برضائے رب کی کیفیت ہر وقت ان کے شامل حال ہوتی ہے اور ماضی کی کسی بات کا کوئی غم نہ ہونا اور مستقبل میں بے خوف ہونا یہ بہت بڑی نعمت ہے۔ کیونکہ دنیا میں عام طور پر ہر انسان کو خواہ وہ کتنا خوشحال ہو، ہر وقت مستقبل کا کوئی نہ کوئی خوف یا ماضی کا کوئی نہ کوئی غم پریشان کرتا رہتا ہے۔ یہ نعمت کامل طور پر تو صرف جنت ہی میں حاصل ہوگی کہ انسان ہر طرح کے خوف اور صدمے سے بالکل آزاد ہو جائے گا۔

ولی کے مصداق اور ان کے فضائل کے متعلق احادیث:

۱۔ رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ اولیاء اللہ کون ہیں؟ تو آپ علیہ السلام نے فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں دیکھو تو اللہ ﷻ یاد آجائے۔ (جامع البیان)

۲۔ نبی ﷺ نے فرمایا: اللہ ﷻ کے بعض بندوں میں سے ایسے انسان ہیں جو نبی ہیں نہ شہید (لیکن) اللہ ﷻ کے ہاں ان کا مرتبہ دیکھ کر انبیاء علیہم السلام اور شہداء بھی ان کی تحسین کریں گے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا: یارسول اللہ! ہمیں خبر دیں وہ کون لوگ ہیں؟ آپ علیہ السلام نے فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں سے محض اللہ ﷻ کی وجہ سے محبت کرتے ہیں حالانکہ وہ لوگ ان کے رشتہ دار ہوتے ہیں نہ ان کو ان سے کوئی مالی فائدہ حاصل ہوتا ہے اللہ کی قسم ان کے چہرے منور ہوں گے اور بیشک وہ نور پر فائز ہوں گے (بعض روایات میں ہے وہ نور کے منبر پر ہوں گے) اور جب لوگ خوف زدہ ہوں گے وہ بے خوف ہوں گے اور جب لوگ غم زدہ ہوں گے تو انہیں غم نہیں ہوگا پھر آپ علیہ السلام نے اس آیت کو پڑھا: الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔ (سنن الترمذی)

۳۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ ﷻ جب کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو جبرئیل علیہ السلام کو بلا کر فرماتا ہے میں فلاں سے محبت کرتا ہوں تم اس سے محبت کرو، پس اس سے جبرئیل علیہ السلام محبت کرتا ہے پھر وہ آسمان میں ندا کرتا ہے کہ اللہ ﷻ فلاں سے محبت کرتا ہے تم بھی اس سے محبت کرو، پس آسمان والے اس سے محبت کرتے ہیں، پھر زمین میں اس کے لئے مقبولیت رکھ دی جاتی ہے اور جب وہ کسی بندے سے بغض کرتا ہے تو جبرئیل علیہ السلام کو بلا کر فرماتا ہے میں فلاں سے بغض رکھتا ہوں تم اس سے بغض رکھو۔ پھر جبرئیل علیہ السلام اس سے بغض رکھتے ہیں پھر زمین میں اس کے لئے بغض رکھ دیا جاتا ہے۔ (صحیح مسلم، صحیح البخاری، مسند احمد، سنن الترمذی)

آیت نمبر ۶۳: وہ سچے اور مخلص مومن ہوتے ہیں جن کے دل نورِ ایمان سے منور ہوتے ہیں۔ وہ اللہ ﷻ کی اطاعت سے سرشار رہتے ہیں اور گناہوں سے اجتناب کرتے ہیں۔

اولیاء کون لوگ ہیں اس کے بارے میں فرمایا کہ جو لوگ ایمان لائے اور تقویٰ اختیار کیا یہ لوگ اولیاء اللہ ہیں۔ ایمان کے بغیر تو اللہ ﷻ کا کوئی دوست ہو ہی نہیں سکتا۔ خواہ کیسی اور کتنی ریاضت کرے اور عبادت کے نام سے کچھ بھی عمل کرے۔ کافر اور مشرک کو اللہ ﷻ کا قرب نصیب نہیں ہوتا اور وہ اللہ ﷻ کا ولی نہیں ہو سکتا۔

اہل ایمان کے درجات مختلف ہیں۔ ایمان کی صفات کے کم و بیش ہونے اور ایمانی تقاضوں پر عمل کرنے میں اور عبادت، تلاوت، ذکر کی کیفیات اور مقدار کے اختلاف سے مراتب میں فرق آتا ہے۔ فرائض اور واجبات کا اتباعِ سنت کا اہتمام، حرام اور ممنوع کاموں سے بچنا، نوافل کی کثرت، ذکر اللہ ﷻ کی مشغولیت اور صفت احسان (اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ) کا حصول، خشوع خضوع، اخلاص، مکارم اخلاق، محاسن الافعال ان سب چیزوں کے ذریعہ حسب مراتب درجہ بدرجہ اللہ ﷻ کا قرب حاصل ہوتا ہے اور اسی کا نام ولایت ہے۔

دولت ایمان سے مشرف ہونے کے بعد اہل عزم و ہمت ترقی کے مختلف درجات طے کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس بلند مقام پر فائز ہو جاتے ہیں۔ جس کی وضاحت حضور رحمت دو عالم ﷺ نے یوں بیان فرمائی۔

فرمانِ نبوی ﷺ: اللہ ﷻ ارشاد فرماتا ہے کہ بندہ نفلی عبادت سے میرے قریب ہوتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔ اور جب میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو میں ہی اس کے کان ہو جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے اور میں ہی اس کی آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے۔ (صحیح بخاری) یعنی اس کا سننا دیکھنا سب میری رضا کے مطابق ہو جاتا ہے۔

علمی بات: ہر وہ عمل جو ایمان کے تقاضوں کے مطابق ہو اور اللہ ﷻ کی رضا کے لئے ہو وہ سب عمل قربِ خداوندی اور رضائے الٰہی کا ذریعہ ہے۔ اولیاء اللہ کی تعریف میں جو اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فرمایا یہ ایمان کے تمام تقاضوں کو شامل ہے فرائض سے لے کر مستحبات تک جو بھی کرنے کے کام ہیں وہ سب اللہ ﷻ کا قرب حاصل ہونے کا ذریعہ ہیں۔ یہ تو ایمان کے تقاضوں کا ذکر ہوا جن پر عمل کرنا ہے ان کے علاوہ دوسرے تقاضے بھی ہیں جن کا تعلق ان اعمال سے ہے جن کا ارتکاب کرنے

سے منع فرمایا ہے۔ اس کو وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ میں بیان فرمادیا۔ حرام سے لے کر مکروہ تنزیہی تک جو اعمال ترک کرنے کے ہیں ان سے بچنا بھی رضائے الٰہی کا ذریعہ ہے۔ اور یہ بھی عبادت ہے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: (اِتَّقِ الْمَحَارِمَ تَکُنْ اَعْبَدَ النَّاسِ) کہ تو اللہ ﷻ کی حرام کی ہوئی چیزوں سے بچ، ایسا کرنے سے تو دوسروں سے بڑھ کر عبادت گزار ہو گا۔ (مشکوٰۃ المصابیح) پس جو شخص معروف پر عمل کرتا ہے اور منکرات سے بچتا ہے اور رسول اللہ ﷺ کی سنتوں کی اتباع کا اہتمام کرتا ہے جیسا سورۃ آل عمران ۳، آیت:۳۱ (قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ) ترجمہ: اے نبی (ﷺ)، لوگوں سے کہہ دو کہ "اگر تم حقیقت میں اللہ (ﷻ) سے محبت رکھتے ہو، تو میری پیروی اختیار کرو، اللہ (ﷻ) تم سے محبت کرے گا" میں بیان فرمایا ہے ایسے شخص کو اپنے اپنے عمل کے اعتبار سے قرب الٰہی حاصل ہو گا اور اسی درجہ کی ولایت حاصل ہو گی جس درجہ کے اعمال ہوں گے اور جس قدر دنیاوی مشاغل و افکار سے ذہن فارغ ہو گا اور اللہ ﷻ سے لو لگی ہو گی اسی قدر قرب الٰہی میں بتدریج اضافہ ہوتا رہے گا۔

آیت نمبر ۶۴: اولیاء اللہ کے لئے دنیا و آخرت کی بشارتیں دی گئی ہیں۔ یہ بشارتیں حتمی اور یقینی ہیں۔ یہی حقیقت میں سب سے بڑی کامیابی ہے۔

علمی بات: حدیثِ مبارک کے مطابق اس بشارت سے اچھے خواب مراد ہیں جنہیں آدمی خود دیکھے یا اس کے لئے دیکھا جائے (یعنی اس کے لئے کوئی اور دیکھے) (مسند احمد) مطلب یہ ہے کہ مومن بندے ایسے خواب دیکھ لیتے ہیں جن میں ان کے لئے خیر و خوبی کی اور حسن خاتمہ کی اور اعمال کے عند اللہ مقبول ہونے کی نیز جنت میں داخل ہونے کی خوشخبری ہوتی ہے اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ دوسرے لوگوں کو ایسے خواب دکھائے جاتے ہیں جن میں کسی مومن بندے کے لئے بشارت ہوتی ہے۔ اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے بشارت کا ایک مصداق بیان فرمادیا ہے۔

علمی بات: بعض مفسرین اس بشارت سے دنیا میں نیک نامی بھی مراد لیتے ہیں۔ جیسا کہ ایک حدیث میں ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ ارشاد فرمایئے ایک شخص کوئی خیر کا کام کرتا ہے اور لوگ اس پر اس کی تعریف کرتے ہیں (اس کی وجہ سے اس کا ثواب ختم تو نہیں ہو جاتا جبکہ اس نے وہ عمل اللہ ﷻ کے لئے کیا ہے) آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ تو مومن کے لئے ایک بشارت ہے جو اس دنیا میں اسے مل گئی۔ (صحیح مسلم)

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ دنیا کی بشارت یہ ہے کہ موت کے وقت فرشتے بشارت لے کر آتے ہیں اور اللہ ﷻ کی رضامندی کی خوشخبری دی جاتی ہے۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث مروی ہے جس میں موت کے وقت اللہ ﷻ کی رضامندی کی بشارت کا ذکر ہے۔ (مشکوٰۃ المصابیح) نیز قبر میں بشارت دیئے جانے کا ذکر بھی ہے۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس سے وہ بشارت مراد ہے جس کا اللہ ﷻ نے مؤمنین سے وعدہ فرمایا ہے کہ انہیں جنت کا داخلہ نصیب ہو گا اور ان کے اعمال کا بہت اچھا ثواب ملے گا۔ جیسا کہ (سورۃ البقرہ ۲، آیت:۲۵) میں فرمایا (وَبَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَھُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ) ۔ بشارتیں اس دنیا میں دی گئی ہیں۔ اللہ ﷻ کی باتوں یعنی اللہ ﷻ کے وعدوں میں کوئی تبدیلی نہیں جو وعدے فرمائے ہیں وہ سب پورے ہوں گے جو بشارتیں دی ہیں وہ سچی ہیں ان کے مطابق انعام دیا جائے گا۔

آیت نمبر ۶۵: رسول اللہ ﷺ اور اہل ایمان کو مخالفین اسلام کی بدکلامی سے غمزدہ نہ ہونے کی تلقین کی گئی ہے۔ حقیقی غلبہ، قوت و عزّت۔ اللہ ﷻ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ مخالفین بالآخر مغلوب ہوں گے اور اہل حق کو عزت اور غلبہ نصیب ہو گا۔

علمی و عملی بات: آنحضرت ﷺ کے مخالفین آپ ﷺ کے منہ پر بھی اور غائبانہ طور پر (معاذ اللہ) ایسی باتیں کرتے تھے جو شرافت کی حد سے خارج تھیں کبھی مجنون و مسحور کہتے کبھی جادوگر و کذاب کہتے، غربت کے طعنے دیتے جس سے طبعاً آپ ﷺ کو تکلیف ہوتی تھی اس تکلیف اور رنج پر اللہ ﷻ نے آپ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا "اور نہ غم میں ڈالے آپ کو ان کی بات" کہ مخالف کا کام ہے مخالفت کرنا آپ ﷺ ان کی باتوں سے غمگین نہ ہوں کیونکہ بیشک عزت ساری کی ساری اللہ ﷻ کے لئے ہے، اور سورۃ منافقون ۶۳، آیت:۸ میں ہے "اور اللہ ﷻ کے لئے عزت ہے اور اس کے رسول (ﷺ) کے لئے اور مؤمنوں کے لئے"۔ عزت مند وہ ہے جو اللہ ﷻ کے سامنے معزز ہو، اس میں ہمارے لئے سبق ہے کہ اگر مخالف ہمارے خلاف پروپیگنڈہ کرتا ہے تو یہ اس کا کام ہے ہم اس کی پرواہ نہ کریں اور دعوت حق اور صحیح کام کرتے رہیں۔

آیت نمبر ۶۶: آسمان وزمین کی ہر چیز اللہ ﷻ کی ملکیت میں ہے۔ اللہ ﷻ کے سوا (نعوذ باللہ) دوسرے شرکاء کو پکارنے والے محض گمان کی پیروی کرتے ہیں۔ ان کے پاس شرک کی کوئی دلیل نہیں۔ محض گمان اور اندازے ہیں۔

علمی بات: زمین و آسمان کا منتظم اور مدبّر کون ہے؟ جو اس کو سنبھالے ہوئے ہے اور اس کو چلا رہا ہے۔ یہ سوال ہر زمانہ میں انسان کی تلاش کا مرکزی نکتہ رہا ہے۔ مگر اس سوال کا صحیح جواب پانا اسی وقت ممکن ہے جب کہ آدمی ماورالطبعیات (حیوانات، نباتات، جمادات) یعنی مادی دنیا سے باہر کی دنیا تک دیکھ سکے اور ماورا لطبعیات یعنی اس ظاہری مادی دنیا سے الگ تصوراتی دنیا تک دیکھنے والی آنکھ کسی کو حاصل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر وہ جواب جو وہ خود قائم کرتا ہے وہ محض قیاس و گمان کی بنیاد پر ہوتا ہے نہ کہ حقیقی علم کی بنیاد پر۔

اس دنیا میں حقیقی علم کی بنیاد پر بولنے والے صرف وہ لوگ ہیں جن کو پیغمبر کہا جاتا ہے۔ یہ وہ مخصوص لوگ ہیں جن کا رابطہ عالم بالا سے براہ راست قائم ہوتا ہے۔ اللہ ﷻ خود انہیں اپنی طرف سے حقیقت کی خبر دیتا ہے۔ اس لئے اس دنیا میں پیغمبر ان اسلام کا علم ہی واحد علم ہے جو یقینی اور قطعی ہوتا ہے۔

جو لوگ اپنے خیال کے مطابق "شرکاء" کی پیروی کر رہے ہیں۔ وہ کسی حقیقت کی پیروی نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ صرف اپنے قیاس و گمان کی پیروی کر رہے ہیں۔ پیغمبروں کے ذریعہ ظاہر ہونے والی حقیقت کی تصدیق ساری کائنات کر رہی ہے مگر "مشرکین" جس چیز کے مدعی ہیں اس کی تصدیق کرنے والا کوئی نہیں۔

آیت نمبر ۶۷: کائنات کی نشانیاں اللہ ﷻ کے وجود اور قدرت پر دلیل ہیں۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے اپنی قدرت سے اپنی حکمت کے زیر اثر اتنی بڑی بڑی چیزیں پیدا کیں جو انہی لوگوں کے لئے مفید ہیں جو اللہ ﷻ کا کلام اور اس کی وعظ ونصیحت، حق کو قبول کرنے کی نیت سے سنیں اور ان کے تقاضوں کے مطابق چلنے اور حق کو قبول کرنے سے گریز نہ کریں۔

کسی چیز کو ماننے اور تسلیم کرنے کی پہلی منزل سننا ہوتا ہے۔ جو پیغام سنے گا نہیں وہ غور کیا کرے گا اور اسے کیسے سمجھے گا؟ لہٰذا ایسا شخص دوسری منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔ تیسری منزل کسی چیز کو یاد کرنا ہوتا ہے اور چوتھی منزل اس پر عمل پیرا ہونا ہے۔ اس کے بعد آخری منزل یہ ہے کہ جو کچھ حاصل ہو اس پر عمل کر کے اسے دوسروں تک بھی پہنچائے یہاں پر "یسمعون" کے لفظ سے پہلی منزل کی طرف اشارہ ہے کیونکہ سارا معاملہ اسی سے آگے چلے گا۔

علمی بات: پیغمبروں کے دعوے کی صداقت کو جانچنے کے لئے اگرچہ ہمارے پاس کوئی براہ راست ذریعہ نہیں۔ تاہم ایک بالواسطہ ذریعہ یقینی طور پر موجود ہے۔ اور وہ کائنات کی آیات (نشانیاں) ہیں۔ یہ نشانیاں پیغمبروں کے بیان کردہ معنوی حقائق کی عملی تصدیق کر رہی ہیں۔

مثال کے طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری زمین پر رات کے بعد دن آتا ہے اور دن کے بعد رات آتی ہے۔ یہ گردش ایک انتہائی محکم نظام کی وجہ سے وجود میں آتی ہے جو ریاضیاتی صحت کی حد تک منظم ہے۔ مزید یہ کہ یہ گردش حیرت ناک حد تک ہماری زندگی کے موافق ہے۔ اس کے پیچھے واضح طور پر ایک بامقصد محکم نظام کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ صورت حال یقینی طور پر ایک ایسے قادر مطلق اور رحمان ورحیم کے وجود کا ثبوت ہے جس کی خبر پیغمبر علیہ السلام دیتے ہیں۔

علمی و عملی بات: دن رات اور اندھیرے اُجالے کا پیدا کرنے والا وہی ایک اللہ ﷻ ہے۔ اسی سے خیر و شر اور تمام اضداد یعنی حریف اور مخالف اشیاء کی پیدائش کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اس میں "مجوس" (آگ کے پجاری) کے شرک کا رد ہو گیا۔ اور اس بات کی طرف بھی لطیف اشارہ کر دیا کہ جس طرح رات کی تاریکی کے بعد اللہ ﷻ روز روشن کو لاتا ہے اور دن کے اجالے میں وہ چیزیں نظر آتی ہیں جو شب کی ظلمت میں دکھائی نہ دیتی تھیں۔ ایسے ہی مشرکین کے ذہنوں میں اور خیالات و اوہام کے اندھیروں کا پردہ چاک کرنے کے لئے اس نے قرآنِ حکیم کا آفتاب چمکایا جو لوگوں کو معرفت الٰہی کا ٹھیک راستہ دکھانے والا ہے اور ظُلمت اور اندھیروں سے نکالنے والا ہے۔

آیت نمبر ۶۸: کفار عرب کا یہ عقیدہ تھا کہ فرشتے (نعوذ باللہ) اللہ ﷻ کی بیٹیاں ہیں۔ اس کے رد کے لئے دو دلیلیں پیش فرمائی جا رہی ہیں۔ پہلی دلیل یہ ہے کہ وہ غنی ہے۔ یعنی وہ کسی کا محتاج نہیں اور کائنات کا ذرہ ذرہ اپنے وجود اپنی نشوونما اور اپنی بقاء میں اس کا محتاج ہے، اولاد کی ضرورت تو اس لئے ہوتی ہے جو خود کمزور ہوتا کہ وہ اپنی اولاد کی وجہ سے طاقتور ہو جائے اور اپنے دشمنوں کو مغلوب کر سکے یا وہ فقیر و مسکین ہوں کہ اس کی اولاد ہو جو کسب رزق میں اس کی معاون ثابت ہو۔ یا مرنے کے بعد اس کے نام کو اور اس کی یاد کو زندہ رکھ سکے۔ اور جو ذات ہر قسم کی احتیاج اور ضرورت سے پاک ہے اس کو اولاد کی خواہش آخر کیوں ہو۔ دوسری دلیل "جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے" اور کائنات کی ہر چھوٹی بڑی چیز اس کی پیدا کردہ ہے اور اس کی مملوک ہے تو وہ اس کی اولاد کیسے بن سکتی ہے؟

علمی بات: اس میں عیسائیوں کے شرک کا بھی رد ہے جو حضرت مسیح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا کہتے تھے۔ سمجھنے کی بات یہ ہے کہ اگر وہ واقعی طور پر مسیح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا (معاذ اللہ) صلبی بیٹا سمجھتے ہیں تو اس سے بڑھ کر کیا گستاخی ہو گی۔ خداوند قدوس بیوی بچوں سے پاک ہے۔ وہ تو سب سے بے نیاز ہے اور سب ہر وقت اس کے محتاج ہیں۔ اسے بیٹے کی احتیاج کیسے ہو سکتی ہے؟ سب چیزیں اس کی مملوک و مخلوق ہیں۔ پھر مالک و مملوک اور خالق و مخلوق کے درمیان ان نسبی رشتوں کی کہاں گنجائش ہے۔ یہ بڑی سخت بات ہے کہ خدا کی نسبت محض جہالت سے ایسی جھوٹی اور بے سند باتیں کہی جائیں۔

آیت نمبر ۶۹: فلاح کا معنی ہے مقصود اور مطلوب تک پہنچنا اور ہمیشہ کی دائمی کامیابی سے ہم کنار ہونا جبکہ فلاح نہ پانے کا مطلب ہے کہ وہ شخص اپنی کوششوں میں کامیاب نہ ہو بلکہ اگر وقتی طور سے کچھ ہاتھ بھی لگ جائے تو بھی بالآخر دائمی ناکام اور نامراد ہو۔ بعض لوگ گھٹیا مقاصد کے ساتھ فوری نتائج کے طالب ہوتے ہیں تو جب انہیں اپنا مطلوب جلد حاصل ہو جائے تو وہ سمجھتے ہیں کہ وہ کامیاب ہو گئے حالانکہ وہ ظاہری اور سطحی مطلوب ہے جس کے پیچھے خوفناک عذاب کروٹ لے رہا ہے۔ چند روزہ عیش کا خاتمہ یقینی ذلّت اور مصیبت پر ہو تو اسے فلاح نہیں کہہ سکتے۔ حالانکہ اصل کامیاب تو وہ لوگ ہیں جو اُخروی فلاح حاصل کرنے والے ہیں۔

آیت نمبر ۷۰: علمی و عملی بات: اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ یہ خسیس اور حقیر مطلوب دنیاوی زندگی میں متاع قلیل ہے، پھر بہر حال انہوں نے مرنا ہے اور مرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے پاس لوٹ کر جانا ہے اور وہاں انہوں نے اپنے کفر اور تکذیب کی وجہ سے دائمی عذاب بھگتنا ہے تو یہ کامیابی نہیں ہے بلکہ واضح ناکامی ہے۔

علمی بات: اس ارشاد سے بھی کئی بنیادی حقائق کو واضح فرما دیا گیا، مثلاً یہ کہ ان لوگوں کے لئے بس دنیاوی زندگی میں چند روزہ نفع اٹھا لینے کی مہلت ہے اسکے بعد ان کے لئے ہمیشہ کی محرومی اور دائمی عذاب ہے۔ دوسرے یہ کہ ان لوگوں نے آخر کار اللہ تعالیٰ ہی کی طرف پلٹ کر جانا ہے پس جو لوگ اس طرح کہتے ہیں کہ ہم مر مٹ کر یونہی ختم ہو جائیں گے اور ہم سے کوئی حساب کتاب نہیں لیا جائے گا۔ اور اسی طرح جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمارے مرنے کے بعد ہمارے سفارشی معبود ہمارا سب کام بنا دیں گے، تو یہ سب کچھ غلط اور ان کی ایسی تمام باتیں بے بنیاد اور بے حقیقت ہیں، اور تیسری اہم حقیقت اس ضمن میں یہ بیان فرمائی گئی کہ ہم ان کو ان کے قرآنِ حکیم اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تکذیب اور اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھنے کے بدلے سخت سزا اور عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔

آیت نمبر ۷۱: حضرت نوح علیہ السلام کی چند باتوں کا بیان ہے۔ تبلیغ اور وعظ و نصیحت کی وجہ سے قوم کی ناگواری انہیں اپنے فرض منصبی سے نہ ہٹا سکی۔ اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ کرتے ہوئے وہ دعوت حق کی ذمہ داری ادا کرتے رہے۔

علمی بات: حضرت نوح علیہ السلام کا قصہ عزم و استقلال کا نمونہ ہے، اُنہوں نے ساڑھے نو سو برس تک پیہم مسلسل قوم میں تبلیغ فرمائی، اور دن رات وعظ و نصیحت فرمائی مگر قوم کی اکثریت شرک و کفر پر اڑی رہی اصل تو ہونا یہ چاہیئے تھا کہ یہ لوگ حضرت نوح علیہ السلام کی دعوتِ ایمان و توحید کو قبول کرتے اپنے دلوں کی اصلاح کرتے برائیوں سے نفرت کرتے، اور پاکباز و خدا پرست بننے کی سعی کرتے لیکن اُن کے دل بغض و عناد کی غلاظتوں سے سیاہ اور آلودہ ہو گئے نافرمانی و انکار کی لعنتوں نے چاروں طرف سے ان کو گھیر لیا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے کمال بے خوفی سے اعلان فرما دیا کہ میں صرف اپنے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھتا ہوں، تم مخالفت میں پورا زور صرف کر لو اپنے بغض و حسد کا اعلان کر دو اور مجھے جینے اور سنبھلنے کی قطعاً مہلت نہ دو پھر دیکھو میرا اللہ تعالیٰ میری کس طرح دستگیری فرماتا ہے۔

علمی بات: پہلے رسولوں کی اقوام کے قصص بیان فرمانے میں یہ حکمت ہے، کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ علیہ السلام کے اصحاب رضی اللہ عنہم یہ سنیں گے، کہ تمام کافر اپنے رسولوں کے ساتھ اسی طرح تکذیب اور مخالفت میں پیش پیش ہیں اور واضح دلائل اور معجزاتِ نبوت دیکھنے کے باوجود ان کو جھٹلاتے رہے ہیں، تو کفار مکہ کی مخالفت اور ان کی شقاوت کو برداشت کرنا آپ سب پر سہل اور آسان ہو جائے گا۔ نیز جب کفار، انبیاء سابقین علیہم السلام کے ان واقعات کو سنیں گے، تو ان کو یہ علم ہو جائے گا کہ انبیاء متقدمین علیہم السلام کو ان کے زمانہ کے کافروں نے ایذاء پہنچانے میں اپنی انتہائی طاقت صرف کر دی، لیکن بالآخر وہ ناکام اور نامراد ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں اور نبیوں کی مدد فرمائی اور کافر ذلیل اور رسوا ہوئے۔ تو ہو سکتا ہے، کہ ان واقعات کو سن کر کفار کے دل خوف زدہ ہوں اور وہ اپنی ایذاء رسانیوں سے باز آجائیں۔

آیت نمبر ۷۲: حضرت نوح علیہ السلام کا اپنی قوم سے خطاب جاری ہے۔ اپنی جدوجہد کے عوض کسی قسم کا کوئی اجرت یا بدلہ ان کا مقصود نہ تھا بلکہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کے پابند اور اسی کے فرماں بردار تھے۔

علمی بات: حضرت نوح علیہ السلام نے قوم سے فرمایا کہ تمہارے مقابلہ میں جسمانی تکالیف سے گھبراتا ہوں اور نہ مالی نقصان کی کوئی فکر ہے کیونکہ میں نے دعوت و تبلیغ کے کار خیر کے عوض تم سے کبھی کوئی معاوضہ طلب نہیں کیا کہ میری ساری جدوجہد مال کی حرص اور روپیہ کے لالچ سے تھی (معاذاللہ)۔ میں جس کا کام کر کے اس کا حکم بجالا رہا ہوں اسی کے ذمہ میرا اجر ہے جب میں اس کا فرمانبردار ہوں اور یہ خدمت اور فرض بے خوف و خطر انجام دیتا ہوں تو کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنے فضل و رحمت کے دروازے مجھ پر نہ کھولے رکھے۔

آیت نمبر ۷۳: تمام تر وعظ و نصیحت کے باوجود قوم کی اکثریت نے دعوت توحید کو جھٹلایا۔ عذاب آنے پر اللہ ﷻ نے حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے ساتھ کشتی میں موجود اہل ایمان کو بچالیا اور زمین میں اہل ایمان کو جانشین بنا دیا۔ یعنی کشتی والوں کو کفار کی ہلاکت کے بعد زمین کا مالک بنایا یا حضرت نوح (علیہ السلام) کو اپنا خلیفہ اور ان کے بعد مومنوں کو ان کا خلیفہ بنایا۔ اس واقعہ کو بیان کر کے رسول اللہ ﷺ کو جھٹلانے والوں کے عبرتناک انجام کی تنبیہ کی گئی ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے نوح علیہ السلام اور ان کے ساتھ اہل ایمان کو عذابِ طوفان سے نجات عطا فرمائی۔ اس طوفان عظیم کے آثار و شواہد کے قدیم ماہرین کو آج بھی ارض نوح علیہ السلام میں مل رہے ہیں۔ مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ طوفان ملک عراق میں دریائے دجلہ اور دریائے فرات کے درمیانی علاقہ میں آیا تھا۔ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کی غرقابی کے بعد آپ علیہ السلام کے مخلص رفیق پھر اسی علاقہ میں آباد ہوئے اور انہی سے نسل آدم علیہ السلام چلی۔ نوع انسانی کی آبادی تاریخ کے اس ابتدائی دور میں صرف اسی سرزمین کے حدود تک محدود تھی۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ کشتی کی لمبائی تین سو ہاتھ اور چوڑائی پچاس ہاتھ اور اونچائی میں تیس ہاتھ تھی۔ اس روایت میں اتنا زائد ہے کہ عرض میں اس کا دروازہ تھا، علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ کشتی کا طول اسی (۸۰) ہاتھ اور عرض پچاس (۵۰) ہاتھ اور بلندی اوپر کو تیس (۳۰) ہاتھ، اور ہاتھ سے مراد (پنجہ سے) مونڈھے تک ہے۔

عملی پہلو: اس آیت میں کفار کے لئے ترہیب اور عبرت کا سامان ہے کہ جو لوگ اللہ ﷻ کے رسول کی تکذیب کریں گے ان پر ایسا عذاب آسکتا ہے جیسا حضرت نوح علیہ السلام کو جھٹلانے والوں پر آیا پر آیا تھا، اور اس آیت میں مومنوں کے لئے ایمان پر ثابت قدم رہنے کی ترغیب ہے کہ جس طرح اللہ ﷻ نے حضرت نوح علیہ السلام کے اصحاب کو مخالفین کے شر اور فساد سے نجات عطا کی تھی اسی طرح اللہ ﷻ ان کو بھی مخالفین کے ضرر سے بچائے گا۔

فرمانِ نبوی ﷺ: "بے شک اللہ عزوجل ظالم کو مہلت دیتا ہے (اس کی باگ ڈھیلی کرتا ہے)، پھر جب پکڑتا ہے تو اس کو نہیں چھوڑتا۔" (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

آیت نمبر ۷۴: حضرت نوح علیہ السلام کے بعد آنے والے رسولوں کا بیان ہے۔ رسولوں کے واضح دلائل لانے کے باوجود ان کی قوموں نے انہیں جھٹلایا۔ مجرمین کا اوّلاً انکار کرنے اور اس پر ڈٹے رہنے کا بیان ہے۔ حد سے گزرنے پر ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی جس سے وہ ایمان لانے کی سعادت سے محروم ہو گئے۔

علمی بات: حضرت نوح علیہ السلام کے بعد بھی حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی آمد کا سلسلہ جاری رہا انھوں نے اپنی اپنی قوم کو پیغام حق سنایا اور اپنے پیغام کی صداقت کو دلائل و معجزات سے ثابت کیا۔ لیکن ضدی قوم نے ایک مرتبہ جس بات کو ماننے سے انکار کیا پھر اس کو ماننے سے انکاری ہی رہی۔ کوئی مضبوط اور قوی دلیل بھی انہیں اپنی بُری روش بدلنے پر آمادہ نہ کر سکی۔ ان کی اس پیہم اور مسلسل سرکشی کے باعث حق قبول کرنے کی صلاحیت ضائع ہو گئی اور ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی۔ یعنی دوسرے لوگوں کی طرح ان میں بھی نور حق دیکھنے، کلمہ حق سننے اور دعوت حق سمجھنے اور قبول کرنے کی صلاحیتیں تھیں لیکن انہوں نے اپنی بداعمالیوں سے خود ہی انہیں ضائع کر دیا۔

نوٹ: حضرت نوح علیہ السلام کے واقعہ کی مزید تفصیلات مطالعہ قرآنِ حکیم حصہ اول اور اس کے رہنمائے اساتذہ میں ملاحظہ فرمائی جاسکتی ہیں۔

آیت نمبر ۷۵: حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کو فرعون اور اس کی قوم کی طرف بھیجا گیا۔ انہوں نے اللہ ﷻ کے عطا کردہ معجزات کے ذریعے فرعون اور اس کی قوم کو ایک اللہ ﷻ کی طرف بُلایا سرکش گناہوں کے عادی آل فرعون نے تکبر کا رویہ اختیار کیا اور پیغام حق کو جھٹلایا۔

فرعون اور آلِ فرعون کی طرف اللہ ﷻ نے ایک جلیل المرتبت رسول حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو مبعوث فرمایا جن کے ذمہ دو اہم کام تھے۔ اپنی قوم بنی اسرائیل کو جو صدیوں سے مصر میں قبطیوں کے ماتحت غلامانہ زندگی بسر کر رہی تھی آزاد کرانا اور فرعون کو اللہ ﷻ کی توحید پہنچانا جو اپنے خدا ہونے کا دعوی دار تھا اور اپنی رعایا کو اپنی پرستش کرنے کا حکم دے رکھا تھا یہ دونوں کام جتنے اہم تھے اتنے ہی مشکل اور دشوار بھی تھے۔ اللہ ﷻ نے حضرت

موسیٰ علیہ السلام کو عظیم معجزات سے نوازا تاکہ وہ اُن کی قوت سے ہر باطل کو سرنگوں کر سکیں اور ان کی روشنی سے شک و شبہ کے سارے اندھیروں کو دور کر سکیں۔ جب آپ علیہ السلام نے وہ معجزات دکھائے تو ان کو جادوگر کہا گیا (معاذاللہ)۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دلائل و معجزات کی روشنی سے رب کی وحدانیت تو ان پر واضح کر دی تھی لیکن آل فرعون تکبر اور گھمنڈ کی وجہ سے اسے قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ وہ عادی مجرم تھے۔ جرم و گناہ میں بہت آگے نکل چکے تھے۔ سچائی اور نیکی کی راہ سے بہت دور نکل گئے اور مقابلہ پر اُتر آئے۔

آیت نمبر ۷۶: آل فرعون کا دعوت حق تسلیم کرنے سے انکار کا ذکر ہے۔ انکار کے لئے کوئی معقول دلیل نہ ہونے پر انہوں نے معجزات کو جادو قرار دے دیا۔ وہ حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام کے معجزات کو بھی ساحرانہ شعبدہ بازی ہی سمجھتے (معاذاللہ) اور اس فن میں آل فرعون کو تو کمال حاصل تھا اس لئے وہ اپنی دانست میں کسی ساحر کی غلامی پر رضامند ہونے کے لئے تیار نہ تھے۔

آیت نمبر ۷۷: حق کو جادو قرار دیئے جانے پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آل فرعون کو بھرپور جواب دیا۔ اُنہوں نے فرمایا کہ معجزات کا جادو سے کوئی واسطہ اور تعلق نہیں بلکہ یہ تو اللہ ﷻ کی طرف سے حق ہیں۔ اللہ ﷻ کے رسولوں کے مقابلے میں جادوگر اپنے مطلوبہ مقاصد حاصل نہیں کر سکتے۔

علمی بات: جادوگر کے سامنے کوئی بلند نصب العین نہیں ہوتا، اور نہ اس میں ایسی قوت ہوتی ہے کہ وہ زندگی کے اہم امور میں کامیاب ہو سکے وہ چند لوگوں کو اپنی چالاکیوں سے حیرت میں ڈال سکتا ہے، مگر حق و صداقت کے مقابلہ میں کسی طرح کامیابی حاصل نہیں کر سکتا، کیونکہ کسی چیز کو ثابت کرنا ایک نصب العین ہے مقدس اُسوہ ہے جبکہ جادوگری صرف فریب و دجل ہے، اس لئے قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے کہ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی تم جادوگر سمجھتے ہو تو واقعات کا انتظار کرو عنقریب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کامیابیاں اور کامرانیاں تم پر آشکارا ہو جائیں گی۔

آیت نمبر ۷۸: دلیل سے عاجز آل فرعون نے حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہما السلام کی دعوت حق کو دو وجوہات کی بنا پر ٹھکرا دیا۔

۱۔ حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہما السلام انہیں ان کے بڑوں کے عقیدے اور طور طریقوں سے ہٹانا چاہتے ہیں۔

۲۔ دونوں نبی ملک و قوم کا اقتدار حاصل کرنا چاہتے ہیں (معاذاللہ)۔

علمی بات: فرعون اور اس کے درباریوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت اور پیغام کو قبول نہ کرنے کے دو سبب بیان کیے: ایک یہ کہ ہم اس دین کو ترک نہیں کریں گے جس پر ہم نے اپنے آباء و اجداد کو عمل کرتے ہوئے پایا، گویا انہوں نے دلائل و معجزات نبوّت کے مقابلہ میں اندھی پیروی کو ترجیح دی اور اس پر اصرار کیا اور دوسرا سبب یہ بیان کیا کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام ملک مصر میں اپنی بڑائی، اپنا تسلط اور اپنا اقتدار چاہتے ہیں کیونکہ جب مصر کے رہنے والے ان کے معجزات کو دیکھ کر ان پر ایمان لے آئیں گے تو پھر سب ان ہی کے مطیع اور فرماں بردار ہوں گے۔ یوں مصر کی حکومت ان کے ہاتھ سے نکل جائیگی اور اس کے بعد صراحتاً کہہ دیا کہ ہم تمہاری بات ماننے والے نہیں ہیں۔ اس کے بعد فرعون کی قوم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ کا جادو کے زور سے مقابلہ کرنے کا ارادہ کیا تاکہ لوگوں پر یہ ظاہر کر دیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو معجزہ پیش کیا تھا وہ دراصل جادو کی قسم سے ہے پھر اس مقصد کے لئے فرعون نے جادوگروں کو جمع کیا۔

آیت نمبر ۷۹: فرعون نے تمام ماہر جادوگروں کو بلانے کا حکم دیا۔

فرعون کا جادوگروں کو بلانے کا مقصد یہ تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیش کردہ معجزوں کو جادو کے ذریعے باطل ثابت کیا جا سکے (معاذاللہ)۔

علمی بات: آدمی جب کسی حقیقت کو نہ ماننا چاہے تو اس کی یہ خواہش اس کو وہاں تک لے جاتی ہے کہ وہ احمقانہ تدبیروں سے اس حقیقت کا مقابلہ کرنے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔ وہ سیلاب کے مقابلہ میں تنکوں کا بند باندھتا ہے حالانکہ وہ خود جان رہا ہوتا ہے کہ سیلاب کے مقابلہ میں تنکوں کی کوئی حقیقت نہیں۔

چنانچہ وہی ہوا جو اللہ ﷻ کے ہاں مقدّر تھا۔ جادوگروں نے میدان میں رسیاں اور لکڑیاں پھینکیں جو دیکھنے والوں کو رینگتے ہوئے سانپ کی صورت میں دکھائی دیں۔ اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا ڈالا تو وہ بہت بڑا اژدھا بن کر میدان میں دوڑنے لگا اور آن کی آن سب رسیوں اور لاٹھیوں کو نگل گیا۔

آیت نمبر ۸۰: فرعون کے حکم کی تعمیل میں ماہر جادوگروں کا میدان میں جمع ہونے کا بیان ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے انہیں دعوت دی گئی کہ جو پیش کرنا ہے پیش کرو۔

آیت نمبر ۸۱: جادوگروں کے جادو دکھانے پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ان سے خطاب:

۱۔ اللہ ﷻ ان کے جادو کو باطل کر دے گا۔

۲۔ اللہ ﷻ فسادیوں کے کاموں کو پایہ تکمیل تک نہیں پہنچاتا۔

جادوگر فسادی اس طور تھے کہ محض دنیا کے حصول کے لئے انہوں نے جادو کا فن سیکھا جس سے وہ لوگوں کو بیوقوف بناتے تھے۔

آیت نمبر ۸۲: حق سے مراد ہے وہ بات جو دلائل سے ثابت ہو اور اٹل ہو۔ یہاں جادوگروں کی ناکامی کا بیان ہے۔ حق و باطل کے فیصلہ کن معرکہ میں اللہ ﷻ حق کی نصرت و حمایت فرماتا ہے اور باطل کو مٹا دیتا ہے۔

آیت نمبر ۸۳: شروع میں بنی اسرائیل میں محض چند نوجوانوں کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ساتھ دینے کا بیان ہے۔ باقی فرعون اور اس کے سرداروں کے مظالم کے خوف میں مبتلا تھے لہذا وہ ایمان نہ لائے۔

علمی بات: اس وقت مصر پر قبطی قوم حکمران تھی، جسے قرآن نے "آل فرعون" کہا ہے اور بنی اسرائیل ان کے محکوم تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم بنی اسرائیل کو آزادی دلوانا چاہتے تھے، لیکن بنی اسرائیل میں سے صرف چند جوانوں نے ہی آپ کی دعوت پر لبیک کہا تھا۔ دراصل غلام ہونے کی وجہ سے وہ لوگ فرعون اور اس کے سرداروں کے مظالم سے خوف زدہ تھے۔ عام طور پر ہر محکوم قوم کے کچھ شاطر لوگ اپنی قوم سے غداری کر کے حکمرانوں سے مل جاتے ہیں اور حکمران انہیں مراعات اور خطابات سے نواز کر ان کی وفاداریاں خرید لیتے ہیں۔ چنانچہ بنی اسرائیل میں سے بھی کچھ لوگ فرعون کے ایجنٹ بن چکے تھے۔ اس کی سب سے بڑی مثال قارون کی ہے۔ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں سے تھا مگر فرعون کا درباری اور اس کا ایجنٹ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف سازشیں کرتا رہتا تھا بہر حال بنی اسرائیل کے عام لوگ ایسے مخبروں کے ڈر سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قریب ہونے سے گریز کرتے تھے۔

علمی و عملی بات: حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ساتھ دینے والے نوجوانوں کو ایک طرف فرعون کا خطرہ تھا۔ دوسری طرف خود اپنی قوم کے بڑوں کی طرف سے ان کو حوصلہ افزائی نہیں ملی۔ قوم کے بڑے اگرچہ جانتے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سچے ہیں۔ مگر اپنی مصلحت اندیشی کی بنا پر وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے بیٹے بیٹیاں پرجوش طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ساتھ دیں اور اس کے نتیجہ میں وہ فرعون کے ظلم کا شکار بنیں مگر نوجوان طبقہ عام طور پر ان چیزوں سے بے پرواہ ہوتا ہے لہٰذا نوجوان طبقہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت قبول کرنے میں آگے بڑھا۔

مگر اس قسم کی صورت حال کا تقاضا یہ نہیں ہوتا کہ آدمی مخالفین حق کے ڈر سے خاموش ہو کر بیٹھ جائے۔ بلکہ وہ اُن کے مقابلہ میں اللہ ﷻ کی نصرت پر نظر رکھے وہ اللہ ﷻ کے بھروسہ پر اس حق کا ساتھ دینے کے لئے اٹھ کھڑا ہو جس کا ساتھ دینے کے لئے ذاتی طور پر وہ اپنے آپ کو عاجز اور کمزور سمجھ رہا تھا۔

آیت نمبر ۸۴: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم کے نوجوانوں کی ہمت افزائی فرمائی اور اللہ ﷻ ہی پر بھروسہ کرنے کی تلقین فرمائی۔ حقیقی ایمان والے اسباب بھی اختیار کرتے ہیں لیکن ان کا بھروسہ صرف اللہ ﷻ پر ہوتا ہے۔

آیت نمبر ۸۵: اللہ ﷻ پر توکل کرنے کے ساتھ نوجوانوں کا اللہ ﷻ کی بارگاہ میں دعا مانگنے کا بیان ہے۔ انہوں نے دعا کی کہ ظالموں کے لئے انہیں ذریعہ آزمائش نہ بنایا جائے۔

آیت نمبر ۸۶: اس آیت میں ان کی دعا کا مزید بیان ہے کہ انہیں قوم کے ظالموں کے شر سے محفوظ رکھا جائے۔

علمی و عملی بات: اس آیت میں اپنے نبی علیہ السلام کے ذریعے اللہ ﷻ ان مسلمانوں سے فرما رہا ہے کہ اگر تم واقعی اللہ ﷻ پر ایمان رکھتے ہو تو صرف اللہ ﷻ پر توکل کرو کیونکہ اسلام کا معنی ہے اللہ ﷻ کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کرنا، اور اس کے احکام کی اطاعت کرنا اور ایمان کا معنی یہ ہے کہ بندہ یہ مان لے کہ اللہ ﷻ واحد ہے اور اس کے سوا جو کچھ ہے وہ اس کی مخلوق ہے اور سب کچھ اس کے زیر تصرف اور اس کے زیر تدبیر ہے اور جب بندہ میں یہ دونوں کیفیتیں پیدا ہو جائیں گی تو وہ اپنے تمام معاملات کو اللہ ﷻ کے سپرد کر دے گا اور اس کے دل میں اللہ ﷻ پر توکل کا نور پیدا ہو جائے گا اور توکل کا معنی یہ ہے کہ بندہ اپنے تمام معاملات کو اللہ ﷻ کے سپرد کر دے اور تمام احوال میں صرف اللہ ﷻ پر اعتماد کرے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: "میری امت میں ستر ہزار آدمی ایسے ہیں جو بغیر حساب اور عذاب کے جنت میں جائیں گے، یہ وہ لوگ ہیں جو نہ جھاڑ پھونک کرتے ہیں اور نہ جھاڑ پھونک کرواتے ہیں اور نہ بدشگونی پکڑتے ہیں اور صرف اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔" (صحیح مسلم)

علمی بات: یہ دو دعائیں ظالم حاکم کے ظلم سے بچنے کے لئے اکسیر ہیں۔ پہلی دعا یہ کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں ظالم لوگوں کے لئے فتنہ نہ بنا۔ اس کے دو معنی ہوسکتے ہیں پہلا یہ کہ یا اللہ! تو ہمیں ان ظالموں کے فتنے میں ڈالنے کا سبب نہ بنانا اگر یہ ہم پر برابر مسلط رہے تو یہ اپنے سچے اور حق پر ہونے کے فتنے میں پڑ جائیں گے اور کفر میں مزید پختہ ہو جائیں گے اور سمجھیں گے کہ اگر مسلمان سچے اور حق پر ہوتے تو ان کا رب ضرور ان کی مدد کرتا۔

دوسری صورت میں معنی یہ ہو گا کہ ہمیں ان ظالموں کے سبب (مفتون) فتنے میں پڑ جانے والے نہ بنا کہ ان کے ظلم و تشدد کی وجہ سے ہمارا کوئی شخص فتنۂ ارتداد میں پڑ کر ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

علمی و عملی بات: ان لوگوں نے یہ دعا بھی کی کہ پروردگار! تو ہمیں صرف ان کے لئے فتنے کا باعث بننے ہی سے نہ بچا، بلکہ اپنی رحمت کے ساتھ ان کافروں سے ہمیں نجات اور آزادی بھی عطا فرما۔ اس دعا سے معلوم ہوا کہ اللہ ﷻ کے بندوں کو ایمان اور آخرت کی کتنی فکر تھی کہ وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ وہ کسی شخص کے کفر میں مبتلا رہنے کا باعث بنیں اور نہ یہ چاہتے تھے کہ کسی کے ظلم کی وجہ سے خود فتنے میں پڑ کر اپنا ایمان ضائع کر بیٹھیں۔

آیت نمبر ۸۷: فی الحال اپنے گھروں میں رہنے کی اور گھروں کو قبلہ رخ بنا کر مساجد کا درجہ دیئے جانے کی ہدایت دی گئی ہے۔ قبلہ سے مراد خانہ کعبہ ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والوں کو نماز کے ذریعے مدد حاصل کرنے کی تلقین کی گئی تاکہ اللہ ﷻ فرعون کے ظلم و ستم کے مقابلہ میں انہیں ثابت قدم اور صحیح رکھے۔ ایسا کرنے والوں کے لئے اللہ ﷻ کی طرف سے بہترین انجام کی بشارت دی گئی۔

علمی بات: اُس وقت خانہ کعبہ ہی قبلہ تھا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد کعبہ ہے اور کعبہ ہی حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور ان کے اصحاب کا قبلہ تھا۔ (قرطبی وروح المعانی) بلکہ بعض علماء نے فرمایا کہ تمام انبیاء علیہم السلام سابقین کا قبلہ اصل میں کعبہ ہی تھا۔

بیت المقدس تو حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور میں قبلہ بنا اور حضرت سلیمان علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد کے دور میں ہوئے۔ جیسا کہ سورۃ البقرہ ۲، آیت: ۱۴۳ میں ہے کہ: اور (اے مسلمانو!) اسی طرح ہم نے تمہیں (اعتدال والی) بہتر امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور (ہمارا یہ برگزیدہ) رسول (ﷺ) تم پر گواہ ہو، اور آپ پہلے جس قبلہ (بیت المقدس) پر تھے ہم نے صرف اس لئے مقرر کیا تھا کہ ہم (پرکھ کر) ظاہر کر دیں کہ کون (ہمارے) رسول (ﷺ) کی پیروی کرتا ہے (اور) کون اپنے الٹے پاؤں پھر جاتا ہے (یعنی پیروی سے روگردانی کرتا ہے)

علمی و عملی بات: یہاں حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے ذریعہ دو احکام بنی اسرائیل کو دیئے گئے۔ ا۔ کہ فی الحال مصر سے ہجرت نہ کریں بلکہ اپنے گھروں میں سکونت پذیر رہے۔ ۲۔ اپنے گھروں کو نماز کی جگہ بنالیں اور فی الحال عبادت گاہوں میں جا کر نماز پڑھنے کا حکم معطل ہے۔ قبلہ کے معنی عربی زبان میں مرجع یا مرکز توجہ کے ہیں۔ یہاں گھروں کو قبلہ بنانے سے مراد یہ ہے کہ بنی اسرائیل کی بستیوں میں کچھ گھروں یا گھروں کے بعض مناسب حصوں کو اس مقصد کے لئے مخصوص کر دیا جائے کہ وہاں نماز کی ادائیگی کی جائے اور بظاہر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دینی جدوجہد کے لئے بطور مرکز استعمال ہوں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی توحید و آخرت کی باتیں مصر کے بادشاہ فرعون کو سخت ناگوار تھیں۔ اس نے ان کے اوپر نہایت سخت قسم کی پابندیاں عائد کر دیں۔ یہاں تک کہ کھلے طور پر دینی سرگرمیاں جاری رکھنا ان کے لئے سخت دشوار ہو گیا۔ اس وقت حکم ہوا کہ عبادت خانوں میں جانے اور فرعون سے ٹکرانے کے بجائے یہ کرو کہ اپنے گھروں میں نماز زدا کرو اور اپنے کام کو قریبی دائرہ میں سمیٹ لو۔

غور طلب بات یہ ہے کہ ان حالات میں بھی ان کو جو دوسرا حکم دیا گیا وہ نماز کی اقامت کا تھا۔ نماز در اصل اللہ ﷻ سے نہایت قریب ہو کر اللہ ﷻ سے مدد مانگنے کا ذریعہ ہے۔ نماز میں مشغول ہو کر بندہ اپنے آپ کو عجز اور تواضع کے مقام پر لاتا ہے اور یہ ہی وہ مقام ہے جہاں بندہ اور اللہ ﷻ کی ملاقات ہوتی ہے۔ بندہ کے لئے اپنے رب سے ملنے کا اس سے بہتر کوئی مقام نہیں۔

دی گئی ہدایات کو پورا کرنے میں ان کے لئے فلاح اور نجات کا راز چھپا ہوا تھا۔ یہ حکم گویا اس بات کی خوش خبری تھی کہ اللہ ﷻ ان کو اس حالت سے نکالنے والا ہے جس میں ان کے دشمنوں نے ان کو مبتلا کر دیا ہے۔

علمی بات: حضور ﷺ کی عادت مبارک بھی یہی تھی کہ جب کوئی گھبراہٹ کا معاملہ پیش آتا تو فوراً نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے۔

آیت نمبر ۸۸: آل فرعون کی مخالفت کرنے کا بیان ہے فرعون اور آل فرعون کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جانب سے عذاب کی بددُعا کا ذکر ہے اور دعوت حق کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ فرعون اور اس کے سرداروں کی مال و دولت کی فراوانی تھی۔ اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے مال و اسباب کی تباہی اور عذاب آنے تک ایمان نصیب نہ ہونے کی بددعا کی۔

عملی پہلو: جو لوگ آخرت کی فکر کرتے ہیں وہ عام طور پر دنیوی ساز و سامان جمع کرنے میں ان لوگوں سے پیچھے رہ جاتے ہیں جو آخرت سے بے فکر ہو کر دنیا حاصل کرنے میں لگے ہوئے ہوں۔ ایسی دنیوی اسباب کی کمی آخرت کی طرف دھیان لگانے کی قیمت ہے اور سراسر دنیوی اسباب کی زیادتی آخرت سے غافل ہونے کی قیمت ہے۔

مزید یہ کہ جس کے پاس دنیا کے اسباب و سامان زیادہ جمع ہو جائیں وہ بڑائی کے احساس میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے لوگ اپنے اندر یہ صلاحیت کھو دیتے ہیں کہ کسی دوسرے کی زبان سے جاری ہونے والے حق کو پہچانیں اور اسے تسلیم کر لیں۔ اپنے وسائل کو اگر وہ اللہ ﷻ کا عطیہ سمجھتے تو اس کو حق کی تائید میں استعمال کرتے، مگر وہ اس کو اپنا ذاتی کمال سمجھتے ہیں اس لئے وہ اس کو صرف اس مقصد کے لئے استعمال کرتے ہیں کہ حق کو دبائیں اور اس ماحول کے اندر اپنی برتری اور فوقیت کو قائم رکھیں۔

علمی بات: "تاکہ وہ تیری راہ سے بھٹکائیں" کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے اللہ ﷻ کے دیے ہوئے مال و اسباب کو اس لئے استعمال کیا کہ اس کے ذریعہ سے اللہ ﷻ کے بندوں کو اللہ ﷻ سے دور کریں، انہوں نے اس کو حق کی خدمت میں لگانے کے بجائے باطل کی خدمت میں لگایا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور اس کے ساتھیوں کے سامنے سچے دین کی دعوت پیش کی اور اپنی اعلیٰ صلاحیتوں اور اللہ ﷻ کی نصرتوں کے ذریعہ اس کو اتمام حجت کی حد تک واضح کر دیا، اس کے باوجود فرعون اور اس کے ساتھیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیغام کو نہیں مانا۔ اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بددعا کی کہ اللہ ﷻ ان کے اوپر وہ سزا نازل فرما جو تیرے قانون کے تحت ایسے سرکشوں کے لئے مقدر ہے۔ یہ بددعا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قیام مصر کے بالکل آخری زمانے میں کی تھی۔ ایسے موقع پر پیغمبر کی بددعا خود اللہ ﷻ کے فیصلہ کا اعلان ہوتا ہے جو اُس کے نمائندہ کی زبان سے جاری کیا جاتا ہے۔

علمی بات: یہ بددعا صرف دینی حمیت اور دینی دل سوزی کی وجہ سے تھی یہ غصہ اللہ ﷻ و راس کے دین کی خاطر تھا۔ جب اُن کے ایمان لانے سے مایوس ہو گئے جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام کی بددعا ہے کہ الٰہی زمین پر کسی کافر کو زندہ نہ چھوڑ ورنہ وہ اوروں کو بھی بہکائیں گے اور جو نسل ان کی ہو گی وہ بھی انہیں جیسی بے ایمان و فاجر ہو گی۔

آیت نمبر ۸۹: اللہ ﷻ کی طرف سے دعا کی قبولیت کی بشارت اور چند ہدایات حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دی گئیں۔ یعنی دعوت و تبلیغ جاری رکھنے اور ثابت قدم رہنے کی تلقین فرمائی گئی ۔ نافرمانوں کی بات ماننے سے بچنے کی تلقین فرمائی گئی۔

آیت نمبر ۹۰: اس آیت میں فرعون اور اس کے لشکر کا بنی اسرائیل کا تعاقب کرنے کا ذکر ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بنی اسرائیل کو دریا پار کرائے جانے کا بیان ہے۔ یہ بتایا گیا کہ فرعون اور اس کے لشکر کو دریا کی موجوں نے گھیر لیا۔ ڈوبتے وقت فرعون نے اللہ ﷻ پر ایمان لانے کا اعلان کیا۔ مگر عین موت کے وقت ایمان لانا معتبر نہیں ہوتا۔

علمی و عملی بات: مصر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مشن دو طرفہ تھا۔ ایک تو فرعون کو توحید اور آخرت کی طرف بلانا۔ دوسرے، بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دلا کر مصر سے باہر لے جانا اور وہاں ان کی تربیت کرنا۔ جب فرعون پر دعوت حق کی تکمیل ہو چکی تو اللہ ﷻ کے حکم سے وہ بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے روانہ ہوئے۔ صحرائے سینا پہنچنے کے لئے انہیں دریا کو پار کرنا تھا۔ جب بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رہنمائی میں دریا کے کنارے پہنچے تو اللہ ﷻ کے حکم سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پانی پر اپنا عصا مارا۔ پانی بیچ سے پھٹ کر دائیں بائیں کھڑا ہو گیا اور درمیان میں خشک راستہ نکل آیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل اس راستہ سے بآسانی پار ہو گئے۔ فرعون اپنے لشکر کے ساتھ بنی اسرائیل کا پیچھا کرتے ہوئے آگے بڑھا۔ وہ دریا کے کنارے پہنچا تو دیکھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل پانی کے درمیان ایک خشک راستہ سے گذر رہے ہیں۔ دریا کے وسیع پاٹ نے پھٹ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو راستہ دے دیا تھا۔ یہ واقعہ در اصل اللہ ﷻ کی ایک نشانی تھا۔ فرعون کو اس سے یہ سبق لینا چاہئے تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام حق پر ہیں اور اللہ ﷻ ان کے ساتھ ہے۔ مگر اس نے دریا کے پھٹنے

کو اللہ ﷻ کی نشانی سمجھنے کے بجائے عام واقعہ سمجھا۔ اپنے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان فرعون کو صرف دریا نظر آیا، حالانکہ وہاں اللہ ﷻ کی قدرت کارفرما تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس واقعہ میں فرعون کے لئے اطاعت اور انابت کا پیغام تھا وہ اس کی سرکشی میں اضافہ کا سبب بن گیا۔ اس نے "دریا" کو دیکھا مگر "قدرتِ الٰہی" کو نہیں دیکھا۔ اس نے سمجھا کہ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں نے دریا کو پار کیا ہے اسی طرح وہ بھی دریا پار کر سکتا ہے۔

یہی سوچ لئے فرعون اور اس کا لشکر دریا میں داخل ہو گئے۔ دریا کا پانی جو دو حصوں پر مشتمل ہو گیا تھا، وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان ساتھیوں کے لئے ہوا تھا وہ فرعون اور اس کے ساتھیوں کے لئے نہیں۔ چنانچہ فرعون اور اس کا لشکر جب بیچ دریا میں پہنچے تو اللہ ﷻ کے حکم سے دونوں طرف کا پانی مل گیا اور فرعون اپنے لشکر سمیت اس میں غرق ہو گیا۔ غرق ہوتے ہوئے فرعون نے ایمان کا اقرار کیا مگر وہ بے سود تھا کیونکہ اللہ ﷻ کے یہاں اختیاری ایمان معتبر ہے نہ کہ وہ ایمان جب کہ آدمی ایمان غرغرہ موت کی حالت میں ہو۔

آیت نمبر ۹۱: موت کے وقت فرعون کا ایمان لانا اسے کوئی فائدہ نہ پہنچا سکا۔ جب ایمان لانے کی مہلت تھی تو وہ کفر اور معصیت پر ڈٹا رہا۔

علمی و عملی بات: ایمان اس وقت تک قبول ہے جب تک جسم میں جان ہو، اور موت کی یقینی علامات کا ظہور نہ ہوا ہو کیونکہ مقصد اپنے اختیار سے ایمان بالغیب لانا ہے اور جب عذاب سامنے آکر سب کچھ واضح ہو جائے تو پھر ایمان بالغیب باقی نہیں رہتا۔ جب عمل کی تمام امیدیں ہی منقطع ہو جائیں، تو پھر اسے ایمان کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ فرعون عمر بھر تو خدا کی نافرمانی میں مشغول رہا اور جب بحر قلزم میں غرق ہونے لگا موت سامنے دکھائی دینے لگی، اس وقت تضرع گریہ وزاری کرنے لگا اللہ ﷻ نے فرمایا اس وقت ایمان و توبہ مقبول نہیں۔

آیت نمبر ۹۲: اللہ ﷻ نے فرعون کی لاش کو محفوظ فرما کر نشان عبرت بنا دیا۔ آج بھی اس کی لاش محفوظ ہے۔ قرآنِ حکیم کی حقانیت کا بیان ہے۔ نشانیوں کو دیکھنے اور ان کا اعتراف کرنے کے باوجود اکثریت اللہ ﷻ کی طرف رجوع نہیں کرتی۔

اللہ ﷻ کی نافرمانی اور سرکشی کا انجام ہلاکت ہے، ایسے واقعات نے پیغمبروں کے دور میں بار بار انسان کے سامنے آتے رہے۔ تاہم اس قسم کے کچھ نمونہ اللہ ﷻ نے مستقل طور پر محفوظ کر دیے ہیں تاکہ وہ بعد کے زمانہ میں بھی انسان کو سبق دیتے رہیں جبکہ نبیوں کی آمد کا سلسلہ ختم ہو گیا ہو۔

علمی و عملی بات: دور حاضر کے محققین کے مطابق آج تک وہ مقام جزیرہ نمائے سینا کے مغربی ساحل پر موجود ہے جہاں فرعون کی لاش سمندر میں تیرتی ہوئی پائی گئی تھی۔ یہ جگہ آج بھی جبل فرعون کے نام سے مشہور ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں فرعون کی لاش کو سمندر نے پھینکا تھا اس کی لاش کو دیکھ کر بنی اسرائیل کو بھی اس کے ڈوب جانے کا یقین ہو گیا۔ نیز باقی لوگوں کے لئے بھی اس میں درس عبرت ہے۔ مصر میں ایسے مصالحے ایجاد ہو چکے تھے جن کے استعمال سے لاش کو گلنے سڑنے سے بچایا جا سکتا تھا اور اس زمانہ میں بادشاہوں اور امراء کی ممیوں کو حنوط (مصالحہ لگا کر محفوظ کی ہوئی (لعش وغیرہ) دیا جاتا تھا۔ چنانچہ ماہرین آثار قدیمہ نے مصر کے شاہی قبرستان سے متعدد حنوط شدہ ممیاں نکالی ہیں جو محفوظ ہیں۔ مصر کے عجائب گھر (دار الآثار) میں ایک لاش موجود ہے جس کے متعلق ماہرین اثریات (Archaeologists) کا خیال ہے کہ یہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کے فرعون یعنی رعمسیس ثانی کی لاش ہے۔ ۱۹۰۷ء میں سر گرافٹن الیٹ سمتھ نے اس کی ممی پر سے جب پٹیاں کھولی تھیں تو اس کی لاش پر نمک کی ایک تہ جمی ہوئی پائی گئی تھی جو کھارے پانی میں اس کی غرقابی کی ایک کھلی علامت تھی۔ واللہ اعلم۔ تاہم الفاظ قرآنی کی صحت اس کے ثبوت پر موقوف نہیں کہ اس کی لاش تا قیامت لوگوں کے نگاہوں کے سامنے محفوظ رہے۔

آیت نمبر ۹۳: بنی اسرائیل پر کئے گئے احسانات میں سے چند ایک کا بیان ہے۔ یعنی انہیں شام و فلسطین پر غلبہ اور بہترین رزق مہیا کیا گیا۔ مادی نعمتوں کے علاوہ روحانی نعمت کے طور پر انہیں تورات عطا کی گئی جس میں زندگی کے لئے مکمل ہدایات موجود تھی۔ مگر انہوں نے اس کے واضح واضح احکام میں آپس میں اختلاف کیا اور اللہ ﷻ کے احسان فراموشی کی روش اختیار کی روز قیامت ان کا حتمی فیصلہ اللہ ﷻ کی بارگاہ میں ہو جائے گا۔

علمی بات: بنی اسرائیل قدیم زمانہ میں اللہ ﷻ کے دین حامل تھے۔ ان کے ساتھ اللہ ﷻ نے یہ احسان کیا کہ ان کے دشمن (فرعون) سے ان کو نجات دی۔ اس کے بعد وہ ان کو سینا کی کھلی فضا میں لے گیا۔ وہاں ان کے لئے خصوصی انتظام کے تحت پانی اور رزق مہیا کیا۔ صحرائی تربیت کے ذریعہ ان کے اندر ایک نئی طاقتور نسل تیار کی۔ اس نسل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد ایک عظیم ملک فتح کیا اور شام اور اردن اور فلسطین جیسے سرسبز علاقہ میں بنی اسرائیل کی سلطنت قائم کی جو کئی سو سال تک باقی رہی۔

اس احسان کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے تھا کہ بنی اسرائیل اللہ ﷻ کے فرماں بردار اور شکر گزار رہتے اور اللہ ﷻ کے دین کی خدمت کو اپنی زندگی کا مقصد بناتے۔ مگر واضح رہنمائی کے ہوتے ہوئے انہوں نے بے راہ روی اختیار کی۔

یہ اُن کے آپس کا اختلاف تھا۔ ان کے پاس اللہ ﷻ کا اتارا ہوا علم موجود تھا جو واحد سچائی تھا۔ مگر انہوں نے اس علم کی تفسیر و تاویل کے ایسے دروازے کھولے اور باہم اختلاف اتنا شدّت اختیار کر گیا کہ وہ مختلف گروہوں میں بٹ گئے۔ (تفسیر النسفی) کوئی اُمّت جب تک اللہ ﷻ کی طرف سے نازل کردہ دینی تعلیمات پر کاربند رہتی ہے، اس میں اتفاق و اتحاد رہتا ہے۔ مگر بعد میں ان کے درمیان اس تعبیر و تشریح میں اختلافات شروع ہوتے ہیں تو ان کی ہوا اکھڑ جاتی ہیں اور وہ ٹکڑوں میں بٹ جاتے ہیں۔

علمی بات: بنی اسرائیل کئی فرقوں میں بٹ گئے اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ تورات ان کی صحیح رہنمائی کرنے کے لئے ناکافی تھی بلکہ اس کی وجہ نئے نئے فلسفیانہ مباحث پیدا کرنا، پھر آپس میں اختلاف کرنا، پھر فرقے بنانا اور اپنی اپنی چودھراہٹ کی خاطر ان کی آبیاری کرنا تھی۔ ان کے علماء و مشائخ کے حب جاہ نے ان فرقوں میں اتنا تعصب پیدا کر دیا تھا کہ ان میں اتحاد کی صورت باقی نہ رہی تھی حالانکہ اگر وہ اللہ ﷻ کی کتاب کی طرف رجوع کرتے تو وہ پھر سے متحد ہو سکتے تھے۔

عملی پہلو: آج مسلمان بھی اسی گروہ بندی و مختلف تعصبات کا شکار ہیں جس کا یہود اور نصاریٰ شکار ہو چکے تھے اور آج تک شکار ہیں۔ مختلف گروہ بھی اسی ہٹ دھرمی اور ضد کا شکار ہیں اور ہر گروہ اپنے اپنے حال میں مست اور مگن ہے۔ حب مال اور جاہ یعنی اپنی بڑائی کی خواہش اور ان مناصب سے دستبرداری مسلمانوں کے متحد ہونے میں آج بھی رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ حالانکہ آج بھی اللہ ﷻ کی کتاب اور رسول ﷺ کی سنت موجود ہے۔ اگر گروہ بندیوں سے بالاتر ہو کر اس کے واضح احکام کی طرف رجوع کریں تو بنیادی مسائل میں اتحاد کی صورت آج بھی ممکن ہے بلکہ اتحاد کی ممکنہ صورت یہی ہے کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کی طرف رجوع کیا جائے۔

نوٹ: حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کی مزید تفصیلات مطالعہ قرآنِ حکیم حصہ دوم اور اس کے رہنمائے اساتذہ میں ملاحظہ فرمائی جاسکتی ہیں۔

آیت نمبر ۹۴: اس آیت میں خطاب ان لوگوں سے ہے جو رسول اللہ ﷺ کی رسالت اور قرآنِ حکیم کے برحق ہونے میں شک کرتے تھے۔ سابقہ آسمانی کتابوں کی پیش گوئیاں قرآنِ حکیم کے برحق ہونے پر شاہد ہیں۔ قرآنِ حکیم کے برحق ہونے پر شک نہ کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

علمی و عملی بات: یہ خطاب یا تو تمام انسانوں کو ہے یا پھر نبی ﷺ کے واسطے سے اُمّت کو تعلیم دی جا رہی ہے۔ کیونکہ نبی ﷺ کو وحی کے بارے میں کوئی شک ہو ہی نہیں سکتا تھا: اس آیت کا مطلب ہے کہ قرآنِ حکیم سے پہلے کی آسمانی کتابیں (تورات و انجیل اور زبور) جن کے پاس یہ کتابیں موجود ہیں ان سے اس قرآنِ حکیم کی بابت معلوم کریں، کیونکہ ان میں اس کی نشانیاں اور آخری پیغمبر کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ آیت کے آخر میں اللہ ﷻ نے خود گواہی دی ہے کہ یہ قرآنِ حکیم برحق کتاب ہے، جسے اللہ ﷻ نے نازل کیا ہے، اس لئے کسی کو اس کی حقانیت میں ذرہ برابر بھی شبہ نہیں ہونا چاہیئے اور نہ ان لوگوں کے بارے میں ہونا چاہیئے جو اللہ ﷻ کی آیتوں کی تکذیب کرتے ہیں اس لئے کہ ان کا انجام دنیا اور آخرت میں خسارہ کے سوا کچھ نہیں ہو گا۔

آیت نمبر ۹۵: اللہ ﷻ کی آیات کی تکذیب کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ تکذیب کا راستہ خسارہ اور تباہی کی طرف لے جانے والا ہے۔

عملی پہلو: اس آیت میں ان لوگوں کو تنبیہ کی گئی ہے جن کا شعار ہی انکار ہے کہ زندگی کی فرصت کو غنیمت جانو اور انکار و سرکشی سے اب بھی باز آجاؤ ورنہ ایک ایسا وقت آنے والا ہے جب توبہ کرو گے تو توبہ قبول نہیں ہو گی جیسا کہ بُرا وقت فرعون پر آیا اور اس نے ڈوبتے وقت توبہ کی اور ایمان کا اقرار کیا لیکن اس کو کچھ بھی حاصل نہ ہوا بلکہ اس کا نتیجہ یہ ٹھہرا کہ وہ نامراد اور نیست و نابود ہو گیا اور اللہ ﷻ کی نشانیوں سے انکار کا یہی انجام ہوتا ہے۔

آیت نمبر ۹۶: اس آیت میں منکرین کے ایمان نہ لانے پر غم نہ کرنے کی تلقین ہے۔ اللہ ﷻ نے ان سے ان کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے قبول حق کی صلاحیت واپس لے لی ہے لہٰذا وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

علمی عملی بات: یعنی وہ کفر پر مریں گے اور اپنی ضد، تعصب اور ہٹ دھرمی کی بدولت انہیں ایمان لانے کی توفیق نصیب نہ ہو گی۔ (کذا فی شوکانی)۔

اللہ ﷻ نے انسان کو ایک حد تک ارادہ و اختیار دیا ہے، جس کے مطابق وہ نیکی یا بدی میں سے جس پر چاہے عمل کر سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اللہ ﷻ کو وہ سب کچھ معلوم ہے جو شروع سے اب تک واقع ہوا، اسی طرح وہ آئندہ ہونے والی ہر بات کا بھی پورا علم رکھتا ہے اور اس کی رو سے اسے پہلے ہی معلوم ہے کہ اپنے ارادہ و

اختیار کو استعمال کرتے ہوئے کون حق کو قبول کرے گا اور کون کفر کی راہ اختیار کرے گا۔ اس آیت میں اللہ ﷻ کے اس ازلی علم کو "كَلِمَتُ رَبِّكَ" کہا گیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کفر میں اور اللہ ﷻ کی نافرمانی میں اس قدر غرق ہو جاتے ہیں کہ ان کی حق قبول کرنے کی استعداد ہی ختم ہو جاتی ہے۔ چناچہ وہ کسی صورت ایمان نہیں لاتے بلکہ وہ کفر ہی پر مریں گے اور ضد، تعصب اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے انہیں ایمان لانے کی توفیق نہیں ہو گی۔

آیت نمبر ۹۷: منکرین ہر قسم کی نشانیاں دیکھنے کے باوجود بھی حق قبول نہیں کرتے۔ وہ دردناک عذاب دیکھے بغیر ایمان کا اقرار نہیں کریں گے۔ عذاب دیکھ کر ایمان لانا فائدہ مند نہیں ہو گا۔

علمی و عملی بات: نہ ماننے والوں کے پاس کتنی ہی نشانیاں آجائیں وہ ایمان لانے والے نہیں۔ کتنے ہی لوگ ہیں جو اللہ ﷻ کی آیتوں اور نشانیوں میں غور و فکر نہیں کرتے اور نہ ہی عبرت حاصل کرتے ہیں ورنہ اگر کوئی نصیحت حاصل کرنا چاہے تو عالم کے ایک ایک ذرہ میں ایسی نشانیاں موجود ہیں جن کو دیکھ کر اللہ ﷻ اور اس کی قدرت کاملہ کو پہچانا جاسکتا ہے لیکن جو لوگ جان بوجھ کر اندھے اور بہرے بنے رہیں اور دیکھنے اور سننے کی کوشش ہی نہ کریں وہ ان سے کیونکر فائدہ حاصل کر سکتے ہیں یہ لوگ ایسے مدہوش ہیں کہ اگر آنکھوں سے بھی اس عذاب کو دیکھ لیں تو بھی ماننے والے نہیں اگرچہ عذاب دیکھ کر ماننا بذات خود بھی فائدہ مند نہیں ہو سکتا۔

آیت نمبر ۹۸: قوم یونس علیہ السلام کا بیان ہے کہ اس قوم کی توبہ عذاب کی نشانیاں ظاہر ہونے کے بعد قبول کر لی گئی۔ کئی قوموں نے اللہ ﷻ کی نافرمانیاں کیں لیکن یہ واحد قوم تھی جس نے عذاب کے آثار دیکھ کر توبہ کی۔ ان کو معاف کر دیا گیا اور پھر ایک مدت تک نعمتوں سے نوازا گیا۔ ہمارے لئے یہ واقعہ سبق آموز ہے۔

علمی بات: عذاب کی دھمکی آچکی ہو لیکن وقت معین نہ کیا جا چکا ہو کہ کوئی قوم یا فرد ایمان لے آئے تو یقیناً اس کے لئے ایمان مفید ہو گا اس لئے کہ عذاب کی دھمکی تو ان کو ہر وقت سنائی جاتی رہی ہے لیکن ایسا بہت ہی کم ہوا کہ کسی قوم کو دھمکی سنائی گئی ہو اور وہ اس دھمکی کو سننے کے بعد اس کے آثار و علامات دیکھتے ہی فوراً ایمان لے آئی ہو۔ ہاں! ایک قوم یونس تھی جس نے توبہ کی اور اللہ ﷻ نے فوراً اس کے بچائے جانے کا حکم صادر فرما دیا۔

علمی بات: پچھلی آیتوں میں یہ حقیقت بیان فرمائی گئی تھی کہ کسی انسان کے لئے ایمان لانا اسی وقت کار آمد ہوتا ہے جب وہ موت سے پہلے اور عذاب الٰہی کا مشاہدہ کرنے سے پہلے ایمان لائے۔ جب عذاب آجاتا ہے تو اس وقت ایمان لانا کار آمد نہیں ہوتا۔ اس اصول کے پیش نظر اللہ ﷻ فرما رہے ہیں کہ پچھلی جتنی قوموں پر عذاب آیا ان سب کا حال یہ تھا کہ وہ عذاب کو دیکھنے سے پہلے ایمان نہیں لائے، اس لئے عذاب کا شکار ہوئے۔ البتہ ایک حضرت یونس علیہ السلام کی قوم ایسی تھی کہ وہ عذاب کے نازل ہونے سے ذرا پہلے یعنی عذاب کی علامات کو دیکھ کر ایمان لے آئی تھی۔ اس لئے اس کا ایمان منظور کر لیا گیا اور اس کی وجہ سے اس پر آنے والا عذاب ہٹا لیا گیا۔ حضرت یونس علیہ السلام کا واقعہ یہ تھا کہ جب وہ اپنی قوم کو عذاب کی پیشگوئی کر کے بستی سے چلے گئے تو ان کی قوم کو ایسی علامتیں نظر آئیں جن سے انہیں حضرت یونس علیہ السلام کے انتباہ کے سچے ہونے کا یقین ہو گیا، چنانچہ وہ عذاب کے آنے سے پہلے ہی ایمان لے آئے۔

عملی پہلو: آج اُمّت مسلمہ پر مصائب و آلام کے پہاڑ ٹوٹ رہے ہیں اور مسلمان کی حالتِ زار انتہائی ناگفتہ بہ ہے، اس کی واحد وجہ اللہ ﷻ کی نافرمانی ہے۔ ایسے میں پوری اُمّت کو اللہ ﷻ کے حضور اجتماعی توبہ کرنی چاہیئے اور تمام معاملات میں اللہ ﷻ کی فرماں برداری کی طرف آنا چاہیئے۔ امید ہے کہ اللہ ﷻ مسلمانوں کو پھر سے وہ عروج عطا فرمائے گا جو قرون اولیٰ کے مسلمانوں کو عطا فرمایا تھا۔ حضرت یونس علیہ السلام کے اس واقعہ میں ہمارے لئے بہت بڑا سبق ہے کہ وہ کس طرح اپنے بال بچوں بلکہ حیوانوں سمیت ایک وسیع میدان میں اکٹھے ہو گئے اور اللہ ﷻ کے حضور اپنے گناہوں کا اعتراف اور آہ وزاری کرنے لگے اور گریہ وزاری اتنی کثرت و اخلاص سے کی کہ اللہ ﷻ نے ان کی توبہ قبول فرمالی اور ان پر واقع ہونے والے عذاب سے انھیں نجات دے دی۔ جس انداز سے ان لوگوں نے اللہ ﷻ کے حضور آہ و رازی کی اور اپنے گناہوں سے توبہ کی اس طرح پہلے کسی قوم نے نہ کی تھی اور چونکہ توبہ اخلاص پر مبنی تھی اللہ ﷻ کے ہاں سے قبولیت کی مہر لگا دی گئی اور عذاب سے نجات مل گئی۔

نوٹ: حضرت یونس علیہ السلام کے واقعہ کی مزید تفصیلات مطالعہ قرآنِ حکیم حصہ اول اور اس کے رہنمائے اساتذہ میں ملاحظہ فرمائی جاسکتی ہیں۔

آیت نمبر ۹۹: کفار کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کو رنج نہ کرنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔ اگر اللہ ﷻ چاہتا تو روئے زمین پر سب ایمان لے آتے۔ اللہ ﷻ کی حکمت کا تقاضا ہے کہ لوگوں کے سامنے ہر طرح کی راہ کھول دی جائے۔ پیغمبر علیہ السلام پر لوگوں سے ایمان قبول کرانے کی ذمہ داری نہیں ہوتی۔

علمی بات: اس آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ایمان کوئی ایسی چیز نہیں کہ زور زبردستی سے کسی کے اندر ٹھونس دی جائے۔ یہ تو اسی کے اندر پیدا ہو گا جس میں فہم و قبول کی استعداد و صلاحیت اور طلب موجود ہوں۔ جو اس کا شوق رکھتا ہے اللہ ﷻ ایسے شخص کے لئے ایمان اور ہدایت کے راستے کھول دیتا ہے۔ دین و ایمان کے معاملہ میں جبر، زبردستی اور مجبور کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

علمی بات: حضور کی شدید خواہش تھی کہ یہ سب لوگ ایمان لے آئیں مگر اللہ ﷻ فرماتا ہے کہ اس سلسلے میں ہمارا اپنا قانون ہے اور وہ یہ کہ جو حق کا طالب ہو گا اسے حق مل جائے گا اور جو تعصب ضد اور ہٹ دھرمی پر اتر آئے گا اسے ہدایت نصیب نہیں ہو گی۔ انسانوں کو اس نے پیدا ہی امتحان کے لئے کیا ہے۔ سورۃ الملک کی ابتدائی آیت:۲ میں زندگی اور موت کی تخلیق کا یہی مقصد بتایا گیا "جس نے موت اور زندگی اس لئے پیدا فرمائی تا کہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے عمل کے اعتبار سے کون اچھا ہے"۔ لہٰذا اے نبی (ﷺ) آپ (علیہ السلام) اس معاملے میں اپنا فرض ادا کرتے جائیں، کوئی ایمان لائے یا نہ لائے اس کی پروانہ کریں، کسی کو ہدایت دینے یا نہ دینے کا معاملہ ہم سے متعلق ہے۔ اصل میں یہ ساری باتیں حضور کے دل مبارک کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے کی جارہی ہیں۔ جیسے کہ سورۃ الاعراف ۷، آیت:۲ کا مفہوم ہے کہ آپ علیہ السلام کے دل میں فرائض رسالت کے سلسلے میں کسی قسم کی تنگی نہیں ہونی چاہیئے اور ان لوگوں کے پیچھے آپ اپنے آپ کو ہلکان نہ کریں۔

آیت نمبر ۱۰۰: اللہ ﷻ کی توفیق کے بغیر کسی کو ایمان کی نعمت نصیب نہیں ہوتی۔ ایمان کی توفیق اسی کو ملتی ہے جو حق کا متلاشی ہو۔ گندگی سے مراد عقیدہ کی گندگی ہے۔ کفر و شرک پر اڑے رہنے اور ہدایت کے لئے غور و فکر نہ کرنے والوں کو ہدایت سے محروم کر دیا جاتا ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ کے حکم کے بغیر کائنات میں کچھ نہیں ہو سکتا ایمان لانے اور نہ لانے کے باب میں جو سنت الٰہی ہے یہ اس کی طرف اشارہ ہے کہ جو بھی ایمان لاتا ہے وہ اللہ ﷻ کے حکم اور اس کی توفیق سے ایمان لاتا ہے اور یہ توفیق ان کو حاصل ہوتی ہے جو اللہ ﷻ کی بخشی ہوئی عقل اور سمجھ سے کام لیتے ہیں۔ جو لوگ عقل اور سمجھ سے کام نہیں لیتے ان کی بصیرت پر اللہ ﷻ ان کے اعمال کی نجاست مسلط کر دیتا ہے جو ان کو بالکل اندھا بنا کر چھوڑ دیتی ہے اور وہ اپنی خواہشات نفس کے پیچھے ہی بھٹکتے پھرتے ہیں اور ان پر کفر کی گندگی مسلط ہو جاتی ہے۔

آیت نمبر ۱۰۱: اللہ ﷻ کی پیدا کردہ کائنات پر غور و فکر کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ غور و فکر کرنے والوں کے لئے کائنات میں بڑی نشانیاں ہیں۔ کفر اور ہٹ دھرمی میں مبتلا لوگوں کو کوئی نشانی یا وعید فائدہ نہیں دیتی لہٰذا وہ ایمان نہیں لاتے۔

علمی بات: اس کائنات کی ہر چیز کو اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو وہ اللہ ﷻ کی قدرت اور حکمت کا شاہکار ہے، اس سے نہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حیرت انگیز کارخانہ خود بخود وجود میں نہیں آیا، اسے اللہ ﷻ نے پیدا کیا ہے، بلکہ اس سے یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ جو ذات اتنی عظیم کائنات پیدا کرنے پر قادر ہے، اسے اپنی بادشاہت کے لئے کسی شریک یا مددگار کی حاجت نہیں ہے، لہٰذا وہ ایک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔

آیت نمبر ۱۰۲: اللہ ﷻ کی آیتوں اور نشانیوں کو جھٹلانے والوں کی مذمت کی گئی ہے۔ ان کو سابقہ نافرمان قوموں جیسے انجام کی وعید سنائی گئی ہے۔ مزید برآں بُرے انجام کے لئے منتظر رہنے کی تنبیہ کی گئی ہے۔

علمی بات: اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ گزشتہ اُمتوں کی طرح انتظار کر رہے ہیں کہ انبیاء سابقین علیہم السلام اپنے ادوار میں کفار کو اللہ ﷻ کے عذاب سے ڈراتے تھے اور وہ اُمتیں ان کی تکذیب کرتی تھیں اور وہ لوگ مذاق اڑاتے ہوئے یہ کہتے تھے یہ عذاب جلدی کیوں نہیں آتا اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے زمانہ کے کفار تھے وہ بھی اسی طرح کہتے تھے اس لئے فرمایا: تم بھی اس وعید کا انتظار کرو اور میں بھی اس وعید کے پورا ہونے کا انتظار کر رہا ہوں۔

علمی بات: اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ کفار پر حجت پوری ہو چکی۔ حق واضح ہو چکا۔ اب بھی وہ ایمان نہیں قبول کرتے۔ شاید وہ اس عذاب کے منتظر ہیں جو ان سے پہلے گمراہ قوموں پر نازل ہوا تھا اور انہیں ملیامیٹ کر گیا تھا۔ اگر ان کی یہی منشاء ہے تو ان کی یہ حسرت بھی پوری کر دی جائے گی۔ انہیں کہیئے کہ انتظار کریں یہاں تک کہ وہ گھڑی آجائے جو اللہ ﷻ نے ان کی ہلاکت و بربادی کے لئے مقرر کر رکھی ہے اور فرمایئے میں بھی تمہارے ساتھ اس وقت کا منتظر ہوں۔ اس وقت صادق و کاذب ظاہر ہو جائے گا۔

علمی بات: ایام سے مراد یہاں دن نہیں بلکہ وہ واقعات اور حالات ہیں جن سے پہلے لوگوں کو سابقہ پڑا تھا۔ نیز عربی میں ایام کے لفظ عذاب و احسان دونوں معنوں میں مستعمل ہوتا رہتا ہے جس طرح ارشاد باری ہے: وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰمِ اللّٰهِ ان کو اللہ ﷻ کی نعمتیں یاد دلاؤ۔

آیت نمبر ۱۰۳: حق سے مراد یہاں رحمت ہے۔ نافرمان قوموں پر عذاب آنے کی صورت میں اللہ ﷻ اپنی خاص رحمت سے رسولوں اور اہل ایمان کو بچا لیتا ہے۔

علمی و عملی بات: یعنی جیسے پہلی قوموں کے ساتھ ہماری عادت رہی ہے کہ مکذبین کو ہلاک کر کے پیغمبروں اور مؤمنین کو بچایا۔ اسی طرح موجودہ اور آئندہ مومنین کی نسبت ہمارا وعدہ ہے کہ دُنیا میں کفّار کے مظالم سے اور آخرت میں عذاب الیم سے نجات دیں گے شرط یہ ہے کہ مؤمنین ایمان کی صفات سے متصف ہوں۔ یعنی ان صفاتک کے حامل ہوں جو قرآن و حدیث میں مؤمنین کی بیان ہوئی ہیں۔

آیت نمبر ۱۰۴: مکی دور کے آخر میں قریش کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کے لئے ایک مصالحت کی پیشکش کی گئی۔ ایک معین عرصہ تک بتوں کی پرستش کرنے کی دعوت دی گئی (معاذ اللہ) اور انہوں نے کہا کہ اتنے ہی عرصے وہ بھی معبودِ واحد یعنی اللہ ﷻ ہی کی عبادت کریں گے۔ اس قسم کی مصالحت کا ہونا ناممکن ہے۔ عبادت صرف اسی معبودِ برحق کی ہوگی جس کی عبادت کا حکم ہے جس کے ہاتھ میں زندگی و موت کا اختیار ہے۔

علمی بات: اسلام کا فطرت کے مطابق ہونا اور کفر کا خلاف فطرت ہونا بالکل ظاہر ہے اس سے پہلے اللہ ﷻ نے دین اسلام کے حق اور صحیح ہونے پر اور اپنی توحید پر دلائل قائم کیئے اور سیدنا محمد ﷺ کی نبوت کی صداقت کو بیان فرمایا تھا اور اب رسول اللہ ﷺ کو یہ حکم دیا کہ وہ اپنے دین کا اظہار کریں اور یہ اعلان کریں کہ وہ مشرکین سے الگ اور علیحدہ ہیں کیونکہ مشرکین پتھروں سے تراشے ہوئے ان بتوں کی عبادت کرتے ہیں جو کسی قسم کا نقصان اور نفع پہنچانے پر قادر نہیں ہیں اور دراصل نفع اور نقصان پہنچانے پر قادر اللہ ﷻ ہی کی ذات ہے جس نے سب کو پیدا کیا ہے اور میں اسی کی عبادت کرتا ہوں۔ جو تم پر موت طاری کرے گا جس طرح اس نے تم کو زندگی دی ہے اور اس موت کے بعد پھر تم کو زندہ کرے گا۔

علمی بات: دین برحق وہ ہوتا ہے جو ایسی مضبوط دلیلوں، بے مثال محبّتوں اور لازوال حقیقتوں سے مزیّن ہوتا ہے کہ جس میں کوئی صاحب عقل شک نہ کر سکے اور مشرکین ان بُتوں کی پرستش کرتے تھے جن کو انہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا سو جو بُت اپنے وجود میں خود مشرکین کے محتاج تھے وہ ان کے خالق اور معبود کیسے ہوسکتے ہیں اور ان کی مشکلات کو کس طرح دور کرسکتے ہیں یہ ایسا خود ساختہ دین ہے جس کا ہر صاحب عقل انکار کرے گا۔ اس آیت میں پہلے غیر اللہ کی عبادت کی نفی کی پھر اللہ ﷻ کی عبادت کا اثبات کیا گیا کیونکہ پہلے بُرائی کو دور کیا جاتا ہے پھر اچھائی سے متصف کیا جاتا ہے اس کے بعد ایمان اور معرفت کا ذکر فرمایا جو تمام اعمال صالحہ کی اساس ہے۔

آیت نمبر ۱۰۵: بظاہر خطاب رسول اللہ ﷺ سے ہے لیکن مخاطب عام لوگ بالخصوص اہل ایمان ہیں۔ حنیف ایسے شخص کو کہتے ہیں جو ہر طرف سے ہٹ کر صرف ایک طرف یعنی توحید پر قائم ہو اور یہاں ہر قسم کے جاہلانہ اور مشرکانہ عقائد و نظریات کو چھوڑ کر ایک اللہ ﷻ کی عبادت کا حکم دیا گیا ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے نبی کریم ﷺ کو حکم دیا کہ دین کے معاملہ میں مستقیم رہیں جن چیزوں کا اللہ ﷻ نے حکم دیا ہے ان پر عمل کریں اور جن چیزوں سے منع کیا ہے ان سے اجتناب کریں اور اخلاص کے ساتھ صرف اللہ ﷻ کی عبادت کریں یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ عبادت اور دعا کرنے میں صرف اللہ ﷻ کی طرف توجہ کرنا واجب ہے اور جو شخص کسی غیر اللہ کی عبادت کرے یا اس سے دعا مانگے تو گویا اس نے مشرکوں کا سا کام کیا۔

عملی پہلو: ہر باطل سے خواہ وہ کسی رنگ و روپ میں ہو اس سے اپنا منہ موڑنے اور کمال یکسوئی کے ساتھ صرف اس دین حق کی طرف رخ کرنے کا حکم ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ دین اسلام قبول کر لینے کے بعد کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اپنی انفرادی یا اجتماعی، معاشی، سیاسی یا ریاستی رہنمائی کے لئے کسی اور نظام کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے۔ جب تک کتاب و سنت کا دامن مسلمانوں نے مضبوطی سے تھامے رکھا ان کے منہ سے نکلی ہوئی بات وزن رکھتی تھی۔ پوری دنیا پر مسلمانوں کی حکمرانی تھی ان کا رعب و دبدبہ دشمنوں پر قائم تھا۔

آیت نمبر ۱۰۶: اللہ ﷻ کو چھوڑ کر باطل معبودوں کو پکارنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ کسی نفع نقصان پہنچانے پر قدرت نہ رکھنے والوں کو پکارنا ظلم کا ارتکاب ہے۔ ظلم کا مطلب ہے کسی چیز کو اس کے اصل مقام سے ہٹا کر کسی اور جگہ رکھ دینا۔ خطاب بظاہر رسول اللہ ﷺ سے ہے مگر مخاطب عوام الناس بالخصوص اہل ایمان ہیں۔

علمی و عملی بات: نبی کریم ﷺ کے ذریعے اُمّت کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ کفار و مشرکین کو دوٹوک الفاظ میں یہ بتادیں کہ مومن بتوں کے سامنے نہیں جھک سکتا، اس کی پیشانی تو اس اللہ ﷻ کے سامنے جھکے گی جس کی جانب سے یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہر آن مومن رہو اور خلوص کے ساتھ توحید سے وابستہ رہو، مومن شخص ان خداؤں کو ماننے کے لئے تیار نہیں، جو نہ نفع پہنچا سکیں اور نہ ضرر سے بچا سکیں کیونکہ یہ انسانی عقل و دانش، انسانی شرافت و عظمت اور انسانی عزت و حرمت پر ظلم

ہے کہ جس پیکر انسانی کو اللہ ﷻ نے فضل و کمال سے نواز کر احسن تقویم بنایا ہو اسے بے جان اور غیر متحرک پتھروں کے سامنے جھکایا جائے، وہ انسان جو اس لئے پیدا ہوا ہے کہ کائنات میں حکومت کرے، اور اللہ ﷻ کا خلیفہ ثابت ہو، وہ اگر دنیا کی حقیر اور بے حقیقت چیزوں کے سامنے اپنی جبین کو عبادت کے لئے جھکا دے، تو اس سے بڑھ کر ظلم اور کیا ہو سکتا ہے۔

آیت نمبر ۱۰۷: خیر اور شر کا اختیار صرف اللہ ﷻ کے پاس ہے۔ کسی تکلیف کو اللہ ﷻ کے سوا کوئی دور نہیں کر سکتا۔ اسی طرح اللہ ﷻ کسی کے لئے بھلائی کا ارادہ فرمادے تو اس کے فضل کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔ اللہ ﷻ ہی کی طرف رجوع کرنے والوں کے لئے بخشش اور مہربانی کی بشارت دی گئی۔

علمی بات: نفع و نقصان کا مالک صرف اللہ ﷻ ہے۔ نفع و نقصان سوائے اللہ ﷻ کے کسی کے اختیار میں نہیں، قرآنِ حکیم میں اس مضمون کو خوب وضاحت سے بیان فرمایا ہے کہ اللہ ﷻ ہی حقیقی اور دائمی مدد گار ہے۔ اُسی کو مشکلات میں پکارنا چاہیئے اور اُسی سے اُمیدیں وابستہ کرنی چاہئیں۔ سیدنا حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ سوار تھا، آپ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ اے پیارے بیٹے اللہ ﷻ کے حقوق کی پابندی کرو، اللہ ﷻ تمہاری محافظت کرے گا، جب بھی سوال کرنا ہو تو اللہ ﷻ ہی سے کرو اگر اللہ ﷻ کی طرف سے تیرے لئے اچھائی مقدر ہے تو تمام کائنات اس کو روک نہیں سکتی اور اگر بُرائی مقدر ہے تو کوئی اس کو ٹال نہیں سکتا۔ قلم تقدیر جو کچھ لکھ چکا وہی ہو گا اور تقدیر کے صحیفے بھی خشک ہو چکے ہیں (جامع ترمذی)

علمی بات: یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ ہر قسم کا نقصان اور ہر طرح کا نفع، اللہ ﷻ کی قدرت اور اس کی قضاء و قدر کے تحت واقع ہوتا ہے اس میں کفر و ایمان، اطاعت و معصیت، راحت و مصیبت، آلام و لذات سب داخل ہیں اور جس شخص کے لئے اللہ ﷻ کسی مصیبت کو مقدر کر دے تو اللہ ﷻ کے سوا کوئی اس کو دور کرنے والا نہیں ہے اور جس شخص کے لئے اللہ ﷻ کسی راحت کو مقدر کر دے تو اس کو کوئی چھیننے والا نہیں ہے آیت کے پہلے حصہ میں یہ فرمایا ہے کہ وہی تکلیفوں کو دور کرنے والا ہے اور دوسرے حصہ میں یہ فرمایا ہے کہ وہی خیر عطا کرنے والا اور فضل فرمانے والا ہے اور اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اصل مقصود خیر پہنچانا ہے ضرر پہنچانا نہیں ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں ہے: اللہ ﷻ نے مخلوق کو پیدا کرنے سے پہلے ایک کتاب میں لکھ دیا کہ میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔ (صحیح بخاری) مگر لوگ خود اپنا نقصان کرتے ہیں۔

آیت نمبر ۱۰۸: رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ پوری نوع انسانی کو خطاب ہے۔ حق سے مراد قرآنِ حکیم اور دین اسلام ہے۔ حق کو اختیار کرنے والے کامیاب اور گمراہی اختیار کرنے والے کا وبال اسی پر ہو گا۔ پیغمبر علیہ السلام کے ذمہ حق منوانے کی ذمہ داری نہیں۔ داعی حق کی حیثیت اور ذمہ داری کو واضح کر دیا گیا۔

علمی بات: جب دین اسلام اور اس کے اصول کی حقانیت ظاہر ہو گئی تو بطور اتمام حجت کافروں سے خطاب ہے کہ دیکھو تمہارے پاس دین حق آگیا اور نبی علیہ السلام کے ذریعہ سے تم تک پہنچ گیا اور اللہ ﷻ کی حجت تم پر پوری ہو گئی اب تم حق تعالیٰ کے سامنے اپنی گمراہی کا کوئی عذر اور حیلہ پیش نہیں کر سکتے۔ اب اگر اس سے ہدایت حاصل کر لو تو تمہارا ہی فائدہ ہے ورنہ تمہارا ہی نقصان ہے رسول کا کام خبر دے دینا ہے وہ کسی سے حق قبول کرانے کے ذمہ دار نہیں اور اس کے بعد آپ ﷺ کو صبر کرنے اور وحی کی پیروی کرنے کا حکم دیا جس سے مقصود آپ ﷺ کی تسلی ہے کہ اگر یہ منکرین آپ علیہ السلام کی دعوت قبول نہ کریں۔ اگر یہ برابر اسی سابقہ عداوت اور ایذا رسانی پر قائم رہیں تو آپ علیہ السلام صبر کیجئے عنقریب اللہ ﷻ فیصلہ فرمادے گا یعنی حسب وعدہ آپ ﷺ کو غالب اور منصور کرے گا۔ یہ مضمون گویا کہ تمام سورت کا خلاصہ ہے۔

آیت نمبر ۱۰۹: رسول اللہ ﷺ اور اہل ایمان کو قرآنِ حکیم کی پیروی اور حق پر جمے رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔ داعی حق کو مشکلات پر صبر کرنے اور ثابت قدم رہنے کی تاکید کی گئی ہے۔ حق و باطل کے درمیان اللہ ﷻ کی طرف سے فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔

علمی بات: نبی علیہ السلام کو تلقین ہے کہ آپ ﷺ تو اس چیز کی پیروی کیجئے جو آپ علیہ السلام کی طرف وحی کی جاتی ہے آپ علیہ السلام لوگوں تک اللہ ﷻ کا پیغام پہنچا دیجئے چاہے کوئی مانے یا نہ مانے اور اگر تبلیغ اور دعوت اسلام پر یہ لوگ آپ کو ایذا پہنچائیں تو آپ علیہ السلام صبر کیجئے یہاں تک کہ خود اللہ ﷻ فیصلہ کرے کہ حق کو غلبہ دے اور کفر کو ذلیل و خوار کرے اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔ اس لئے کہ وہ ظاہر و باطن، ماضی، حال اور استقبال سب کو یکساں جانتا ہے اور اس کے حکم اور فیصلہ میں بھول چوک اور غلطی کا ہرگز امکان نہیں۔ لہٰذا اے نبی کریم ﷺ! آپ علیہ السلام ان دشمنوں کی ایذا رسانیوں پر صبر کیجئے۔ اور اللہ ﷻ کے فیصلہ کا انتظار فرمائیے۔ وہ ان شاء اللہ حسب وعدہ آپ علیہ السلام کو فتح و نصرت عطا کرے گا۔

سُوْرَۃُ هُوْد

ربط سورت:

سورۂ ھود کے مضامین سورۃ یونس کے مضامین سے ملتے جلتے ہیں، البتہ سورۃ یونس میں جن پیغمبروں کے واقعات مختصر بیان ہوئے تھے، اس سورت میں انہیں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ خاص طور پر حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ہود علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام، حضرت شعیب علیہ السلام، اور حضرت لوط علیہ السلام کے واقعات زیادہ تفصیل سے انتہائی بلیغ اور موثر اسلوب میں بیان فرمائے گئے ہیں۔

سورت کا اختتام اللہ ﷻ کی توحید، قرآن کریم کی حقانیت اور حضرت سیدنا محمد مصطفیٰ ﷺ کی نبوت کی صداقت اور اسلام کے پیغام پر ہوتا ہے، جس میں قیامت، حساب وکتاب، جزا وسزا اور قرآنِ حکیم کے اعجاز کا تفصیلی طور پر ذکر ہے نیز کتاب اللہ کی آیات کے محکم ہونے کا بیان ہے جیسا کہ سورۃ یونس کا اختتام بھی اسی قسم کی آیات پر ہوا ہے۔

گزشتہ سورت کے آخر میں فرائضِ خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ ﷺ کا ذکر تھا۔ اس سورۃ کی ابتداء میں بھی فرائض خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ ﷺ کا ذکر ہے۔

گزشتہ سورت کے آخر میں صداقت قرآنِ حکیم کا ذکر تھا۔ اس سورت کی ابتداء میں بھی صداقت قرآنِ حکیم کا ذکر ہے۔

گزشتہ سورت کے آخر میں دلیل وحی کے ساتھ توحید خداوندی کا ذکر تھا۔ اس سورت کے شروع میں دلیل عقلی کے ساتھ توحید خداوندی کا ذکر ہے۔

سورت ھود میں اتمام حجت کے بعد توبہ اور استغفار کی دعوت دی گئی ہے۔ دعوت مسترد کرنے کی صورت میں ہلاکت کی وعید سنائی گئی ہے۔

آیت نمبر ۱: محکم کے معنی مضبوط اور اٹل کے ہیں۔ مضبوط کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اس میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں وہ دلائل کے لحاظ سے مضبوط اور مکمل ہیں اور ان میں کوئی نقص نہیں ہے۔ قرآنِ حکیم کی آیات محکم ہیں جن پر عمل پیرا ہونے پر لوگوں کو فلاح نصیب ہوتی ہے۔ ابتدا میں اس کلام کی آیات جامع اور گہرے مفہوم کی حامل تھیں۔ بعد میں ان آیات کی وضاحت نازل فرمادی گئی۔ قرآنِ حکیم حکیم وخبیر ہستی نے نازل فرمایا ہے۔

علمی بات: یعنی یہ قرآن حکیم وہ جلیل القدر اور عظیم الشان کتاب ہے جس کی آیتیں لفظی ومعنوی ہر اعتبار سے نہایت مستحکم ہیں۔ نہ کوئی مضمون حکمت اور واقعہ کے خلاف ہے نہ ہی اس کی معجزانہ فصاحت وبلاغت پر نکتہ چینی ہو سکتی ہے۔ جس مضمون کو جس عبارت میں ادا کیا ہے اس سے بہتر تعبیر ناممکن ہے۔ یہ آیات جن اصول وفروع، اخلاق واعمال، قیمتی وعظ اور نصیحت پر مشتمل ہیں نیز جو دلائل کسی بھی بات کے اثبات کے لئے دیئے گئے ہیں وہ سب علم وحکمت کے پیمانوں سے گزرے ہوئے ہیں۔ قرآنی حقائق ودلائل ایسے مضبوط ومحکم ہیں کہ زمانہ کتنا ہی تبدیل ہو جائے ان حقائق کے بدلنے یا غلط ہونے کا کوئی امکان تک نہیں۔ موقع بہ موقع دلائل توحید، احکام، مواعظ، قصص، ہر چیز بڑی خوبصورتی اور قرینہ سے الگ الگ رکھی ہے اور تمام ضروریات دینی ودنیوی کا بالتفصیل بیان ہے۔ قرآنِ حکیم میں نزولی اعتبار سے بھی یہ حکمت رہی ہے کہ پورا قرآن یک دم نہیں اُتارا گیا بلکہ وقتاً فوقتاً موقع ومصلحت کے لحاظ سے آیات کا نزول ہوتا رہا۔ قرآنِ حکیم میں ان تمام خوبیوں کو یکجا دیکھ کر آدمی حیران رہ جاتا ہے۔ مگر اس میں حیرت زدہ ہونے کی کوئی بات نہیں کیونکہ حکیم مطلق کے برحق کلام میں یہ سب حکمتیں اور خوبیاں جمع نہ ہوں تو اور کس کے کلام میں جمع ہو سکتی ہیں جب کہ مخلوق کا کلام بہت سی اغراض مفسدہ اور اغلاط کے ساتھ ساتھ ناتمام اور نامکمل ہوتا ہے۔

آیت نمبر ۲: قرآنِ حکیم کا بنیادی پیغام پوری نوع انسانی کو صرف اللہ ﷻ کی بندگی کرنے کی دعوت دینا ہے۔ تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی مشترکہ دعوت ایک اللہ ﷻ کی عبادت تھی۔ یعنی اس محکم ومفصل کتاب کے نازل کرنے کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ دنیا کو صرف اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کی دعوت دی جائے اور بندگی کے آداب سکھائے جائیں۔ اسی عظیم المرتبت کام اور مقصد کے لئے پہلے انبیاء کرام علیہم السلام تشریف لاتے تھے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: اور ہم نے آپ (ﷺ) سے پہلے جو بھی رسول بھیجے ان کو یہی وحی فرمائی کہ میرے (اللہ کے) سوا اور کوئی معبود نہیں پس میری ہی عبادت کرو۔ (سورۃ الانبیآء ۲۱، آیت: ۲۵) نیز سورۃ النحل میں ارشاد فرمایا گیا کہ "یقیناً ہم نے ہر اُمت میں ایک رسول بھیجا (اس پیغام کے ساتھ) کہ اللہ کی عبادت کرو اور شیطان (کے راستے) سے بچو۔" (سورۃ النحل ۱۶، آیت: ۳۶) تمام انبیاء ورسل علیہم السلام توحید کی دعوت قبول کرنے والوں کو دنیا وآخرت کی بشارت دیتے اور انکار کرنے والوں کو دنیا وآخرت کے بُرے انجام سے ڈراتے تھے۔

علمی بات: ان آیات میں رسول کریم ﷺ سے ارشاد فرمایا ہے کہ آپ تمام عالمِ انسانیت کو بتادیجئے کہ میں اللہ ﷻ کی طرف سے تم کو ڈرانے والا اور خوشخبری دینے والا ہوں، میں اللہ ﷻ کی نافرمانی اور خواہشاتِ نفسانی کا اتباع کرنے والوں کو اللہ ﷻ کے عذاب سے ڈراتا ہوں اور اطاعت گذار اور نیک لوگوں کو آخرت کی نعمتوں اور دونوں عالم کی راحتوں کی خوشخبری دیتا ہوں۔

علمی بات: نذیر کا ترجمہ ڈرانے والے کا کیا جاتا ہے لیکن یہ لفظ ڈرانے والے دشمن یا دوسرے نقصان پہنچانے والوں کے لئے نہیں بولا جاتا، بلکہ نذیر اس شخص کے لئے بولا جاتا ہے جو کسی اپنے عزیز کو شفقت و محبت کی بناء پر ایسی چیزوں سے ڈرائے اور بچائے جو اس کے لئے دنیا یا آخرت یا دونوں میں نقصان پہنچانے والی ہیں۔

آیت نمبر ۳: اس آیت میں استغفار اور توبہ کی ترغیب دی گئی ہے۔ ایسا کرنے والوں کو متاع حَسَن سے نوازا جائے گا۔ متاع حسن سے مراد حلال و پاکیزہ رزق، قلبی سکون و اطمینان اور نیک اعمال ہیں چنانچہ نیک اعمال کی کثرت کرنے والوں کو اللہ ﷻ اپنے فضل سے زیادہ عطا فرمائے گا اور حق سے اعراض کرنے اور گناہوں کی بخشش نہ مانگنے والے بڑے عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ یوم کبیر سے یا تو روز قیامت مراد ہے یا عذاب کا کوئی دن۔

علمی بات: ماضی کے گناہوں پر ندامتِ قلب کے ساتھ گناہوں سے رک جانا اور مستقبل میں نہ کرنے کا عزم، یہ توبہ ہے۔ جب کہ ماضی کے گناہوں کی معافی مانگنا "استغفار" ہے۔ توبہ اور استغفار میں فرق یہ ہے کہ جو گناہ ہو چکے ان پر صدقِ دل سے معافی مانگنا استغفار اور پچھلے گناہوں پر ندامتِ قلبی کے ساتھ ساتھ آئندہ گناہ نہ کرنے کا عہد کرنا توبہ ہے گویا "توبہ" اصل منزل ہے جب کہ توبہ کی طرف جانے والا راستہ "استغفار" ہے۔

عملی پہلو: اس آیت سے معلوم ہوا کہ اخلاص کے ساتھ توبہ و استغفار کرنا عمر میں برکت اور رزق میں وسعت کے لئے بہترین عمل ہے۔

علمی بات: خلاصہ یہ کہ جس نے اپنے گناہوں سے پکی توبہ کی اور اخلاص کے ساتھ رب تعالیٰ کا عبادت گزار بندہ بن گیا تو اللہ ﷻ اسے کثیر رزق اور وُسعتِ عیش عطا فرمائے گا۔ جس کی وجہ سے وہ امن و راحت کی حالت میں زندگی گزارے گا اور اللہ ﷻ اس سے راضی ہو گا۔

علمی بات: یہاں بتایا جارہا ہے کہ اگر تم نے اللہ ﷻ کی توحید کا اعتراف اور اپنے گناہوں پر استغفار کیا نیز بقیہ زندگی میں اسی کے ہو کر رہے تو، سکون قلبی و راحت باطنی اور فوز و فلاح دنیوی و اُخروی سے سرفراز کر دیا جائے گا نیز واضح رہے کہ اللہ ﷻ حسب مصلحت دنیاوی ضرورتوں کو پورا فرمائے گا اور اللہ ﷻ کا بن جانے کا یہ مقصد تو نہیں کہ انسان جائز ضروریات اور خواہشات سے محرومیوں کا شکار ہو جائے بلکہ جو سچے دل سے اس کا ہو جاتا ہے اس کے لئے رحمت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ اور اُسے سچی اور حقیقی خوشیوں اور حقیقی کامرانیوں سے بہرہ مند کیا جاتا ہے۔

علمی بات: یعنی ہر نیک انسان کو اس کے اعمال حسنہ کی جزاء اللہ ﷻ اپنے فضل و کرم سے عطا فرماتا ہے نیکیوں میں جتنا کوئی بڑھتا جائے گا اسی قدر اللہ ﷻ اسے اپنے اعلیٰ خزانوں سے مالا مال کرتا جائے گا۔

عملی پہلو: گناہوں پر اصرار اور بے راہ روی کی روش اختیار کرنے والوں اور گزشتہ پر سچے دل سے نادم نہ ہونے والوں کا انجام اچھا نہیں ہوتا، ایسا نہ ہو کہ ایسے لوگ قیامت کے دن عذاب میں مبتلا کر دیے جائیں۔ لہٰذا اپنی غلطیوں کی اصلاح کرتے ہوئے صدقِ دل سے توبہ و استغفار کرتے رہنا چاہیئے۔

آیت نمبر ۴: ہر شخص کو اللہ ﷻ ہی کی طرف لوٹنا ہے۔ اللہ ﷻ دین حق سے اعراض کرنے والوں کو سزا دینے کی پوری قدرت رکھتا ہے۔

علمی بات: کسی مجرم کو سزا دینے کے لئے دو باتوں کی ضرورت ہوتی ہے پہلی یہ کہ مجرم حاضر ہو، دوسری یہ کہ سزا دینے والا قدرت و اختیار رکھتا ہو چنانچہ اللہ ﷻ دعوت حق پر لبیک سے اعراض کرتے ہوئے سیدھی راہ سے منہ پھیرنے والوں کو اپنے پاس حاضر کرنے کی قدرت بھی رکھتا ہے اور اسے سزا دینے کا بھی مکمل اختیار رکھتا ہے چنانچہ مجرموں کو اپنے انجام بد سے ضرور ڈرنا چاہیئے۔

آیت نمبر ۵: اللہ ﷻ کے علم کی وسعت کا بیان ہے۔ اس آیت کا ایک مفہوم یہ ہے کہ کفار و مشرکین اپنا بغض و دشمنی چھپا نہیں سکتے۔ کسی چیز کو مخفی رکھنے کی کتنی ہی کوشش کر لی جائے اللہ ﷻ سے کوئی چیز مخفی ہو ہی نہیں سکتی۔ اللہ ﷻ دلوں کے ارادوں سے بھی خوب واقف ہے۔

علمی بات: آیت کا مقصد اللہ ﷻ کے علم وسیع کا بیان ہے چنانچہ اس میں اللہ ﷻ کے متعلق مشرکین کے جہل اور لاعلمی کی انتہا بیان ہوئی ہے۔ کفار مکہ کے بارے میں خبر دی جارہی ہے کہ بعض کفار مکہ رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کرتے تھے لیکن جب اس کے جواب میں قرآن نازل ہوتا تو یہ سمجھتے کہ کوئی کاری باتیں سن کر بتلا دیتا

ہے لہذا کپڑا اوڑھ کر دوہرے ہو کر باتیں کرتے۔ انہی کفار کو بتایا جارہا ہے کہ تم اللہ ﷻ اور اس کے رسول ﷺ سے اپنی حقیقت چھپانے کی ہزار کوشش کرو تب بھی کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ وہ اللہ ﷻ ایسی پاک ذات ہے جو تمہارے ظاہر کو بھی جانتا ہے اور تمہارے باطن کو بھی۔ جو تمہارے ان اعمال کو بھی دیکھ رہا ہے جو تم چھپا کر کرتے ہو اور ان کو بھی جن کا تم برملا ارتکاب کرتے ہو۔ وہ تو ایسا باخبر ہے جس سے تمہارے سینوں میں چھپا ہوا کوئی راز بھی مخفی نہیں رہ سکتا۔

علمی بات: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ تین آدمی بیت اللہ کے پاس اکھٹے ہوئے، (ان میں سے) دو قریشی تھے اور ایک ثقفی تھا، یا دو ثقفی تھے اور ایک قریشی تھا، ان کے دلوں کا فہم کم تھا، ان کے پیٹوں کی چربی بہت تھی۔ ان میں سے ایک نے کہا: کیا تم سمجھتے ہو کہ جو کچھ ہم کہتے ہیں، اللہ ﷻ سنتا ہے؟ دوسرے نے کہا: اگر ہم اونچی آواز سے بات کریں تو سنتا ہے اور آہستہ بات کریں تو نہیں سنتا۔ تیسرے نے کہا: اگر ہم اونچا بولیں تو وہ سنتا ہے تو پھر ہم آہستہ بولیں تو بھی سنتا ہے۔ اس پر اللہ ﷻ نے (یہ آیتیں) نازل فرمائیں: اور تم (تو گناہ کرتے وقت) اس (خوف) سے بھی پردہ نہیں کرتے تھے کہ تمہارے خلاف گواہی دیں گے تمہارے کان تمہاری آنکھیں اور تمہاری کھالیں لیکن تم تو گمان کرتے تھے کہ اللہ (تمہارے) بہت سے (اعمال) جانتا ہی نہیں جو تم کرتے ہو۔ اور تمہارے (اسی) گمان نے جو تم اپنے رب کے بارے میں کیا کرتے تھے تمہیں ہلاک کر دیا پس تم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو گئے۔ (سورۃ حٰم السجدۃ ۱۶، آیات: ۲۲، ۲۳) (صحیح مسلم، جامع ترمذی، مسند احمد)

علمی بات: اس سے معلوم ہوا کہ کچھ جاہل مشرکین یہ بھی سمجھتے تھے کہ آہستہ بات کریں تو اللہ ﷻ کو پتا نہیں چلتا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ اللہ ﷻ کو مانتے تھے البتہ جب بھی اللہ ﷻ کی ناراضگی والا کوئی کام کرتے تو خوب چھپ کرتے کہ اللہ ﷻ سے چھپے رہیں، اسے پتا نہ چل جائے۔ لیکن وہ تو ایسی ہستی ہے کہ کائنات کی کوئی چیز اُس سے مخفی نہیں۔

آیت نمبر ۶: زمین پر چلنے پھرنے اور رینگنے والے جانوروں کو دابہ کہا جاتا ہے، پرندے بھی اسی میں داخل ہیں۔ نیز ہر جاندار کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے چنانچہ ہر جاندار مخلوق کا رزق اللہ ﷻ کے ذمہ ہے اور یہ رزق طے شدہ ہے۔ ہر مخلوق کا عارضی اور مستقل ٹھکانہ اللہ ﷻ کے علم میں ہے۔ مخلوق کے ذمہ عبادت کا فریضہ ہے۔ رازق اللہ ﷻ ہے۔ اور لوح محفوظ میں ہر بات لکھی ہوئی ہے۔

علمی بات: اس آیت میں اللہ ﷻ نے ارشاد فرمایا کہ زمین پر چلنے والے جتنے جاندار ہیں، وہ ان سب کو ان کی تخلیق و تکوین کے مطابق روزی پہنچاتا ہے، یہ اس کا اٹل وعدہ ہے جو بطور احسان پورا کرتا رہتا ہے۔ جب وہ ایک ایک جاندار کو روزی پہنچاتا ہے، دنیا میں ان کی جگہوں کو اور قبل از پیدائش اور موت کے بعد بھی ان کے ٹھکانوں کو جانتا ہے تو پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ ان کے اقوال و افعال اور ان کے دیگر تمام احوال و کوائف سے بے خبر رہے؟ اسے سب خبر ہے اور لوح محفوظ میں ہر بات لکھی ہوئی ہے۔

رزق کے حوالہ سے اللہ ﷻ پر توکل کی فضیلت: ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "اور کتنے ہی چلنے والے (جاندار) ہیں جو اپنا رزق نہیں اٹھاتے، اللہ انہیں رزق دیتا ہے اور تمہیں بھی اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔" (سورۃ العنکبوت ۲۹: آیت: ۶۰)

احادیث مبارکہ کی روشنی میں توکل کی اہمیت: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر تم اللہ ﷻ پر اس طرح توکل کرو، جیسا اس پر توکل کرنے کا حق ہے تو وہ تم کو اس طرح رزق دے گا، جیسے پرندے کو روزی دیتا ہے، کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ پرندہ صبح خالی پیٹ ہوتا ہے اور شام کو سیر و سیراب۔ (مسند احمد)

۲۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بیشک میرے دل میں جبرائیل امین علیہ السلام نے یہ بات ڈال دی ہے کہ اس وقت تک کسی شخص کو موت نہ آئے گی جب تک کہ وہ اپنا رزق پورا نہ کرلے، سو تم لوگ اللہ ﷻ سے ڈرو اور رزق طلب کرنے میں خوبی کا خیال رکھو اور رزق ملنے میں دیر ہو جائے تو اللہ ﷻ کی نافرمانیوں کے ذریعہ طلب نہ کرو کیونکہ اللہ ﷻ کا فضل اس کی نافرمانی کے ذریعہ حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ (مستدرک الحاکم)

۳۔ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ رزق بندہ کو اسی طرح طلب کرتا ہے جس طرح سے موت ڈھونڈتی ہے۔ (ابن حبان، البزار)

۴۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے کہ: اگر ابن آدم اپنے رزق سے اس طرح بھاگے جیسے موت سے بھاگتا ہے تب بھی اس کا رزق اسے پالے گا جیسے موت اسے پالیتی ہے۔ (سلسلۃ الصحیحہ)

۵۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ایک کھجور پڑی ہوئی دیکھی آپ ﷺ نے اسے لے لیا وہاں پر ایک سائل موجود تھا وہ کھجور آپ ﷺ نے اسے عطا فرمادی۔ (الطبرانی)

اللہ ﷻ کی رزاقیت اور وسعت علم: اس آیت سے جہاں اللہ ﷻ کی کمال رزاقیت کا پتہ چلتا ہے وہاں اس کے وسعت علم کی بھی خبر ملتی ہے اللہ ﷻ کی طرف سے رزق کی فراہمی کا عمومی ذریعہ یہ ہے کہ اس کے اسباب پیدا فرما کر انسان کو رزق عطا فرماتا ہے اس طور پر کہ وہ آسمان سے بارش برساتا ہے جس سے زمین میں ہر طرح کی نباتات اُگتی ہے، پھر اسی نباتات میں شامل مختلف غلّہ جات، پھولوں، فصلوں اور پھلوں وغیرہ سے ہر جاندار کو بالواسطہ یا بلاواسطہ یا روزی مہیا ہوتی ہے اور ہر جاندار کی جملہ ضروریات زندگی اسی زمین سے پوری ہو رہی ہیں اور اللہ ﷻ جتنی بھی مخلوق پیدا فرماتا ہے تو اس کے مطابق زمین بھی اپنے نئے سے نئے خزانے اگلتی جارہی ہے اور آئندہ بھی رزق کا ذمّہ اللہ ﷻ نے لیا ہے۔ تاہم اس رزق کے حصول کے لئے اس نے اسباب و وسائل اختیار کرنے کا بھی حکم دے دیا ہے اور جب کوئی انسان یا جاندار اسباب اختیار کرنے سے عاجز ہو تو اللہ تعالیٰ خود ہی وہ اسباب بھی فراہم کر دیتا ہے جو اس نے پیدا فرمائے ہیں۔

قحط اور بھوک کی وجوہات: یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر رزق کی فراہمی اللہ ﷻ کے ذمے ہے تو قحط سے یا بعض دوسری وجوہ سے انسان ہزاروں کی تعداد میں مر کیوں جاتے ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ قحط تو اللہ ﷻ کا عذاب ہے جو لوگوں کی نافرمانیوں کی وجہ سے انسانوں پر مسلط کیا جاتا ہے اور دوسری وجوہ جیسے آزمائش یا بعض انسانوں کا دوسروں پر ظلم و زیادتی کرنا اور معاشی وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم کی بنا پر ایسے حادثات وجود میں آتے ہیں اور یہ سب کچھ انسانوں کے کسب اعمال کا ہی نتیجہ ہوتا ہے ورنہ اللہ ﷻ کی طرف سے جانداروں کے رزق میں کمی کا تصور بھی محال ہے۔ بلکہ ناشکری اور ظلم و زیادتی وغیرہ ایسے اسباب ہیں جن کی وجہ سے انسان ان نعمتوں سے محروم کر دیا جاتا ہے۔

خاندانی منصوبہ بندی اور رزق: آج عالمی سطح پر یہ ڈھنڈورا پیٹا جارہا ہے کہ دنیا کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے اور وسائل رزق اس کے مساوی نہیں لہٰذا خاندانی منصوبہ بندی اور افزائش نسل پر کنٹرول ضروری ہے اس سلسلہ میں آج کے ماہرین معاشیات کی کج فہمی و کوتاہ نظری اور فطرت سے جنگ کے نتیجہ میں ان کی ناکامی کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ جہاں جہاں ایسے محکمے قائم کیے جارہے ہیں وہاں شرح پیدائش میں اضافہ دیکھنے میں آرہا ہے اسی طرح مرد و زن میں تناسب کے اعتبار سے فرق نمایاں تر ہوتا جارہا ہے اور عجیب اتفاق ہے کہ لوگ بھی پہلے سے زیادہ آسودہ اور خوشحال ہیں جس کا موازنہ ہر شخص اپنی پچاس سال پہلے کی زندگی سے کر سکتا ہے ان مادہ پرست ماہرین کے فکر کی اصل وجہ محض اللہ ﷻ کی رزاقیت پر عدم توکل ہے ورنہ اللہ ﷻ تو آبادی کی افزائش کے ساتھ ساتھ زمین کے خزانے انسانوں کی دسترس میں دے رہا ہے، صدیوں سے بنجر پڑی ہوئی زمینیں آباد ہو رہی ہیں زمین سال میں دو کی بجائے چار چار فصلیں دینے لگی ہے کہیں تیل دریافت ہو رہا ہے کہیں جلانے کی گیسیں اور کہیں دوسری معدنیات نیز انسان حصول رزق کے نئے سے نئے وسائل بھی دریافت کر رہا ہے اور سب باتیں اس آیت کا ظاہر اور واضح مصداق ہیں۔ مادہ پرست ماہرین معاشیات یہ تو اندازہ کر لیتے ہیں کہ اتنے سال بعد موجودہ شرح پیدائش کے مطابق دنیا کی آبادی کتنی ہو جائے گی لیکن اس دوران اللہ ﷻ جو نئے نئے وسائل رزق مہیا کرتا ہے اس کا وہ کچھ اندازہ نہیں کر سکتے لہٰذا ان کے اکثر اندازے غلط ثابت ہوتے ہیں اس مادہ پرستی اور محض مادی وسائل پر نظر رکھنے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ اللہ ﷻ کی ذات سے توکل اٹھ جاتا ہے جو اس آیت کا مرکزی مضمون ہے۔

علمی بات: قرآنِ حکیم کے الفاظ مستقر (قرار گاہ) اور مستودع (سونپے جانے کی جگہ) کے معنی میں ہے اور مستودع اس گودام کو بھی کہتے ہیں جہاں کوئی چیز ذخیرہ کی جاتی ہے یا امانتیں بطور حفاظت رکھی جاتی ہیں۔ "مُسْتَقَرٌّ" اور "مُسْتَوْدَعٌ" کی تفسیر اگرچہ مفسرین نے مختلف بیان کی ہے، مگر الفاظ کے پیش نظر واضح مطلب یہ ہے کہ اللہ ﷻ وہ تمام جگہیں بھی جانتا ہے جہاں انسان نے کچھ مدت کے لئے ٹھہرنا ہے، خواہ باپ کی پشت ہو یا ماں کا رحم، یا زمین کا کوئی حصہ جہاں اس نے زندگی میں ٹھہرنا ہے اور وہ جگہ بھی جہاں انسان نے مرنے کے بعد سپرد ہونا ہے، خواہ وہ زمین میں کھودی ہوئی جگہ ہو یا کسی جانور کا پیٹ یا، سمندر و دریاہوں جو جگہ بھی اللہ ﷻ نے قیامت کے وقوع تک لکھ رکھی ہے وہ جگہ بطورِ برزخ کے ہے اور وہ جگہ اس کے لئے قبر ہی ہے، کیونکہ اللہ ﷻ نے ہر انسان کو موت اور قبر دینے کا ذکر فرمایا ہے: (ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ)۔ (سورہ عبس ۸۰، آیت: ۲۱) "پھر اسے موت دی، پھر اسے قبر میں رکھوایا۔" پھر قیامت کو زندہ ہو کر یا تو جنّت کا مستحق ہو گا یا نار کا، یہ سب اس کے لئے "مُسْتَوْدَعٌ" (سونپے جانے کی جگہ) اور مستقر (قرار گاہ) ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ اللہ ﷻ ہر جان دار کی زندگی کے تمام حالات بھی جانتا ہے اور موت کے بعد کے تمام واقعات بھی۔

علمی بات: کتاب مبین سے مراد لوح محفوظ ہے جیسا کہ اس حدیث مبارک سے واضح ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ ﷻ تھا اور کوئی چیز نہ تھی اور اللہ ﷻ کا عرش پانی پر تھا۔ پھر اس نے زمین و آسمان پیدا کئے اور لوح محفوظ میں ہر چیز لکھ دی۔ (صحیح بخاری)

آیت نمبر ۷: اللہ ﷻ کی وحدانیت اور قدرت کاملہ کی دلیل کے طور پر کائنات کی تخلیق کا بیان ہے۔ اللہ ﷻ نے چھ دنوں میں زمین و آسمان کی تخلیق فرمائی۔ ان کو پیدا کرنے سے پہلے اللہ ﷻ کا عرش پانی پر تھا۔ یہ بات متشابہات میں سے ہے۔ جس کی کیفیت و تفصیل میں جانے سے شریعت مطہرہ نے منع کیا ہے انسان کی تخلیق کا مقصد یہ بیان ہوا کہ اس دنیا میں انسانوں کا امتحان لیا جائے کہ کون عمل میں اچھا ہے؟ روز قیامت تمام انسانوں کو دوبارہ زندہ کر کے ان کے عمل کے مطابق انہیں جزا یا سزا دی جائے گی۔ قیامت و آخرت کے منکرین کی کج فہمی کا بیان ہے کہ وہ انسانوں کے دوبارہ زندہ ہونے سے متعلق موثر بیان جادو قرار دیتے ہیں جس نے بہت سے لوگوں کو متاثر کر لیا ہے۔

علمی بات: فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ۔ لفظی معنی ہیں چھ دنوں میں۔ چونکہ جس زمانہ کے متعلق اس کا استعمال ہوا ہے سورج کی تخلیق بھی نہیں ہوئی تھی۔ لہٰذا عام معنوں میں نہیں لیا جا سکتا۔ عربی زبان میں یہ مطلقاً وقت کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے ا۔ خواہ کتنا ہی دراز یا مختصر ہو۔ آیۃ ہذا میں ستۃ ایام سے مراد چھ ادوار لئے گئے ہیں اور ہر دور کی مقدار کتنی تھی ہماری دنیا کے دن کے برابر یا قیامت کے دن کے برابر؟ اللہ ﷻ ہی بہتر جانتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ اس کی مراد اللہ ﷻ کے حوالے کی جائے۔ ویسے بھی انسانی ہدایت کا کوئی معاملہ اس طرح کی باتوں پر موقوف نہیں، قرآن کریم کتاب ہدایت ہے۔ ہدایت کے ضمن میں ایسی کسی بات کا تذکرہ صرف اس لئے کیا جاتا ہے تاکہ اس کی قدرت کاملہ اور اس کی حکمت بالغہ پر یقین پیدا ہو اور حقیقت نہ سمجھنے پر دل میں عجز کی کیفیت پیدا ہو جس سے بندگی کو جلا ملتی ہے اور اللہ ﷻ کی کبریائی کا یقین بڑھ جاتا ہے۔

علمی بات: الْعَرْشِ۔ اصل میں چھت والی چیز کو کہتے ہیں۔ اس کی جمع عروش ہے قرآنِ حکیم میں آیا ہے وَهِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰی عُرُوْشِهَا۔ اور اس کے مکان اپنی چھتوں پر گرے پڑے تھے۔ عرش کا لفظ عزت، غلبہ، سلطنت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ البتہ جہاں تک عرش الٰہی کا تعلق ہے ہم صرف نام کی حد تک واقف ہیں اور اس کی حقیقت انسان کے فہم سے بالاتر ہے وہ بادشاہ کے عرش کی طرح نہیں ہے۔ کیونکہ ذات باری تعالیٰ اس سے بالاتر ہے کہ کوئی چیز اسے اٹھائے۔ عرش کی اصل حقیقت اللہ ﷻ کے علم میں ہے۔ یہ عقیدہ رکھنا ضروری ہے کہ اللہ ﷻ اپنی شان کے مطابق عرش پر جلوہ فرما ہے۔

عملی پہلو: اس آیت نے واضح فرما دیا ہے کہ اس کائنات کو پیدا کرنے کا اصل مقصد بنی آدم کی آزمائش ہے۔ اور آزمائش یہ ہے کہ ان میں سے کون اچھا عمل کرتا ہے، یہ نہیں کہ کون زیادہ عمل کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نفلی اعمال کی گنتی سے زیادہ انسان کو اس کی فکر کرنی چاہیئے کہ اس کا عمل اخلاص اور خضوع و خشوع کے اعتبار سے زیادہ بہتر ہو۔ اس لئے کہ اللہ ﷻ نے انسان کو خلیفہ بنایا نیز اسے اختیارات سونپ اس پر اخلاقی ذمہ داریاں عائد کیں تاکہ آزمائے کہ ان میں سے کون اچھا عمل کر کے آتا ہے۔

عملی پہلو: زمین اور آسمان کی تخلیق اور اس میں ان گنت نعمتیں ودیعت کرنے کا مقصد ایک اللہ ﷻ کی عبادت کرنا، نیز نیکی اور خیر کے کاموں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنا ہے تاکہ روز قیامت اللہ ﷻ ہر شخص کو اس کے اعمال کے مطابق بدلہ عطا فرمائے۔

آیت نمبر ۸: اس آیت میں قیامت کو جھٹلانے والوں کو فوراً سزا نہ دیئے جانے پر ان کا طرز عمل ذکر کیا گیا ہے۔ وہ طنزاً پوچھتے کہ ان پر عذاب کیوں نہیں آ رہا؟ لہٰذا اللہ ﷻ نے جواب مرحمت فرمایا کہ کافر جان لیں کہ جس دن ان پر عذاب آئے گا وہ انہیں گھیر لے گا اور وہ بچ نہیں سکیں گے۔

علمی بات: اس بات کے کہنے سے ان کے دو مقصد ہو سکتے ہیں، ایک مقصد تو وعید کو جھٹلانا کہ آپ کہتے ہیں کہ عذاب آئے گا اور ہمیں اس کا مورد ٹھہراتے ہیں وہ آ کیوں نہیں رہا اسے کس نے روک رکھا ہے۔ دوسرا مقصد آخرت کے عذاب کا انکار کہ جیسے دنیا میں عذاب کی وعیدیں سناتے ہیں اور عذاب نہیں آتا ایسے ہی موت کے بعد اٹھایا جانا اور عذاب ہونا یہ بھی ویسی ہی بات ہے جو حقیقت میں واقع ہونے والی نہیں۔ ان لوگوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ اللہ ﷻ نے عذاب مؤخر کر رکھا ہے اس کا وقت معین ہے چنانچہ حکمت کے مطابق وقت مقررہ پر اللہ ﷻ عذاب بھیج دے گا جب فی الواقع عذاب آ پہنچے گا تو پھر وہ ٹلے گا نہیں اور یہ اس کا مذاق اڑانے کا انجام بھی دیکھ لیں گے۔

علمی بات: اس عذاب سے مراد یا تو دنیا کا عذاب ہے یا آخرت کا، اگر دنیوی مراد ہو تو یہ وہ عذاب ہے جو غزوہ بدر میں ان کو ذلت آمیز شکست کی صورت میں حاصل ہوا تھا اور اگر اس سے آخرت کا عذاب مراد ہے تو وہ قیامت کے بعد ان پر نازل کیا جائے گا۔

آیت نمبر۹: ایک غیر تربیت یافتہ انسان کی کم ظرفی کا بیان ہے۔ کسی راحت کے بعد تکلیف میں مبتلا ہونے پر وہ مایوس ہو کر شکوہ کرنے لگتا ہے بلکہ پچھلی راحتوں کو بھی فراموش کر ڈالتا ہے جب کہ مومنانہ طرز عمل یہ ہے کہ مصیبت پر صبر کیا جائے۔

علمی بات: اس آیت کی تفسیر میں دو قول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ اس آیت میں الانسان سے مراد مطلق انسان ہے پھر آیت: ۱۱ میں اس سے نیک اور صبر کرنے والے مسلمانوں کا استثناء فرمایا ہے جیسا کہ سورۃ العصر میں ہے۔ (سورۃ العصر ۱۰۳: آیت: ۳-۱) قسم ہے (تیزی سے گزرتے ہوئے) زمانے کی۔ یقیناً انسان نقصان میں ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کیئے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی۔ اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی اور اسی طرح سورۃ المعارج کی آیات ۱۹ تا ۲۳ میں بھی ہے: بے شک انسان بہت کم حوصلہ پیدا کیا گیا ہے۔ جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو گھبرا جاتا ہے۔ اور جب خوش حالی ملتی ہے تو کنجوس بن جاتا ہے۔ سوائے (ان کے جو) نماز ادا کرنے والے ہیں۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہاں انسان سے کافر انسان مراد ہے اور اس کی نظیر یہ آیت ہے: (سورۂ یوسف ۱۲: آیت: ۸۷) اور اللہ ﷻ کی رحمت سے مایوس مت ہو کیونکہ اللہ کی رحمت سے صرف کافر مایوس ہوتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ آیت تمام کافروں کے متعلق نازل ہوئی ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ آیت کسی خاص کافر کے متعلق نازل ہوئی ہو۔

ایک رائے ہے کہ یہ آیت ولید بن مغیرہ کے متعلق نازل ہوئی ہے اور ایک رائے یہ بھی ہے کہ یہ آیت عبد اللہ بن ابی امیہ مخزومی کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ مصیبت میں اللہ ﷻ کی رحمت سے مایوس ہونا اور راحت میں اترانا اور شیخی بگھارنا کفار کا شیوہ ہے۔

آیت نمبر۱۰: غیر تربیت یافتہ انسان نعمت ملنے پر اتراتا اور تکبر کرتا ہے۔ جب کہ مومنانہ طرز عمل نعمت پر شکر کرنا ہے۔ یعنی مصیبت کے بعد اگر خدا آرام و آسائش نصیب کرے تو سمجھتا ہے کہ گویا میرے رب نے ہمیشہ کے لئے مصائب و تکالیف کا خاتمہ کر دیا، جب کہ اس وقت غافل انسان مغرور ہو کر شیخیاں بگھارتا ہے اور اتراتا پھرتا ہے حالانکہ اسے چاہیئے تھا کہ پچھلی حالت یاد کر کے خدا کا شکر ادا کرتا اور اس کا احسان مند ہو کر اللہ ﷻ کے سامنے جھکتا۔

عملی پہلو: انسان کامل وہی ہے جو ہر رنج و راحت اور تغیر و تبدل میں دست قدرت کی پوشیدہ طاقت کا مشاہدہ کرے، فانی راحت و رنج اور اس کے صرف مادی اسباب پر دل نہ لگائے۔ عقلمند کا کام یہ ہے کہ ہر حال میں شکر ادا کرتا رہے یا صبر کے کام سے اور اسباب سے زیادہ مسبب الاسباب کی طرف نظر کرے، اسی سے اپنا رشتہ مضبوط باندھے ہر کیفیت میں امید باری تعالیٰ کا دامن تھامے رکھے۔ اور خالق کائنات کی طرف متوجہ رہے اور اس سے اپنا تعلق مضبوط کرے کہ رنج و تکلیف میں بے ساختہ اِنَّا لِلّٰہِ اور راحت و آرام میں اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ اس کے زبان سے جاری ہو۔

آیت نمبر۱۱: اس آیت میں مومنین کا طرزِ عمل بیان کیا گیا ہے۔ یعنی گزشتہ آیات میں بیان کی گئی کمزوریوں سے ایمان والے مستثنیٰ ہیں جن میں دو صفات پائی جائیں:

۱۔ صبر ۲۔ عمل صالح

ایسے لوگ اللہ ﷻ کے ہر فیصلہ پر راضی ہوتے ہیں۔ ان کے لئے بخشش اور بہت بڑی نعمت کی بشارت ہے۔

علمی بات: اس مقام پر صبر کا لفظ مستقل مزاجی کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے یعنی وہ لوگ جو نہ تو مصیبت کے وقت دل برداشتہ اور مایوس ہوں بلکہ صبر و ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے برداشت کریں اور اسی طرح کسی خوشی کے موقع پر آپے سے باہر نہ ہوں بلکہ اپنے آپ کو قابو میں رکھیں اور ہر حال میں اللہ ﷻ کا شکر بجا لائیں اور مصیبت یا خوشی کے مواقع پر ان کی طبیعت میں غیر سنجیدہ قسم کا اتار چڑھاؤ نمایاں نہ ہو بلکہ وہ ہر حال میں اپنے رویہ و عملی توازن کو برقرار رکھتے ہیں چنانچہ نہ مال و دولت اور آسودگی ان کا مزاج خراب کرتی ہے اور نہ ہی تنگی و نامساعد حالات کے دوران اپنی ہمت ہار بیٹھتے ہیں ایسے ہی لوگوں کے قصور اللہ ﷻ معاف کرتا ہے اور ان کے نیک کاموں کے عوض انہیں بہت زیادہ اجر بھی عطا فرماتا ہے۔

مومن کے لئے مصیبت اور راحت دونوں کا خیر ہونا احادیث مبارکہ کی روشنی میں۔

فرمان نبوی ﷺ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "مسلمان کے حال پر تعجب ہوتا ہے، اس کے ہر حال میں خیر ہے اور یہ مومن کے سوا اور کسی کا وصف نہیں ہے، اگر اس کو راحت پہنچے تو شکر کرتا ہے اور وہ اس کے لئے خیر ہے اور اگر اس کو مصیبت پہنچے تو صبر کرتا ہے اور وہ (بھی) اس کے لئے خیر ہے"۔ (صحیح مسلم)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "نہیں ہے کوئی مسلمان جس کو کانٹا چبھے یا اس سے بڑی تکلیف پہنچے مگر اس کے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔" (مسند احمد)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مومن کو جو بھی درد ہو یا تھکاوٹ ہو یا بیماری ہو، یا غم ہو یا فکر اور پریشانی ہو تو اللہ ﷻ اس کی وجہ سے اس کے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: بڑا اجر، بڑی مصیبت کے ساتھ ہے، اور اللہ ﷻ جب کسی قوم سے محبت کرتا ہے تو انہیں آزمائش میں مبتلا کر دیتا ہے جو راضی ہوا اس کے لئے اللہ ﷻ کی رضا ہے، اور جو ناراض ہوا اس کے لئے اللہ ﷻ کی ناراضگی ہے۔ (سلسلۃ الصحیحہ)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اسی لئے قیامت کے دن جب مصیبت زدہ ثواب سے نوازے جائیں گے (تو یہ دیکھ کر) صحت اور آرام والے خواہش کریں گے کہ کاش! دنیا میں ان کے چمڑے قینچیوں سے کاٹ دیے جاتے (تاکہ آج وہ بھی بڑے ثواب کے حقدار ہوتے)۔" (سنن ابن ماجہ)

آیت نمبر ۱۲: کافروں کے دو اعتراضات کا ذکر:

۱۔ رسول ﷺ اللہ ﷻ کے رسول ہیں تو ان پر کوئی خزانہ کیوں نازل نہ ہوا۔

۲۔ کوئی فرشتہ ان کے ساتھ ان کی حفاظت اور اظہار عظمت کے اظہار کے لئے کیوں نازل کیوں نہ ہوا۔

رسول اللہ ﷺ کو ان بے ہودہ اعتراضات پر تسلی دی گئی ہے اور نافرمانوں کو ان کے انجام سے خبردار کرتے رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔

شانِ نزول: عبد اللہ بن اُبی امیہ مخزومی نے رسول کریم ﷺ سے کہا تھا کہ اگر آپ سچے ہیں اور آپ کا خدا ہر چیز پر قادر ہے تو اس نے آپ پر خزانہ کیوں نہیں اتارا، یا آپ کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہیں بھیجا جو آپ کی رسالت کی گواہی دیتا، اس پر یہ آیت نازل فرمائی۔

علمی بات: کفار کا یہ کہنا تھا کہ جو قرآنِ حکیم آپ ہمیں پڑھ کر سناتے ہیں اس میں تو ہمارے خداؤں کو بہت برا بھلا کہا گیا ہے اس لئے ہم اس قرآنِ حکیم کو تو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ ہاں اگر آپ ایسا قرآنِ حکیم لے آئیں جس میں ہمارے بتوں سے کسی قسم کا تعرض نہ کیا گیا ہو تو ہم آپ پر ایمان لا سکتے ہیں۔ دوسرا اعتراض انہوں نے یہ کیا کہ اگر آپ سچے نبی ہوتے تو آپ کے پاس سونے چاندی، لعل و جواہرات کے خزانے ہوتے جنہیں آپ لوگوں میں تقسیم کرتے اور لوگ آپ کی بات مانتے یا آپ کے ہمراہ کوئی فرشتہ ہوتا جو لوگوں کو آپ کی صداقت کا یقین دلاتا اور جو ماننے سے انکار کرتا اس کی گردن مروڑ کر رکھ دیتا۔ آپ کا حال یہ ہے کہ ہم آپ پر آوازیں کستے ہیں۔ پتھر مارتے ہیں۔ غلاظت پھینکتے ہیں۔ راستہ میں کانٹے بچھاتے ہیں اور ہمیں تو کبھی سر درد بھی نہیں ہوا۔ یقیناً حضور اکرم ﷺ کو ان کی اس قسم کی ہرزہ سرائیوں پر دکھ ہوتا تھا چنانچہ اللہ ﷻ فرماتا ہے کہ اے محبوب! یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ ان کی رضاجوئی کے لئے کتاب میں ردوبدل کر دیں یا دولت کی کمی اور کسی فرشتہ کے ہمراہ نہ ہونے کی وجہ سے کچھ دل گرفتگی محسوس کریں۔ نہیں ہرگز نہیں۔ یعنی آپ کے لئے یہ تو ممکن نہیں ہے کہ جو وحی آپ پر نازل کی جا رہی ہے، اس کا کوئی حصہ آپ ان لوگوں کی حرکات سے تنگ دل ہو کر یا ان کو نصیحت بے سود سمجھ کر چھوڑ بیٹھیں۔ لہٰذا ایسی باتوں سے آپ زیادہ رنجیدہ نہ ہوں، کیونکہ آپ کا کام تو یہ ہے کہ انہیں حقیقت سے آگاہ فرما دیں اس کے بعد یہ لوگ مانیں یا نہ مانیں، یہ خود ان کے اختیار میں ہے۔ اور اللہ ﷻ خود ان سے نمٹ لے گا۔

آیت نمبر ۱۳: مشرکین و کفار کا اعتراض: وہ کہتے کہ قرآنِ حکیم اللہ ﷻ کا کلام نہیں ہے بلکہ پیغمبر کا بنایا ہوا کلام ہے۔ (معاذ اللہ)

انہیں قرآنِ حکیم کے مقابلے میں دس سورتیں پیش کرنے کا چیلنج دیا گیا ہے۔

اس کام کے لئے جس کو چاہے بلا لیں اور چاہے جس کی مدد لے لیں اور اس چیلنج کو پورا کر کے دکھائیں۔

علمی بات: مشرکین نبی ﷺ سے آپ کی نبوت پر معجزہ طلب کرتے تھے، آپ کو بتایا گیا کہ آپ یہ کہیں کہ میری نبوت پر معجزہ یہ قرآنِ حکیم ہے۔ نبی ﷺ نے اس قرآنِ مجید کے ساتھ چیلنج کیا کہ اگر یہ کسی انسان کا بنایا ہوا کلام ہے تو تم بھی اس جیسا کلام بنا کر لے آؤ لیکن آپ ﷺ کے مخالفین باوجود یہ کہ عرب میں ان کی فصاحت و بلاغت مسلّم تھی کوئی شخص قرآنِ مجید کے مثل کلام بنا کر نہیں لا سکا، قرآنِ مجید نے کئی طرح سے یہ چیلنج پیش کیا ہے: چنانچہ (سورہ بنی اسرائیل ۱۷، آیت: ۸۸) میں ہے آپ ﷺ کہیئے اگر تمام انسان اور جن مل کر اس قرآنِ حکیم کی مثل لانا چاہیں تو وہ اس کی مثل نہیں لا سکتے، خواہ وہ ایک دوسرے کی مدد (بھی) کریں۔ اور زیر تفسیر آیت میں دس سورتوں کی مثل لانے کا چیلنج دیا گیا ہے اور سورۃ البقرہ ۲، آیت: ۲۳ اور سورہ یونس ۱۰، آیت: ۳۹ میں کسی ایک سورت کی مثل لانے کا چیلنج دیا گیا ہے۔

آیت نمبر ۱۴: چیلنج قبول نہ کرنے کی صورت میں ثابت ہو جائے گا کہ قرآنِ حکیم اللہ ﷻ کا کلام اور اس کے کامل علم کا مظہر ہے۔ وہی معبود حقیقی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی ایسی ذات نہیں جو ایسا کلام نازل کر سکے۔ لہٰذا اللہ ﷻ ہی کی اطاعت قبول کرنے اور اسی کی وحدانیت تسلیم کر کے اس کے کلام کو برحق ماننے کا حکم دیا گیا۔

علمی بات: نبی کریم ﷺ سے کہا گیا ہے کہ ان مشرکین سے کہہ دیں کہ اگر قرآنِ مجید کی دس سورتوں کی مثل لانے میں تمہارے خود ساختہ معبود تمہاری مدد نہ کر سکیں اور تم خود بھی اس کی مثل دس سورتیں نہ لا سکو تو خوب جان لو اور اس بات کا کامل یقین رکھو کہ یہ قرآنِ حکیم آسمان سے محمد ﷺ پر اللہ ﷻ کے علم اور اس کے اذن سے نازل ہوا ہے اور محمد (ﷺ) نے اسے اپنی طرف سے بنا کر ہم پر افتراء نہیں کیا اور یہ بھی یقین رکھو کہ مخلوق کی عبادت کا مستحق صرف اللہ ﷻ ہے اور وہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے لہذا اے مشرکو! تم بت پرستی کو ترک کر دو اور اللہ وحدہ کی عبادت کرو۔

مشرکین سے کہا جا رہا ہے کہ اگر تم قرآنِ حکیم کا مثل بنانے کے لئے اپنے بڑے بڑے فصیح و بلیغ شاعروں اور خطیبوں کو دعوت دو اور وہ اس دعوت کو قبول کرنے کی جرأت نہ کر سکیں تو پھر تم بھی جان لو کہ یہ اللہ ﷻ کا کلام ہے اور یہ بھی یقین کر لو کہ اس کی ذات کے سوا کوئی معبود نہیں۔ دیکھو! اب تو حقیقت روشن ہو گئی اور حق واضح ہو گیا تو کیا اب بھی اسلام لانے میں پس و پیش کرو گے۔

آیت نمبر ۱۵: دنیا پرستوں کا بیان ہے۔ یعنی صرف دنیا اور اس کی زیب و زینت چاہنے والوں کو ان کے اعمال کا بدلہ دنیا میں ہی دے دیا جاتا ہے۔

علمی بات: کافر لوگ جو آخرت پر تو ایمان نہیں رکھتے، اور جو کچھ کرتے ہیں، دنیا ہی کی خاطر کرتے ہیں، ان کے اچھے اور رفاہی کاموں، مثلاً خدمتِ خلق اور بھلائی کے دیگر کام وغیرہ کا صلہ دنیا ہی میں دے دیا جاتا ہے، آخرت میں ان کا کوئی ثواب نہیں ملتا، کیونکہ ایمان کے بغیر آخرت میں کوئی نیکی معتبر نہیں ہے۔ اسی طرح اگر مسلمان کوئی نیک کام صرف دنیوی شہرت یا دولت وغیرہ حاصل کرنے کے لئے کرے تو اسے دنیا میں تو وہ شہرت یا دولت مل سکتی ہے۔ لیکن اس نیکی کا ثواب آخرت میں نہیں ملتا۔ بلکہ اعمال میں اخلاص کے فقدان کی وجہ سے الٹا گناہ ہوتا ہے کیونکہ آخرت میں وہی نیکی معتبر ہے جو اللہ ﷻ کی خوشنودی حاصل کرنے کی نیت سے کی گئی ہو۔

ایک جاہلانہ اعتراض کا جواب: یہاں بہت سے مسلمانوں کی اس غلط فہمی کا ازالہ بھی ہو گیا کہ کافر تو مزے اڑاتے ہیں اور ہم تکلیف میں ہیں اول تو نہ سارے مسلمان تکلیف میں ہیں اور نہ سارے کافر راحت میں ہیں دوسرے کافر کو آخرت میں آرام ملتا ہی نہیں اس کے اعمال کا بدلہ یہیں دیا جا رہا ہے جب کہ مسلمانوں کے اعمال کا بدلہ محفوظ کر لیا گیا ہے۔ پھر جو تکلیفیں ہیں ان پر بھی ثواب ملے گا پھر ہمیں کس بات پر مایوسی ہے لہذا ہمیں اللہ ﷻ کا حکمت پر مبنی قانون سمجھنا چاہئے جن کافروں کو دیکھ کر ہم متاثر ہوتے ہیں وہ آخرت کے اعتبار سے تو انتہائی ذلّت میں ہوں گے حتی کہ بعض نادان یہاں تک کہ دیتے ہیں کہ غیروں کے لئے محلات اور مسلمانوں سے صرف وعدۂ جنت یہ سب ناسمجھی و گمراہی کی باتیں ہیں جن کے ذریعہ بعض نادان مسلمان اللہ ﷻ کے قانون پر اعتراض کرتے ہیں اور بالآخر کفر و ضلالت کے گڑھے میں جا گرتے ہیں، ایک مرتبہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اس وقت آپ ﷺ ایک چٹائی پر لیٹے ہوئے تھے آپ ﷺ کے نیچے کوئی نرم بچھونا نہیں تھا اور آپ ﷺ کے جسم مبارک پر چٹائی کی بناوٹ کے نشان پڑ گئے تھے اور تکیہ بھی چمڑے کا تھا جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ علیہ السلام اللہ ﷻ سے دعا کیجئے تا کہ وہ آپ علیہ السلام کی امت کو مالی وسعت عطا فرما دے۔ کیونکہ فارس و روم کے لوگوں کو مالی وسعت دی گئی ہے حالانکہ وہ اللہ ﷻ کی عبادت نہیں کرتے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اے خطاب کے بیٹے! تم ابھی تک ان ہی خیالات میں مبتلا ہو؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کی مرغوب چیزیں انہیں دنیا میں دے دی گئی ہیں۔ ایک اور روایت میں یوں ہے کہ کیا تم لوگ اس پر راضی نہیں ہو کہ مرغوب چیزیں ان کے لئے دنیا میں ہوں اور ہمارے لئے آخرت میں ہوں۔ (صحیح بخاری)

آیت نمبر ۱۶: دنیا کے طلب گاروں کے لئے آخرت میں دوزخ کے آگ کے سوا کچھ نہیں ہو گا۔ دنیا میں ان کے کئے گئے تمام بظاہر اچھے کام آخرت کے اعتبار سے ضائع ہو جائیں گے۔

علمی بات: ان آیات میں اول تو ان لوگوں کی مذمت فرمائی جو دنیا کے طالب ہیں دنیا ہی ان کا مقصود و مطلوب ہے اور فقط دنیا کو مطمع نظر بنا لینے کی وجہ سے آخرت کے طلب گار نہیں اور ایمان لانے کے روادار نہیں، دنیا اور دنیا کی زینت ہی ان کے نزدیک سب سے بڑی چیز ہے ایسے لوگ اگر کچھ ایسے اعمال کر لیتے ہیں جو اچھائی کے زمرے میں آسکتے ہیں مثلاً صلۂ رحمی یا فقراء و مساکین پر خرچ کرنا وغیرہ تو دنیا ہی میں ان کا بدلہ دے دیا جائے گا اور چونکہ اچھے اعمال کو کارگر بنانے کی شرط اول یعنی ایمان مفقود ہے لہذا آخرت میں ضائع ہو جائیں گے اور ان کے عوض کچھ نہ ملے گا، چنانچہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: بے شک اللہ ﷻ کسی مومن کے ساتھ ایک نیکی کے معاملے میں بھی ظُلم نہیں فرماتا۔ اس کے بدلے اسے دنیا میں بھی عطا کرتا ہے اور آخرت میں بھی اس کی جزا دی جاتی

ہے۔ رہا کافر، اسے نیکیوں کے بدلے میں جو اس نے دنیا میں اللہ ﷻ کے لئے کی ہوتی ہیں، اسی دنیا میں کھلا (پلا) دیا جاتا ہے حتّٰی کہ جب وہ آخرت میں پہنچتا ہے تو اس کے پاس کوئی نیکی باقی نہیں ہوتی جس کی اسے جزا دی جائے"۔ (صحیح مسلم)

آیت نمبر ۱۷: اہل فطرت کا بیان ہے جو اپنے رب کی جانب سے واضح دلیل پر قائم ہیں۔ دلیل سے مراد وہ فطرت توحید ہے جس پر اللہ ﷻ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ گواہ سے مراد قرآنِ حکیم یا رسول ﷺ ہیں جو اس فطرت کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ قرآنِ حکیم سے پہلے رحمت بھرے احکامات شریعت تورات میں تھے۔ اب یہ رحمت قرآنِ حکیم کی صورت میں ہے۔ قرآنِ حکیم کے برحق ہونے پر شک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ لوگوں کی اکثریت ایمان لانے سے محروم ہے جن کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

علمی بات: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "ہر بچہ فطرت (اسلام) پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی، نصرانی یا مشرک بناتے ہیں" عرض کیا گیا: اللہ کے رسول ﷺ! جو اس سے پہلے مر جائے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "اللہ ﷻ خوب جانتا ہے کہ وہ کیا عمل کرتے"۔ (صحیح بخاری)

فرمان نبوی ﷺ: "قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اس امت کے جس یہودی، یا عیسائی نے بھی میری نبوت کے بارے میں سنا اور پھر مجھ پر ایمان نہ لایا وہ جہنم میں جائے گا۔" (صحیح مسلم)

(اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ) شروع میں جو ہمزہ ہے یہ استفہام انکاری کے لئے ہے مطلب یہ ہے کہ ایک وہ شخص ہے جو فطرت توحید اور دین فطرت کو تھامے ہوئے ہے اس کی سچائی کا عقیدہ رکھتا ہے اور اس کے پاس اس کی سچائی کے دو گواہ موجود ہیں ایک تو خود قرآنِ حکیم کا اعجاز یعنی اس کی فصاحت و بلاغت اور اسلوب بیان کہ جس نے عرب کے بڑے بڑے فصیح ادیب اور شعراء کو اس جیسا کلام لانے سے عاجز کر دیا۔

دوسرا گواہ دنیا میں قرآنِ حکیم کے آنے سے پہلے ہی موجود ہے یعنی تورات جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی جو کتاب حضرت موسیٰ علیہ السلام لے کر آئے وہ امام بھی ہے اور دین فطرت کی تصدیق بھی کرتی ہے اور امتثال اوامر پر جو ثواب ملنے کے اللہ ﷻ نے وعدے فرمائے ہیں وہ تورات میں بھی ہیں اور قرآنِ مجید میں بھی ہیں تورات ان کی تصدیق کرتی ہے لہٰذا وہ سراپا رحمت ہے۔ تورات کی گواہی بھی قرآنِ حکیم کی سچائی کے لئے کافی ہے۔ اب سمجھ لیا جائے کہ جو شخص دین فطرت کو تھامے ہوئے ہے اور قرآن و تورات کی دلیل اور حجت کے ساتھ اس پر قائم ہے۔ کیا وہ شخص اس کے برابر ہو سکتا ہے جو منکر ہے یعنی ایسا نہیں ہو سکتا۔

اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ یہ لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ ان ایمان لانے والوں سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مراد ہیں اور ایک قول یہ ہے کہ وہ تمام افراد مراد ہیں جنہوں نے اسلام قبول کیا۔ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ (اور کافروں کی جماعتوں اور گروہوں میں سے جو شخص قرآنِ مجید کا منکر ہو اس سے یہ وعدہ ہے کہ وہ دوزخ میں داخل ہو گا) فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ (تو اے مخاطب تو قرآن کی طرف سے شک میں مت پڑ) اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ (بے شک وہ تیرے رب کی طرف حق ہے) وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ (لیکن بہت سے لوگ ایمان نہیں لاتے)۔ اس میں واضح طور پر بتا دیا کہ اہل اسلام کے علاوہ جتنے بھی گروہ اور جماعتیں ہیں وہ سب دوزخ میں جانے والے ہیں خواہ بظاہر کیسے ہی اچھے عمل کرتے ہوں اور خواہ اپنے دین کو آسمانی دین بتاتے ہوں۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ اس ذات کی قسم ہے جس کے قبضے میں محمد کی جان ہے میرے نبی ہونے کی خبر جس کسی کو بھی پہنچے گی اور وہ اس دین پر ایمان لائے بغیر مر جائے جو دین میں دے کر بھیجا گیا ہوں تو وہ ضرور دوزخ والوں میں سے ہو گا چاہے یہودی ہو یا نصرانی (رواہ مسلم) یہود اور نصاریٰ کا ذکر خصوصیت سے اس لئے فرمایا کہ وہ اپنے پاس دین سماوی کے مدعی ہیں۔

علمی بات: اس آیت میں نبی کریم ﷺ پر ایمان کو قیامت تک مدار نجات قرار دینے کو اس طرح بیان فرمایا ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب اور ملتوں کے ماننے والوں میں سے جو شخص بھی آپ علیہ السلام کا انکار کرے گا اس کا ٹھکانہ جہنم ہے کیونکہ ان کی شریعتیں آپ ﷺ کی شریعت آنے کی وجہ سے منسوخ ہو چکی ہیں اور آپ ﷺ کی ذات اقدس قیامت تک خاتم النبیین بنا دی گئی ہے، لہٰذا اب ان کی نجات کا دارومدار آپ علیہ السلام کی نبوت پر ایمان لانے اور آپ ﷺ کی شریعت کی پیروی کرنے میں ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ جو یہودی یا نصرانی میری دعوت سنے اور اس کے باوجود میری لائی ہوئی تعلیمات پر ایمان نہ لائے تو وہ اہل جہنم میں سے ہو گا۔ اس سے ان لوگوں کی غلط فہمی دور ہو جانی چاہئے جو بہت

سے یہود و نصاریٰ یا دوسرے مذہب کے پیروکاروں کو بعض ظاہری اعمال کی بناء پر حق پر سمجھتے ہیں اور رسول کریم ﷺ اور قرآنِ حکیم پر ایمان کے بغیر صرف ظاہری اعمال کو نجات کے لئے کافی سمجھتے ہیں، یہ قرآنِ مجید کی آیت مذکورہ اور حدیث کی اس صحیح روایت سے کھلا تصادم ہے۔ والعیاذ باللہ۔

آیت نمبر ۱۸: اِفْتَرَاءِ سے مراد دین میں کوئی بات خود سے گھڑ کر اللہ ﷻ کی طرف منسوب کر دینا ہے یا اسے شریعت سے ثابت کرنے کی کوشش کرنا ہے۔ اللہ ﷻ کے لئے شریک ہونے کی جھوٹی بات اللہ ﷻ کی طرف منسوب کرنے والے سب سے بڑے ظالم ہیں۔ روز قیامت کئی گواہ ان کے اس ظلم پر گواہی دیں گے۔ ان پر اللہ ﷻ کی لعنت ہو گی۔

علمی بات: جھوٹ باندھنے کی مختلف صورتیں ہیں۔ اگر کوئی شخص اللہ ﷻ کی کتاب یا اس کے رسول ﷺ پر ایمان نہیں لاتا تو یہ بھی اللہ ﷻ پر جھوٹ باندھنا ہے۔ اللہ ﷻ کی ذات، صفات یا عبادت میں اس کا شریک ثابت کرنا بھی اللہ ﷻ پر جھوٹ باندھنا ہے کیونکہ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی طرح جو شخص کوئی غلط دعویٰ کرتا ہے وہ بھی مفتری ہے جیسے مسیلمہ کذاب یا مرزا قادیانی نے نبوت کا دعویٰ کیا تو انہوں نے اللہ ﷻ پر جھوٹ باندھا کیونکہ اللہ ﷻ نے تو انہیں نبی بنا کر نہیں بھیجا تھا۔ یہ ساری باتیں اِفْتَرَاءِ عَلَی اللہِ اور بہت بڑا جرم ہیں۔

علمی بات: گواہوں سے کون مراد ہیں؟

۱۔ وہ فرشتے جو انسانوں کے اعمال لکھنے پر مقرر ہیں یعنی کراماً کاتبین۔

۲۔ انبیاء و رسل علیہم السلام جو اپنی اپنی امتوں کے بارے میں گواہی دیں گے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے "پس اس وقت کیا حال ہو گا جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں گے اور ہم آپ کو ان سب پر گواہ (بنا کر) لائیں گے۔" (سورۃ النساء ۴، آیت: ۴۱)

۳۔ آپ ﷺ کی امت کے مومنین بھی گواہی دیں گے۔ جیسا کہ ارشاد ہوا "(اور اے مسلمانو!) اسی طرح ہم نے تمہیں بہترین امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو جاؤ اور یہ رسول تمہارے حق میں گواہ ہو جائیں"۔ (سورۃ البقرہ ۲، آیت: ۱۴۳)

۴۔ انسان کے اپنے اعضاء جوارح کی گواہی کے متعلق بھی موجود ہے کہ "آج کے دن ہم ان کے منہ پر مہر لگا دیں گے، اور ان کے ہاتھ ہم سے بات کریں گے اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے جو وہ کمایا کرتے تھے"۔ (سورۃ یٰسٓ ۳۶، آیت: ۶۵) یہی بات سورۃ حم السجدہ ۴۱، آیات: ۲۰، ۲۱ میں بھی بیان ہوئی ہے۔

جس دن ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں ان کے اعمال کی ان کے خلاف گواہی دیں گے۔ (سورۃ النور ۲۴، آیت: ۲۴)

۵۔ زمین گواہی دے گی۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے "اس دن وہ (زمین) اپنی خبریں بیان کر دے گی"۔ (سورۃ الزلزال ۹۹، آیت: ۴)

فرمان نبوی ﷺ: حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مؤذن کی آواز جتنی مسافت پر پہنچے گی اور جہاں تک جن و انس اس کو سنیں گے قیامت کے دن اس کی شہادت دیں گے۔ (صحیح بخاری)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ مال بڑا سرسبز اور شیریں ہے اور مسلمان کا اچھا ساتھی ہے اور جو مال قیدی اور یتیم (ضرورت مند) مسافر کو دیا جائے گا، خود (وہ مال) اس کی گواہی دے گا اور جو شخص بغیر حق کے مال لیتا ہے وہ اس شخص کی طرح ہے جو کھاتا تو ہو اور سیر نہ ہوتا ہو۔ قیامت کے دن یہ مال اس شخص کے خلاف شہادت دے گا۔ (صحیح مسلم)

حضرت ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ "جو شخص جس مقام کے قریب سجدہ کرے گا وہاں درخت ہو یا پتھر قیامت کے دن وہ شہادت دے گا"۔ غرضیکہ نیکی اور بدی کا ہر مقام اور شجر اور حجر بھی انسان کے حق میں یا اس کے خلاف گواہی دیں گے۔

اس دن کفر، شرک، اور معصیت کے سارے پول کھل جائیں گے۔ ہر چیز کے متعلق گواہ پیش ہو کر بتا دیں گے کہ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے اس رب تعالیٰ پر جھوٹ باندھا جو ان کا خالق، پرورش کرنے والا، نعمتیں بخشنے والا اور قائم رکھنے والا ہے۔ دیکھو! انہوں نے کتنے بڑے جرم کا ارتکاب کیا۔

علمی بات: مشرکین اللہ ﷻ کے لئے اولاد تجویز کرتے تھے اور اس کے لئے شریک ٹھہراتے تھے اور جب انہیں اس بارے میں نصیحت کی جاتی تھی تو کہتے تھے۔ (کہ یہ اللہ ﷻ کے یہاں ہمارے لئے سفارش کر دیں گے) اور یوں بھی کہتے تھے۔ (کہ ہم ان کی عبادت صرف اس لئے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ ﷻ کے قریب کر دیں گے) ظاہر ہے کہ یہ باتیں انہوں نے خود ہی تجویز کر لیں جب اللہ ﷻ کی طرف سے کسی چیز کی خبر نہ دی گئی ہو تو اسے اللہ ﷻ کی طرف منسوب کرنا یہ

افتراء ہے اور بہتان ہے اور اللہ ﷻ پر جھوٹ باندھنا ہے، اللہ ﷻ کے لئے شریک تجویز کرنا پھر یہ کہنا اور یہ عقیدہ رکھنا کہ یہ معبود اللہ ﷻ کے ہاں ہماری سفارش کر دیں گے اور یہ کہ ہمیں اللہ ﷻ سے قریب کر دیں گے اس کا معنی یہ نکلتا ہے کہ اللہ ﷻ کی طرف سے ان کو یہ بات بتادی گئی حالانکہ اللہ ﷻ کی کتابیں اور اللہ ﷻ کے نبی علیہ السلام اس کے خلاف بتاتے رہے لہٰذا ان لوگوں کے یہ سب دعوے اللہ ﷻ پر بہتان ہیں اسی بنا پر اللہ ﷻ نے فرمایا کہ اس سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا جو اللہ ﷻ پر افتراء کرے۔ پس ایسے لوگوں پر اللہ ﷻ کی لعنت یعنی رحمت سے دوری کی گئی ہے۔

علمی بات: یعنی قرآنِ حکیم جھوٹ اور افتراء نہیں۔ اللہ ﷻ کا سچا پیغام ہے جس کو قبول کرنا ضروری ہے خوب سمجھ لو کہ اس شخص سے زیادہ ظالم کوئی نہیں ہو سکتا جو اللہ ﷻ پر جھوٹ باندھے۔ مثلاً جو کلام اللہ ﷻ نہ ہو اور کہہ دے کہ یہ اس کا کلام ہے یا واقعی اس کا ہو اور اللہ ﷻ کے بار بار فرمانے کے باوجود کہ یہ میرا کلام ہے اور روشن دلائل کے باوجود جھٹلاتا رہے اور کہتا ہے کہ اس کا نہیں بلکہ آپ ﷺ اس کو اپنی طرف سے بنا کر لاتے ہیں۔ (معاذ اللہ)

آیت نمبر ۱۹: لوگوں کو اللہ ﷻ کی اطاعت سے روکنے اور اللہ ﷻ کے احکامات پر اعتراض کرنے والے ظالموں کا بیان ہے جن پر اللہ ﷻ کی خصوصی لعنت اور بھٹکار ہے۔ یہ لوگ آخرت کی پیشی کے منکر ہیں۔

علمی بات: یہاں عِوَجاً کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ﷻ کے دین میں عیب نکالنا، طرح طرح کے شکوک و شبہات پیدا کرنا، مختلف قسم کے حیلے اور جھوٹے پروپیگنڈے کرنا۔ گویا ظالم لوگ دین حق کے بارے میں طرح طرح کے اعتراضات نکال کر اس کو ٹیڑھا ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ دین اسلام سے خود بھی دور بھاگتے تھے اور جو لوگ اسلام قبول کر چکے ان کو بھی اس سے ہٹانا چاہتے تھے۔ یہی ہیں جو آخرت کے بھی منکر تھے یعنی اللہ ﷻ پر جھوٹے بہتان باندھنے والوں کا قیامت میں یہ حشر ہو گا کہ سب کے روبرو ان کے کرتوتوں کو ظاہر کرتے ہوئے اعلان کیا جائے کہ یہ ظالم اللہ ﷻ کی راہ یعنی دین اسلام سے روکتے تھے اور اس فکر میں لگے رہتے تھے کہ دین اسلام میں کجی اور شکوک و شبہات پیدا کر کے لوگوں کو اس دین کی اطاعت سے روکیں۔

علمی بات: جو لوگ ظلم و ناانصافی سے اللہ ﷻ کے کلام کو جھوٹا بتلاتے ہیں اور سب سے بڑھ کر آخرت کے منکر ہیں دوسروں کو خدا کی راہ پر چلنے سے روکتے ہیں اور اس تلاش میں رہتے ہیں کہ سیدھے اور درست راستے کو ٹیڑھا اور غلط ثابت کریں۔ ایسے ظالموں پر خدا کی خاص طور پر لعنت ہے۔

آیت نمبر ۲۰: اللہ ﷻ کے راہ سے روکنے والوں کے لئے کوئی مددگار نہ ہو گا۔ انہیں دگنا عذاب دینے کی وجہ یہ ہے کہ وہ خود کفر و شرک کے مرتکب ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔ ان کا حق سے اعتراض اس بنا پر تھا کہ انہوں نے حق دیکھنے اور سننے کی صلاحیت ہی استعمال نہ کی۔

علمی بات: یہ لوگ زمین میں اللہ ﷻ کو عاجز کرنے والے نہ تھے کہ کہیں جا کر چھپ جاتے اور اللہ ﷻ کی قدرت سے باہر ہو جاتے اور موت سے بچ جاتے جب دنیا میں اللہ ﷻ کو عاجز کر کے کہیں نہیں جا سکتے تو آخرت میں کیسے چھوٹ کر جا سکتے ہیں۔ جہاں حساب کے لئے جمع کئے جائیں گے۔

اور ان لوگوں کے لئے اللہ ﷻ کے سوا کوئی بھی مددگار نہیں ہو گا اور جن لوگوں کو انہوں نے سفارشی سمجھا تھا وہ کچھ بھی فائدہ نہ پہنچا سکیں گے۔ ان کے لئے دُگنا عذاب ہے۔ ایک عذاب ان کے اپنے کفر کا اور دوسرا عذاب دوسروں کو ایمان سے روکنے کا اور کفر پر جمائے رکھنے کا۔ یہ لوگ سن نہیں سکتے تھے۔ یعنی حق سے دور بھاگتے تھے اور رسول اللہ ﷺ کی باتیں سننے کو اس قدر ناپسند کرتے تھے کہ گویا اپنی قوت سامعہ ہی ختم کر چکے تھے۔ اور دیکھ نہیں پاتے تھے یعنی اللہ ﷻ کی معرفت کی نشانیاں جو خود ان کے اندر اور دوسری مخلوقات اور تمام کائنات میں موجود ہیں ان سے قصداً اور ارادۃً اندھے بن جاتے تھے۔ ان کی ضد، عناد اور حق سے دور بھاگنے کی کوشش نے انہیں ایمان قبول نہ کرنے دیا، بلکہ وہ دوسروں کے ایمان قبول کرنے میں ہر طرح کی رکاوٹیں پیدا کرنے کی کوششیں کرتے رہے۔

آیت نمبر ۲۱: یہی ہیں وہ لوگ جنہوں نے خود اپنا نقصان کیا کہ اللہ ﷻ کی عبادت کو چھوڑ کر پتھروں کی پوجا اختیار کی اور جنت دے کر دوزخ مول لی۔ ایسے لوگ آخرت میں اپنے نقصان کے خود ذمہ دار ہوں گے۔ ان کے خود تراشیدہ معبود ان سے غائب اور گم ہو جائیں گے یعنی بتوں کی سفارش کرنے کا جو ان کا خیال تھا اور یقین رکھتے تھے کہ بُت شفاعت کر کے انہیں بچا لیں گے، ایسا ہرگز نہ ہو سکے گا۔

آیت نمبر ۲۲: روز قیامت یہ لوگ سب سے زیادہ خسارے میں ہوں گے۔

علمی بات: کفار مکہ کی چودہ وجوہ سے مذمت : اللہ ﷻ نے دو آیتوں ۱۸ اور ۱۹ میں کفار مکہ کی سات وجوہات کی بنا پر مذمت فرمائی تھی:

۱۔ وہ اللہ ﷻ پر جھوٹا بہتان تراشتے تھے فرمایا اس سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا جو اللہ ﷻ پر جھوٹا بہتان تراشے۔

۲۔ وہ ذلت اور رسوائی کے ساتھ اللہ ﷻ کے سامنے پیش کئے جائیں گے، فرمایا: اور یہ لوگ اپنے رب کے سامنے پیش کیے جائیں گے۔

۳۔ تمام گواہ ان کے خلاف گواہی دیں گے کہ انہوں نے اپنے رب پر جھوٹ باندھا تھا، فرمایا: اور تمام گواہ یہ کہیں گے کہ انہوں نے اپنے رب پر جھوٹ باندھا تھا۔

۴۔ وہ اللہ ﷻ کے نزدیک ملعون ہیں، فرمایا: سنو! ظالموں پر اللہ ﷻ کی لعنت ہے۔

۵۔ وہ اللہ ﷻ کے راستے سے لوگوں کو روکتے ہیں، فرمایا: جو اللہ ﷻ کے راستہ سے روکتے ہیں۔

۶۔ وہ اسلام کے خلاف شکوک اور شبہات ڈالتے ہیں فرمایا: اور اس میں کجی تلاش کرتے ہیں۔

۷۔ وہ آخرت کے منکر ہیں، فرمایا: وہ آخرت کا انکار کرنے والے ہیں۔

آیات ۲۰ تا ۲۲ میں ان کی مزید سات وجوہ سے مذمت فرمائی ہے:

۱۔ وہ اللہ ﷻ کے عذاب سے بھاگ نہیں سکتے، فرمایا: یہ لوگ زمین میں (اللہ ﷻ کو) عاجز کرنے والے نہ تھے۔

۲۔ اللہ ﷻ کے عذاب سے بچانے کے لئے ان کا کوئی مددگار نہیں، فرمایا: اور نہ اس کے سوا ان کا کوئی مددگار تھا۔

۳۔ ان کا عذاب دگنا کیا جائے گا، فرمایا: ان کے لئے عذاب کو دگنا کیا جائے گا۔

۴۔ ان میں حق کو سننے کی طاقت ہے نہ دیکھنے کی، فرمایا: یہ (شدت کفر کی وجہ سے حق کو) سننے کی طاقت نہیں رکھتے تھے اور نہ یہ (بغض کی وجہ سے حق کو) دیکھتے تھے۔

۵۔ انہوں نے اللہ ﷻ کی عبادت کے بجائے بتوں کی عبادت کی اور یہ ان کے گھاٹے اور خسارے کا سبب ہے، فرمایا: یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈال دیا۔

۶۔ انہوں نے دین کو دنیا کے بدلہ میں فروخت کر دیا اور اس میں ان کو دنیا میں یہ گھاٹا ہوا کہ انہوں نے عزت والی چیز کو دے کر ذلت والی چیز لے لی اور آخرت کا خسارہ یہ ہے کہ وہ ذلت والی چیز بھی ضائع اور ہلاک ہو گئی اور اس کا کوئی اثر باقی نہیں رہا فرمایا: اور جو کچھ یہ افتراء کرتے تھے وہ ان سے جاتا رہا۔ ۷۔ چونکہ انہوں نے نفیس اور اعلیٰ چیز کو دے کر ناپاک، ادنیٰ اور بے فائدہ چیز پسند کی اس لئے ان کا خسارہ لازمی اور یقینی ہے، فرمایا: بلاشبہ یقیناً یہی لوگ آخرت میں سب سے زیادہ نقصان اٹھانے والے ہیں۔

آیت نمبر ۲۳: سعادت مند لوگوں کی صفات کا بیان: ۱۔ وہ اللہ ﷻ کے کلام اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لاتے ہیں۔

۲۔ وہ اللہ ﷻ اور رسول اللہ ﷺ کے احکامات پر عمل کرتے ہیں۔ ۳۔ وہ عاجزی اختیار کرتے ہیں۔

علمی بات: الخبت اصل میں نشیبی اور نرم زمین کو کہتے ہیں۔ اس کے بعد لفظ الاخبات نرمی اور تواضع کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے وبشر المخبتین (۲۲:۳۴) اور عاجزی کرنے والوں کو خوشخبری سنادو۔

مفسرین کرام نے "اِخْبَاتٌ" کے یہ معانی بیان فرمائے ہیں: تواضع، جھکنا، عاجزی کرنا، مطمئن ہونا، ڈرنا، اخلاص کا مظاہرہ کرنا، خوف کرنا، رجوع کرنا، خشوع اور خضوع کرنا، تسلیم و رضا وغیرہ۔ اللہ ﷻ نے ایمان اور اعمال صالحہ کے ساتھ مسلمانوں کے مطمئن ہونے اور عاجزی و تواضع اختیار کرنے کا بھی ذکر فرمایا ہے۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ مسلمان جب اللہ ﷻ کی عبادت کریں تو عبادت کے وقت ان کے دل اللہ ﷻ کے ذکر سے مطمئن ہوں اور اللہ ﷻ نے جو ثواب کا وعدہ اور عذاب کی وعید کا ذکر فرمایا ہے اس پر دل سے یقین رکھنے والے ہوں۔ اور اگر اخبات کو خشوع کے معنی میں لیں تو پھر اس میں یہ اشارہ ہے کہ جب مسلمان اعمال صالحہ کریں تو ان کو یہ ڈر اور خوف ہو کہ ان کی کسی کمی اور کوتاہی کی بناء پر ان کے نیک اعمال مسترد نہ کر دیئے جائیں لہٰذا بندہ مومن اپنے نیک اعمال کی بنا پر تکبر میں مبتلا نہ ہو۔

عملی پہلو: اخبتوا کا لفظ ایک حقیقی مومن اور اس کے رب کے درمیان پائے جانے والے تعلق کی بہت ہی اچھی عکاسی کرتا ہے۔ مومن مکمل طور پر اللہ ﷻ اور اس کے بندوں کے لئے عاجزی وانکساری اختیار کرتا ہے۔ اللہ ﷻ کی طرف سے اس پر جو حالت بھی آتی ہے اس پر مطمئن ہوتا ہے اس کے نفس میں ایک ٹھہراؤ ہوتا ہے اس کا دل مطمئن ہوتا ہے اور اسے امن، قرار اور رضا کی کیفیت مل جاتی ہے۔ ایسے لوگوں کے لئے ہمیشہ جنت کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کی بشارت دی گئی ہے۔

علمی و عملی بات: انبیاء کرام علیہم السلام کو جھٹلانے والی جماعت کے برعکس اہل ایمان اپنے پروردگار کے سامنے تواضع اختیار کرتے ہیں جو ایمان کا بہترین مظہر اور ایمان کی پختگی پر بہت بڑی دلیل ہے۔ اللہ ﷻ کی معرفت رکھنے والے اس عظیم اور اکمل ذات سے ڈرتے رہنے کو اپنے لئے معراج سمجھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو اس

عظیم ذات کے سامنے تکبر کرتے ہیں اور اس کی عبادت سے منہ موڑ لیتے ہیں وہ پستی و ذلت کی اتاہ گہرائیوں میں گرتے ہی چلے جاتے ہیں اور بالآخر اپنے بھیانک انجام سے دوچار ہوتے ہیں۔

آیت نمبر ۲۴: کافر کو اندھے اور بہرے سے اور مومن کو دیکھنے اور سننے والے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ کافر حق بات دیکھنے سے اندھا اور حق کے دلائل سننے سے بہرہ بنتا ہے۔ اس کے برعکس مومن حق دیکھ کر اس کی پیروی اور حق کے دلائل کو سن کر باطل سے اجتناب کرتا ہے۔ دونوں کے طرز عمل اور انجام مختلف ہونے کا بیان ہے۔

علمی و عملی بات: یہاں فریقین کے طرزِ عمل کی سادہ مثال سے وضاحت فرمائی ہے۔ مومن اپنی عقل سے کام لینے کے لئے اپنے اعضا و جوارح سے کام لیتا ہے۔ وہ دیکھنے، سننے اور سمجھنے کے بعد حق بات قبول کرتا ہے اس پر عمل پیرا ہوتا ہے، یوں اُسے نجات اور کامیابی نصیب ہو جاتی ہے جب کہ کافر اپنے اعضاء و جوارح سے کام نہیں لیتا، لہٰذا وہ نہ ہدایت حاصل کرتا ہے نہ نصیحت سن سکتا ہے۔ کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ ایسا سوال ہے جس کا جواب واضح ہے۔ یعنی کافر دنیا میں حق کی دلیل سننے کے بعد سنی ان سنی کر دیتا ہے اور حق کی نشانیاں و علامات دیکھ لینے کے بعد بھی پرواہ نہیں کرتا اس لئے وہ اندھے اور بہرے کی طرح ہے جو دن کی روشنی میں بھی کان اور آنکھیں بند کر لینے کے سبب اندھیروں میں بھٹکتا پھرتا ہے، لیکن مومن حق کے دلائل سنتا ہے اور حق کی نشانیوں میں غور و فکر کرتا ہے اس لئے وہ سننے اور دیکھنے والے کی طرح ہے جو روشنی میں اپنی آنکھیں استعمال کرتے ہوئے اپنی منزل کی تلاش کر لیتا ہے، تو ظاہر ہے یہ دونوں برابر ہر گز نہیں ہو سکتے۔

نوٹ: آیات: ۲۵ تا ۶۸ حصہ اول حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ھود علیہ السلام اور حضرت صالح علیہ السلام کے قصوں میں دی گئی ہیں۔

آیت نمبر ۶۹: اللہ ﷻ نے انسانی صورت میں فرشتوں کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف بھیجا۔ فرشتوں کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خدمت میں سلام اور ان کا جواب۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے میزبانی کی طور پر بھنے ہوئے بچھڑے کا گوشت پیش کیا۔

یہ فرشتے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیٹے کی بشارت دینے اور قوم لوط کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے لئے آئے تھے۔ یہ فرشتے انسانی شکل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام عرض کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی کے ہاں داخل ہوتے ہوئے سلام کرنا نہ صرف تمام الہامی تعلیمات میں رائج ایک سنت ہے بلکہ آسمانی فرشتوں کی بھی صفت ہے اور اہل جنّت کے درمیان بھی ایک دوسرے کو سلام کرنے کا رواج عام ہو گا چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے "مگر ایک بات ہو گی سلامتی ہی سلامتی کی۔" (سورۃ الواقعہ ۵۶، آیت: ۲۶)

علمی و عملی بات: اس آیت سے معلوم ہوا کہ سلام کہنا اور سلام کا جواب دینا انبیائے کرام علیہم السلام اور فرشتوں کی سنت ہے، نیز گھر میں موجود اچھے کھانے سے مہمانوں کی تواضع و خدمت کرنا بھی انبیاء کرام علیہم السلام کی سنت و طریقہ ہے۔

مہمان اور میزبان کے متعلق اسلام کا حکم: ا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ جو شخص اللہ ﷻ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنے پڑوسی کا اکرام کرے اور جو شخص اللہ ﷻ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنے مہمان کی دستور کے موافق ہر طرح سے عزت کرے۔ پوچھا: یا رسول اللہ! دستور کے موافق کب تک ہے فرمایا ایک دن اور ایک رات اور میزبانی تین دن کی ہے اور جو اس کے بعد ہو وہ اس کے لئے صدقہ ہے اور جو اللہ ﷻ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو وہ بہتر بات کہے یا خاموش رہے۔ (صحیح بخاری)

۲۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے "مہمان نوازی تین دن ہے اور خصوصی اہتمام ایک دن اور ایک رات کا ہے اور کسی مسلمان آدمی کے لئے حلال نہیں کہ وہ اپنے بھائی کے ہاں (ہی) ٹھہرا رہے حتّٰی کہ اسے گناہ میں مبتلا کر دے۔" صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: اے اللہ ﷻ کے رسول علیہ السلام! وہ اسے گناہ میں کیسے مبتلا کرے گا؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "وہ اس کے ہاں ٹھہرا رہے اور اس کے پاس کچھ نہ ہو جس سے وہ اس کی میزبانی کر سکے (تو وہ غلط کام کے ذریعے سے اس کی میزبانی کا انتظام کرے)۔ (صحیح مسلم)

عملی پہلو: امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے فرمان کے مطابق ایک دن اور ایک رات کی مہمان نوازی کرنا واجب ہے۔ ایک دن اور ایک رات مہمان کی خاطر مدارات کرنی چاہیئے اور دوسرے اور تیسرے دن اس کو معمول کے مطابق کھانا کھلائے۔ مہمان تین دن سے زیادہ قیام نہ کرے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اس کے زیادہ قیام کی وجہ سے میزبان اس کی غیبت کرے یا اس کی وجہ سے مہمان کے معمولات میں خلل ہو یا مہمان کی مصروفیات کی وجہ سے میزبان کو ضرر پہنچے یا وہ اس کے متعلق بدگمانی

کرے اور گناہ میں مبتلا ہو، یہ اس صورت میں ہے جب مہمان، میزبان کے مطالبہ کے بغیر تین دن سے زیادہ قیام کرے لیکن اگر میزبان نے خود مہمان کو زیادہ ٹھہرنے کے لئے کہا ہو یا اس کو علم یا گمان ہو کہ اس کا زیادہ قیام میزبان پر بوجھ نہیں ہے بلکہ وہ اس پر خوش ہے تو پھر اس کے زیادہ قیام کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

آیت نمبر ۷۰: فرشتوں کی کھانے کی طرف رغبت نہ کرنے پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خوف محسوس ہوا۔ جس پر مہمانوں کے فرشتے ہونے اور عذاب دینے کے لئے حضرت لوط علیہ السلام کی قوم طرف بھیجے جانے کی وضاحت کی گئی ہے۔

علمی بات: چونکہ فرشتے انسانی شکل میں آئے تھے، اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام شروع میں انہیں انسان ہی سمجھے اور ان کی مہمانی کے لئے بھنے ہوئے بچھڑے کا گوشت لے آئے لیکن چونکہ وہ فرشتے تھے اور کچھ کھانے کی ضرورت نہیں پڑتی، اس لئے انہوں نے کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا، اس زمانے میں رسم یہ تھی کہ اگر کوئی شخص میزبان کے یہاں کھانا پیش ہونے کے بعد نہ کھائے تو یہ اس بات کی علامت سمجھی جاتی تھی کہ وہ مہمان کی حیثیت سے نہیں آیا بلکہ کسی اور ارادے سے آیا ہے، اس لئے حضرت ابرہیم علیہ السلام نے خوف محسوس کیا، اس موقع پر فرشتوں نے ان کے پاس بھیجے جانے کے مقاصد واضح کر دیئے۔

آیت نمبر ۷۱: فرشتوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور سیدہ سارہ سَلَامٌ عَلَيْهَا کو بیٹے حضرت اسحاق علیہ السلام اور پوتے حضرت یعقوب علیہ السلام کی بشارت دی۔

حضرت سارہ سَلَامٌ عَلَيْهَا کو جب علم ہوا کہ ان کے مہمان فرشتے ہیں تو وہ بھی پاس آ کھڑی ہوئیں اور خوشی میں ہنس پڑیں، پھر فرشتوں نے حضرت سارہ سَلَامٌ عَلَيْهَا کو بیٹے حضرت اسحاق علیہ السلام اور پوتے حضرت یعقوب علیہ السلام کی خوش خبری دی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حضرت ہاجرہ سَلَامٌ عَلَيْهَا کے بطن سے ایک بیٹے یعنی حضرت اسماعیل علیہ السلام پہلے سے موجود تھے لیکن حضرت سارہ سَلَامٌ عَلَيْهَا کی کوئی اولاد نہ تھی، چنانچہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انہیں اس نعمت سے نواز نے کی بشارت عطا کی گئی۔

آیت نمبر ۷۲: حضرت سیدہ سارہ سَلَامٌ عَلَيْهَا نے بڑھاپے اور بانجھ پن کی وجہ سے بیٹے کی خوشخبری ملنے پر تعجب کا اظہار فرمایا۔

علمی بات: یعنی جب بیوی کی عمر ۹۰ سال کے لگ بھگ ہو اور شوہر ۱۰۰ سو سے تجاوز کر چکے ہوں ان حالات میں کسی بچے کا پیدا ہونا خرق عادت نہ سہی حیرت انگیز ضرور ہے اسی بنا پر ان کا حیرت زدہ ہونا بالکل قدرتی بات تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ محترمہ کو اگرچہ اس بات کا یقین تھا کہ ایسا کر دینا اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی قدرت سے باہر نہیں ہے۔ یہ تعجب عرف اور عادت کی بناء پر ہے، چونکہ یہ ولادت عرف اور عادت کے خلاف تھی اس لئے بتقاضائے بشریت وہ اس پر اپنے تعجب کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکیں۔ اس لئے انہوں نے اس پر اظہار تعجب کیا۔ انہوں نے شک کے طور پر یہ بات ہر گز نہیں کہی تھی۔

علمی بات: یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی کو کوئی ناقابل یقین قسم کی خوشخبری سنائی جائے اور وہ اس کے بارے میں از راہ تعجب یوں کہے کہ کیا ایسے فی الواقع ہو سکتا ہے؟ اس سے اس خوشخبری کی عظمت شان اور بڑھ جاتی ہے۔ اس اظہار تعجب میں ایک خاص قسم کی فرط مسرت اور بے پناہ خوشی کا پہلو بھی موجود ہے جو اہل ذوق سے مخفی نہیں۔ سو اس خوشخبری کے ظہور کی راہ میں جو رکاوٹیں تھیں۔ انہوں نے اپنے سوالوں سے ان سب کا ازالہ کرا دیا۔

آیت نمبر ۷۳: فرشتوں نے حضرت سیدہ سارہ سَلَامٌ عَلَيْهَا کو جواب دیا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے فیصلے قابل تعجب نہیں ہوتے کیوں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ جو چاہے کرنے پر قادر ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے گھرانے پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے بے شمار نعمتیں اور برکتیں نازل ہوتی ہی ہیں۔

علمی بات: قدرت خداوندی اتنی بے پایاں اور وسیع ہے کہ اس کے سامنے ہر قسم کا تعجب اور تمام حیرانیاں کم ہیں۔ حضرت سارہ سَلَامٌ عَلَيْهَا کی توجہ جب قدرت الٰہی کی طرف مبذول کرائی گئی تو ان کا تعجب خوشی و مسرت میں بدل گیا۔

علمی بات: یہاں اہل بیت یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے گھر والوں پر رحمت الٰہی اور اس کی بے حساب برکتوں کے نزول کی خوشخبری و بشارتیں عطا کی جا رہی ہیں۔ یہاں مخاطب حضرت سارہ سَلَامٌ عَلَيْهَا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ محترمہ ہیں، لہذا جب حضرت خلیل علیہ السلام کے اہل بیت میں آپ کی زوجہ محترمہ داخل ہیں تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت سے ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کو خارج کرنا کتنی بڑی حماقت و نادانی اور قرآنِ حکیم میں تحریف ہے چنانچہ معلوم ہوا کہ یقیناً "اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا" کی بشارت عظمیٰ میں اولاً اور اصلاً حضور کی تمام ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن داخل ہیں اور اور پھر ان کے ساتھ دوسرے حضرات قدسی صفات رضی اللہ عنہم بھی شامل ہیں۔

یہاں ایک نوٹ مذکور ہے کہ معارف القرآن مین مذکور مضمون "قرآن وحدیث کی روشنی میں اہل بیت" مختصرا لیا جائے، چونکہ قرآن وحدیث متفق علیہ ہیں لہذا اس کے بعد نہ ہمیں وضاحت کی ضرورت باقی رہتی ہے نہ کسی کے اختلاف کی گنجائش۔

آیت نمبر ۷۴: حضرت ابراہیم علیہ السلام کی فرشتوں سے قوم لوط علیہ السلام کے متعلق گفتگو کا ذکر ہے۔ خواہش تھی کہ کسی طرح قوم لوط علیہ السلام سے عذاب ٹل جائے اور اس قوم کو مزید مہلت مل جائے۔

حضرت لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے جو عراق میں ہی ان پر ایمان لا کر ان کے ساتھ وطن سے ہجرت میں ان کے ساتھ شریک تھے۔ بعد میں اللہ تعالیٰ نے انہیں بھی پیغمبر بنا کر سدوم کے شہر میں بھیجا۔ اس شہر کے لوگ شرک کے علاوہ ہم جنس پرستی کی لعنت میں مبتلا تھے۔ جب انہوں نے حضرت لوط علیہ السلام کی بات نہیں مانی تو اللہ تعالیٰ نے ان پر عذاب نازل کرنے کے لئے ان فرشتوں کو بھیجا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ امید تھی کہ شاید یہ لوگ سنبھل جائیں اس لئے وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض گذار ہوئے کہ ابھی ان پر عذاب نازل نہ کیا جائے۔ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام چونکہ اللہ تعالیٰ کی سب سے زیادہ معرفت رکھنے والے ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے حضور عرض گذاری کے سب سے زیادہ جاننے والے ہوتے ہیں، چناچہ انہوں نے ایک شائستہ اصرار کے انداز میں بار باراللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جس طرح عذاب مؤخر کرنے کی فرمائش ودرخواست کی، اس آیت میں اسی پیار بھرے انداز کو جدال سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

علمی بات: جدال (جھگڑنے اور بحث کرنے) کا لفظ جس محبت قرب اور پختہ تعلق پر دلالت کر رہا ہے۔ وہ ہر باذوق شخص سمجھ سکتا ہے جس کا کسی سے اخلاص پر مبنی گہرا تعلق ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرا بندہ میرا خلیل میرے ساتھ ان کے بارے میں جھگڑنے لگا جب اپنے سے کسی اعلیٰ وبرتر ہستی کے ساتھ قریبی تعلق ہوتا ہے اور دونوں طرف سے انتہائی پیار پایا جاتا ہے تب ہی کسی بات پر ضد اور اصرار کیا جاسکتا ہے۔ یہاں بڑی محبت سے حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے اس انداز کا ذکر فرمایا۔

آیت نمبر ۷۵: حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تین صفات کے بیان سے ان کی بہت زیادہ مدح سرائی کی گئی ہے۔ قوم لوط علیہ السلام سے ہمدردی کی وجہ، ان کا نرم دل ہونا اور بردبار ہونا ہے نیز ان کا بہت زیادہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کا بیان ہے۔

علمی بات: حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ استدعا تو منظور نہیں فرمائی گئی کہ قوم لوط سے عذاب کو مؤخر کر دیا جائے، لیکن جس جذبے اور جس انداز سے انہوں نے اللہ تعالیٰ سے رجوع فرمایا تھا، اس آیت مبارکہ میں اس کی بڑے بلیغ انداز میں تعریف فرمائی گئی ہے کہ بے شک حضرت ابرہیم علیہ السلام بڑے بردبار، رقیق القلب (نرم دل) اور (ہر وقت اللہ تعالیٰ کی طرف) رجوع کرنے والے تھے۔ حلیم کہتے ہیں بردبار کو جو بدی کرنے والے سے انتقام لینے میں جلدی نہ کرے۔ اواہ کا معنی ہے: نرم دل، رحیم المزاج جو دوسرے لوگوں کی غمخواری کرے،

منیب کا معنی ہے اس کی طرف رجوع کرنے والا اور اس کی اطاعت کرنے والا۔ جو ہر وقت دل وجان سے اپنے رب کی طرف راغب رہے۔

علمی بات: حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب یہ پتا چلا کہ فرشتے حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کو عذاب دینے جارہے ہیں تو ان کو بہت زیادہ رنج ہوا اور وہ اللہ تعالیٰ سے بہت ڈرے اس لئے فرمایا: وہ حلیم اور اواہ ہیں اور ان کو منیب اس لئے فرمایا کہ جو شخص دوسروں پر عذاب کی وجہ سے اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے تو وہ اپنے معاملہ میں اللہ تعالیٰ سے کتنا ڈرنے والا اور اس کی طرف کتنا زیادہ رجوع کرنے والا ہو گا۔

آیت نمبر ۷۶: اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قوم لوط علیہ السلام کی سفارش نہ کرنے کی ہدایت دی۔ بتایا گیا کہ اِن لوگوں پر عذاب ضرور نازل ہو گا جس کو ٹالا نہیں جاسکے گا۔

علمی بات: حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی فطری شفقت، نرم خوئی اور رحم دلی سے اس قوم پر ترس کھا کر حق تعالیٰ کی جناب میں کچھ سفارش کرنا چاہتے تھے اسی کا جواب دیا گیا کہ اے ابراہیم! اس معاملہ اور بات کو چھوڑ دو۔ ان بدبختوں کو مدتوں سمجھایا گیا لیکن وہ اپنے کفر وشرک سے باز نہ آئے۔ ان کے لئے عذاب مقدر ہو چکا ہے۔ اب یہ فیصلہ بدلا نہیں جاسکتا۔ کیونکہ مشرکین کے لئے بخشش نہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیل کو ان کے حق میں سفارش کرنے سے روک دیا۔

نوٹ: آیات: ۷۷ تا ۹۵ حصہ اوّل میں حضرت لوط علیہ السلام اور حضرت شعیب علیہ السلام کے قصّوں میں دی گئی ہیں۔

آیت نمبر ۹۶: آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رسالت کا بیان ہے۔ انہیں احکام، معجزات اور دلائل دے کر بھیجا گیا۔

علمی بات: مفسرین کرام نے نشانیوں سے مختلف چیزیں مراد لی ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ اللہ ﷻ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نو واضح معجزے عطا فرمائے تھے جن کا ذکر سورۃ الاسراء، آیت:۱۰۱، میں ہوا ہے۔

۱۔ عصا	۲۔ یدبیضاء	۳۔ طوفان
۴۔ ٹڈیاں	۵۔ جوئیں	۶۔ مینڈک
۷۔ خون	۸۔ پیداوار میں کمی	۹۔ جانوں میں کمی۔

بعض مفسرین نے پیداوار اور جانوں میں کمی کی جگہ پہاڑ کو سائبان کی طرح اوپر اٹھالینا اور سمندر کو چیرنا شمار کیا ہے، ان معجزات کو آیات اس لئے فرمایا کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کی صداقت پر روشن دلائل تھے۔

۲۔ "سُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ" سے مراد کھلے ہوئے اور روشن معجزات عصا اور یدبیضاء ہیں، کیونکہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بہت مشہور معجزے ہیں۔ جو سب سے پہلے موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے سامنے اپنی نبوت کی دلیل کے طور پر پیش کیئے۔ ان کی خصوصیت کے پیش نظر انہیں علیحدہ بھی ذکر فرمایا، حالانکہ یہ آیات میں داخل تھے۔

۳۔ "سُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ" سے مراد اللہ ﷻ کا وہ پیغام ہے جو حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام فرعون کے پاس لے کر گئے اور وہ قوی عقلی اور فطری دلائل ہیں جو لاٹھی پھینکنے سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے مکالمہ کے دوران بیان فرمائے اور وہ ان دلائل سے لاجواب ہو کر قید کی دھمکی دینے لگا اور معجزے کا مطالبہ کرنے لگا۔ (سورۃ طٰہٰ ۲۰، آیات:۴۷ تا ۵۵) اور (سورۃ شعراء ۲۶، آیات:۱۵ تا ۲۹)۔

۴۔ سُلْطَانٌ مُّبِیْنٌ سے اس کے لغوی معنی (یعنی کھلا ہوا غلبہ) مراد لئے گئے ہوں، کیونکہ فرعونیوں کے مقابلہ پر بار بار حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نمایاں غلبہ اور فتح مبین حاصل ہوتی رہی۔ یہ سب تفاسیر صحیح ہیں۔

آیت نمبر ۹۷: حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا۔ آل فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بجائے فرعون کے گمراہ کن احکامات کی پیروی کی۔ حالانکہ فرعون کا طریقہ سراسر جہالت اور کفر و سرکشی پر مبنی تھا۔ فرعون کے ساتھ اس کے سرداروں کا ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ قوم اپنے تمام امور میں انہیں سرداروں کی پیروی کرتی تھی۔

علمی بات: فرعون اور وزیروں کی جہالت: بالکل واضح اور روشن نشانیاں دیکھ کر بھی فرعونیوں نے پیغمبر علیہ السلام کی بات نہ مانی، اسی اللہ ﷻ کے دشمن کے حکم پر چلتے رہے۔ حالانکہ اس کی کوئی بات ٹھکانے کی نہ تھی، جسے مان کر انسان بھلائی حاصل کر سکتا۔

آیت میں فرعون کے گروہ کی جہالت و حماقت کا اظہار ہے کہ فرعون الوہیت کا دعویدار تھا باوجود یہ کہ اپنے مصاحبین کی طرح معمولی انسان تھا علی الاعلان کفر و شرک اور ظلم کرتا تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام ہادی برحق تھے۔ آپ علیہ السلام کا قول مبنی برحق تھا، عقل و نقل کی شہادت اور معجزات کی تائید آپ علیہ السلام کے قول کو ثابت کر رہی تھی پھر بھی فرعون کے ساتھی ایسے احمق، کند ذہن تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے ہادی برحق کی اتباع سے روگرداں اور فرعون جیسے باطل پرست کے پیروکار تھے۔

آیت نمبر ۹۸: فرعون اور اس کی پیروی کرنے والوں کے قیامت کے دن، انجام بیان کیا گیا ہے۔ فرعون جس طرح دنیا میں اپنی قوم کا رہبر تھا اسی طرح قیامت کے دن وہ اپنی قیادت میں اپنی قوم کو جہنم کے اندر لا گرائے گا۔ اسی ٹھکانہ میں ان سب کو ہمیشہ ہمیشہ رہنا ہو گا۔

علمی بات: جس طرح دنیا میں آلِ فرعون آنکھیں بند کئے فرعون کے پیچھے چلتے رہے جب قیامت کا دن ہو گا تو اس روز بھی ان کا حشر اپنے اس لیڈر کے ساتھ ہو گا جس کی ظالم حکومت اور غلط قیادت نے انہیں دنیا میں برباد کیا تھا لہٰذا آج جو بھی ٹھکانہ اس کا ہو گا وہی آلِ فرعون کا ہو گا۔ اور ایسا بھی نہیں کہ اگر ان کے لیڈر اپنی گمراہی کی وجہ سے گرفتار عذاب ہوا تو پیروکاروں کو اس لئے معاف کر دیا جائے گا کہ انہوں نے خود تو برائی کا راستہ اختیار نہیں کیا تھا بلکہ یہ تو غلط قیادت کی وجہ سے گمراہ ہو گئے تھے اس لئے سارا مؤاخذہ ان کے لیڈروں سے ہی ہونا چاہیئے ایسا نہیں ہو گا بلکہ گمراہ رہنما کو بھی سزا ملے گی اور ان کے پیروکاروں پر بھی عذاب آئے گا۔ کیونکہ اللہ ﷻ نے ان کو غور و فکر کی جو صلاحیتیں دی تھیں ان سے کام لیکر انہوں نے حق و باطل میں امتیاز کیوں نہ کیا۔ وہ دانستہ کیوں اندھے بنے رہے۔ کسی کو رہنما بنانے والی اس کی قوم ہوتی ہے کیا یہ کوئی کم جرم ہے؟ قیامت کے دن بھی ان کا رہنما آگے آگے ہو گا۔ اور یہ نامراد پیروکار اپنی قسمت کو روتے ہوئے اپنے رہنما کو کوستے ہوئے اس کے پیچھے جا رہے ہونگے۔ ہر گمراہ لیڈر و رہنما اور اس کے ماننے والے اسی طرح میدان حشر میں حاضر کیے

جائیں گے اور انہیں جہنم میں پھینکا جائے گا چنانچہ حدیث مبارک ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: امرؤ القیس جہنم کی طرف سے شعراء کا جھنڈا اُٹھانے والا ہو گا۔ (مسند احمد)

مذکورہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ فرعون اپنے پیروکاروں کے آگے اس طرح جارہا ہو گا جس طرح قافلہ کی ضروریات کے لئے پانی تلاش کرنے والا قافلہ لشکر کے آگے چلتا ہے۔ لیکن ان بدنصیبوں کی بدنصیبی کا کیا کہنا کہ جس گھاٹ پر فرعون انہیں لئے جارہا ہے وہاں میٹھا اور ٹھنڈا پانی نہ ہو گا جو ان کی تشنگی دور کرے گا اور ان کے گھبرائے ہوئے دلوں کی تسکین کا باعث ہو گا۔ بلکہ ابلتا اور کھولتا ہوا پانی ہو گا۔ اگر وہ پئیں گے تو ان کے منہ اور گلے جل جائیں گے اور ان کی آنتیں پھٹ جائیں گی اور اگر نہیں پئیں گے تو شدت پیاس سے تڑپتے رہیں گے۔

آیت نمبر ۹۹: لعنت سے مراد رحمت الٰہی سے دوری اور محرومی ہے۔ فرعون اور اس کے پیروکار دنیا میں رحمت الٰہی سے محروم رہے اور قیامت کے دن بھی اسی محرومی کے شکار رہیں گے اور دنیا میں بھی لوگوں نے لعنت بھیجی اور آخرت میں بھی پڑے گی۔

علمی بات: "رفد" لغت میں اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی چیز کو سہارا دینے کے لئے اس کے ساتھ رکھی جاتی ہے اور اس کا معنی مدد کرنا اور بخشش بھی آیا ہے یعنی جو مدد انہیں دی گئی جو بخشش ان پر کی گئی وہ بہت بُری تھی یعنی دنیا میں بھی سب لوگ ان پر لعنت بھیجتے رہے اور قیامت کے دن بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

قیامت تک آنے والی ہر نسل انہیں بُرائی سے یاد کرے گی اور آخرت میں تمام اولین وآخرین ان پر لعنت کریں گے اس سے معلوم ہوا کہ دنیا کی رسوائی اور نیک لوگوں کا ہمیشہ کسی پر لعنت کرنا اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا عذاب ہے اور ذکر خیر کرنا اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی رحمت ہے۔

آیت نمبر ۱۰۰: جن بستیوں کے حالات بیان ہوئے ان میں کچھ کے کھنڈرات نشان عبرت کے لئے موجود ہیں۔ "حصید" کا لفظ اس کھیت کے لئے استعمال ہوتا ہے جس کی فصل کاٹ دی گئی ہو۔ عذاب سے مٹ جانے والی بستیوں کو فصل کٹنے کے بعد کھیت کی ویرانی کے منظر سے تشبیہ دی گئی ہے۔

علمی بات: سورہ ھود ۱۱، آیت :۶۶ تا ۹۱ میں سات انبیاء کرام علیہم السلام حضرت صالح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت لوط علیہ السلام، حضرت اسحٰق علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت شعیب علیہ السلام، حضرت نوح علیہ السلام کے نام آئے ہیں۔ بعض امتوں کی بربادی کا حال بیان فرمانے کے بعد یہاں فرمایا کہ ہم آپ کو ان بستیوں کی خبریں سناتے ہیں۔ ان ہلاک شدہ بستیوں میں سے بعض بستیاں دنیا میں موجود ہیں کچھ تو کھنڈروں کی صورت میں ہیں اور کچھ ایسی ہیں کہ ان کے رہنے والوں کی ہلاکت کے بعد دوسرے لوگ ان میں رہنے لگے مثلاً فرعون کا ملک مصر فرعون کے غرق ہونے کے بعد بھی باقی رہا۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے، وَسَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ اور کچھ ایسی بستیاں ہیں جن کا بالکل خاتمہ ہو گیا جیسے عاد وثمود اور قوم لوط کی بستیاں ایسی تباہ ہوئیں کہ بعد میں آباد نہ ہو سکیں۔ ان قوموں کی ہلاکت کے واقعات مخاطبین نے پہلے بھی سن رکھے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی بتا دیئے ان میں سے بعض بستیوں کے آثار موجود ہیں اور مشرکین مکّہ ادھر کو گزرتے بھی ہیں لہٰذا انہیں ان سے عبرت حاصل کرنی چاہیئے۔

آیت نمبر ۱۰۱: ہلاک شدہ قوموں نے خود شرک اور ہٹ دھرمی کا ارتکاب کر کے اپنے اوپر ظلم کیا۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا عذاب آنے پر ان کے خود ساختہ معبود ان کے کچھ کام نہ آئے۔ ان معبودوں کے متعلق تمام عقائد باطل ثابت ہوئے اور وہ ان لوگوں کی ہلاکت اور مزید تباہی کا باعث بنے۔

علمی بات: اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے کسی کو بے قصور نہیں پکڑا جس سے ظلم کا وہم اور شائبہ ہو سکے، جب وہ جرائم کے ارتکاب میں حد سے آگے نکل گئے اور اس طرح اپنے آپ کو کھلم کھلا سزا کا مستحق ٹھہرا دیا تب اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا عذاب آیا۔ پھر دیکھ لو جن معبودوں (دیوتاؤں) کا انہیں بڑا سہارا تھا اور جن سے بڑی بڑی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں وہ ایسی سخت مصیبت کے وقت کچھ بھی کام نہ آئے۔ یعنی یہ جھوٹے دیوتا اور معبود اپنے پجاریوں کی کوئی مدد تو کیا کرتے الٹے ان کی ہلاکت کا سبب ہی بن گئے اور اس سے ان کی تباہی وبربادی میں اضافہ ہی ہوا۔ نہ یہ ان کی پوجا کرتے نہ ہلاکت کی سزا میں مبتلا ہوتے۔

آیت نمبر ۱۰۲: کسی قوم کے ظلم پر اُتر آنے کی وجہ سے ہی پر اس کی گرفت ہوتی ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی پکڑ سخت اور دردناک ہوتی ہے جس سے کوئی ظالم نہیں بچ پاتا۔

علمی بات: یعنی جن بستیوں کے باشندے ظلم اور کفر کے خوگر ہو جاتے ہیں اور باز نہیں آتے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ ان کی گرفت کرتا ہے تو اس کی گرفت ایسی ہی ہوا کرتی ہے کہ پھر ان کو تباہ وبرباد ہی کر کے چھوڑتا ہے کیونکہ اس کی گرفت سخت اور دردناک ہے۔ ان واقعات میں اس شخص کے لئے بڑی عبرت ہے جو آخرت کے عذاب سے ڈرتا ہو اور عبرت کی وجہ بالکل ظاہر ہے کہ جب دنیا کا عذاب ایسا سخت ہے جو آخرت کے مقابلے میں بہت ہلکا ہے تو قیامت جو کہ دار الجزاء ہے اس کا عذاب کیسا سخت ہو گا۔

آیت نمبر ۱۰۳: آخرت کی جواب دہی سے ڈرنے والے لوگ ہمیشہ نافرمانوں کے انجام سے عبرت حاصل کرتے ہیں۔

"یَوْمٌ مَّشْهُود" کے دو مفہوم ہیں:

۱۔ تمام لوگ اس دن صرف جمع ہی نہیں کئے جائیں گے بلکہ انہیں بازپرس کے لئے اللہ ﷻ کے سامنے حاضر بھی کیا جائے گا۔

۲۔ لوگوں کے مقدمات پر شہادتیں قائم کی جائیں گی اور سخت کاروائی تمام لوگوں کی موجودگی میں ہوگی۔

علمی بات: دنیا جو "دارالعمل" ہے، جب اس میں کفر و شرک اور تکذیب انبیاء کرام علیہم السلام پر سزائیں ملتی ہیں اور اس قدر سخت ملتی ہیں تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آخرت میں جو خالص "دارالجزاء" ہے کیا کچھ سزا ان جرائم پر ملے گی؟ اور کیا صورت نجات اور بچاؤ کی ہوگی۔ عقلمند آدمی کے لئے جو اپنا انجام سوچ کر ڈرتا رہتا ہے۔ اس چیز میں بڑی عبرت و نصیحت ہے۔ تمام دنیا کا بیک وقت فیصلہ اسی دن ہوگا جب سارے اولین و آخرین اکٹھے کئے جائیں گے اور کوئی شخص غیر حاضر نہ رہ سکے گا گویا اللہ ﷻ عدالت کی سب سے بڑی پیشی کا دن وہی ہوگا۔

آیت نمبر ۱۰۴: قیامت کا اپنے وقت مقررہ پر آنے کا بیان ہے۔ سزا و جزا کا فوری وقوع نہ ہونا اس کا ایک وقت متعین ہونے کی وجہ سے ہے۔

علمی بات: مَّعْدُوْدٍ کا معنی ہے گنا ہوا۔ گنی ہوئی چیز آخر ختم ہو جاتی ہے، یعنی قیامت کی مہلت گنتی کے چند دن ہیں، جیسے روزوں کے متعلق فرمایا: وَاَيَّاماً مَّعْدُوْدَاتٍ۔ سورۃ البقرۃ ۲، آیت: ۱۸۴ گنے ہوئے چند دنوں میں۔ "اور وہ گنتی صرف اللہ ﷻ کے علم میں ہے، قیامت نہ اس سے پہلے آسکتی ہے، نہ اس سے مؤخر ہو سکتی ہے"۔ یعنی قیامت کے دن کا وقوع بعض مصلحتوں کی بنا پر ایک وقت معلوم و محدود تک ملتوی کر رکھا ہے اور اس وقت کو سوائے اللہ ﷻ کے کوئی نہیں جانتا۔

قیامت کے آنے میں تاخیر اس لئے ہے کہ اللہ ﷻ نے یہ بات طے فرمائی ہے کہ جب تک دنیا کے تمام پیدا ہونے والے لوگ پیدا نہ ہو جائیں۔ اور ان کے پیدا ہونے کے لئے جو مدت مقرر ہے وہ پوری نہ ہو جائے اس وقت تک قیامت نہ آئے گی۔ جب دنیا کی یہ مدت ختم ہو جائے گی تو قیامت کا دن قائم ہوگا اور ہر شخص کو اس کے عمل کے موافق جزا و سزا ملے گی۔

آیت نمبر ۱۰۵: کلام نہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ اللہ ﷻ کے حضور کسی کو بحث و تکرار کرنے کی ہمت نہ ہوگی۔ اس دن انسانوں کا ایک گروہ گناہ گاروں پر مشتمل ہوگا اور دوسرا نیکوکاروں پر۔

فرمانِ نبوی ﷺ: سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اس دن انبیاء کرام علیہم السلام کے علاوہ کسی کو گفتگو کی ہمت نہیں ہوگی اور انبیاء کرام علیہم السلام کی زبان پر بھی اس دن صرف یہی ہوگا کہ یا اللہ! میری ذات (پر رحم فرمائیے)، میری ذات (پر رحم فرمائیے)۔" (صحیح بخاری)

علمی بات: قیامت کا دن بہت طویل ہوگا اس میں لوگوں کے احوال مختلف ہوں گے بعض حالتوں میں تو شدت اور ہیبت کی وجہ سے کسی کو بھی اذانِ الٰہی کے بغیر بات زبان پر لانے کی قدرت نہ ہوگی اور بعض احوال میں اذن دیا جائے گا کہ لوگ اللہ ﷻ کی اجازت سے کلام کریں گے اور بعض احوال میں جب دہشت کی شدت کم ہوگی، اس وقت لوگ اپنے معاملات میں جھگڑیں گے اور اپنے مقدمات پیش کریں گے۔

عملی پہلو: اہلِ علم نے **"سعادت"** یعنی نیک بختی کی پانچ علامتیں بیان کی ہیں۔

۱۔ دل کی نرمی ۲۔ کثرت گریہ یعنی اپنے گناہوں پر اور اللہ ﷻ کی یاد میں رونا ۳۔ دنیا سے نفرت

۴۔ کم امیدیں ۵۔ شرم و حیا۔

اور **"شقاوت"** یعنی بدبختی کی علامت بھی پانچ چیزیں ہیں۔

۱۔ دل کی سختی ۲۔ آنکھ کی خشکی یعنی اپنے گناہوں پر رونا نہ آنا ۳۔ دنیا کی رغبت

۴۔ دراز امیدیں ۵۔ بے حیائی۔

علمی بات: "شقی" یعنی وہ بدبخت جس کے لئے اس کی بد عملی کی وجہ سے آگ واجب ہوگئی۔ "سَعِيْد" وہ خوش قسمت جس کے لئے اس کے نیک اعمال کی وجہ سے جنت واجب ہوگئی۔

قیامت کے روز نوع انسانی صرف دو گروہوں میں بانٹی جائے گی۔ ایک گروہ سعید ہو گا جنہوں نے اپنی دنیوی زندگی میں اپنے رب کو پہچانا اور اس کی بندگی میں اپنی عمر بسر کی۔ ان کو الگ کر دیا جائیگا اور ان کو سعادت کے اعزاز سے نوازا جائے گا۔ اور دوسرا گروہ شقی جو عمر بھر اپنے مالک کو بھلائے رہے اور اپنی نفس پرستی میں مگن رہے ان پر بد بختی اور بد نصیبی کی پھٹکار پڑتی ہو گی۔

آیت نمبر ۱۰۶: ان نافرمان لوگوں کے انجام کا بیان ہے جنہیں دوزخ میں داخل کیا جائے گا۔ ان کا تکلیف اور غم سے چیخ چیخ کر رونے کا ذکر ہے۔

علمی بات: نیک کاموں کے حصوں میں اللہ ﷻ کی مدد شامل حال ہونا سعادت ہے اور اس کی ضد شقاوت ہے۔ سعادت کی دو قسمیں ہیں: سعادت دنیوی اور سعادت اخروی۔ سعادت اخروی جنت ہے اور سعادت دنیوی کی تین صورتیں ہیں: ۱۔ روح کی سعادت، ۲۔ بدن کی سعادت، ۳۔ خارجی سعادت۔

روح کی سعادت اللہ ﷻ کے ذکر اور اس کے احکام پر عمل کرنے سے ہوتی ہے اور بدن کی سعادت صحت اور قوت سے مفید غذاؤں-اور دواؤں سے حاصل کی جاتی ہے اور خارجی سعادت انسان کے نیک مطلوب پر معاونت کرنے سے حاصل ہوتی ہے اور اس کی ضد شقاوت ہے۔ (المفردات)

سعادت کا معنی نفع، معاونت، اللہ ﷻ کا نیک کاموں کی توفیق دینا یا ان کاموں کی توفیق دینا جن سے اللہ ﷻ راضی ہو۔ (تاج العروس)

زفیر کہتے ہیں اتنا لمبا اور گہرا سانس لینا جس سے سینہ پھول جائے اور اس گہرے سانس کو باہر نکالنا شہیق کہلاتا ہے۔ (المفردات)

امام طبری رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: شدید اور سخت آواز زفیر ہے اور پست اور کمزور آواز شہیق ہے۔

علمی بات: دوزخیوں کے چیخنے چلانے کی تعبیر یہ ہے کہ جو بد بخت ہوں گے وہ دوزخ میں پڑے ہوں گے اور اس میں ان کا حال یہ ہو گا کہ وہ وہاں چیخیں اور چلائیں گے اور اس طرح چیخنے اور چلانے کا ان کو کوئی فائدہ بھی نہیں ہو گا۔ زفیر و شہیق کے فرق کو سمجھنے کے لئے ایک مثال اختیار کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ زفیر اس آواز کو کہتے ہیں جو گدھا مینگتے وقت ابتدائی طور پر نکالتا ہے اور جو تیز ہوتے ہوتے شہیق تک پہنچ جاتی ہے اور اس آخری آواز کو "شہیق" کہا جاتا ہے۔ ان لفظوں میں جو حقارت کا پہلو ہے وہ بالکل واضح ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ وہاں چیخیں و چلائیں یا روئیں پیٹیں پر ان کا ٹھکانہ بہر حال وہی ہو گا۔ ہاں! اگر علم الٰہی میں کچھ سزا پانے کے بعد اگر کسی مسلمان کو وہاں سے نکالا جانا منظور ہو تو تو وہ اللہ ﷻ ہی جانتا ہے۔

آیت نمبر ۱۰۷: دوزخ ان مجرمین کا دائمی ٹھکانہ ہو گا۔ آسمان اور زمین سے مراد آخرت کے آسمان و زمین ہیں۔ جہنم سے نکالنے کا استثنا اہل توحید میں سے ان گنہگاروں کے لئے ہے جن کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہو گا۔

علمی بات: قرآنِ کریم ہی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آخرت میں وہاں کے حالات کے مطابق دوسرے زمین و آسمان پیدا کئے جائیں گے (دیکھئے سورۃ ابراہیم ۱۴، آیت ۴۸، سورۃ الزمر ۳۹، آیت: ۲۴ تا ۷۴) اور چونکہ وہ زمین و آسمان ہمیشہ رہیں گے اس لئے آیت کا مطلب یہ ہوا کہ وہ لوگ بھی دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔

علمی بات: جہنم سے نکالنے کے استثناء کی ٹھیک ٹھیک مراد تو اللہ ﷻ ہی کو معلوم ہے، لیکن اس سے بظاہر ایک تو یہ حقیقت واضح فرمائی گئی ہے کہ کسی کے عذاب و ثواب کا تمام تر فیصلہ اللہ ﷻ ہی کے اختیار میں ہے، دوسرے یہ یہ بات واضح ہے اللہ ﷻ نے اپنی مشیت بیان فرمادی ہے کہ وہ کافروں میں سے کسی کو بھی چھوٹ نہیں دیگا بلکہ وہ ہمیشہ ان کو جہنم کے عذاب میں مبتلا رکھے گا۔

علمی بات: مادامت کے الفاظ بطور محاورہ استعمال کئے گئے ہیں کیونکہ اہل عرب دوام اور لا محدود مدت بیان کرنے کے لئے یہی الفاظ استعمال کرتے تھے ورنہ یہ موجودہ زمین و آسمان تو قیامت کے وقت ختم کر دیے جائیں گے۔ البتہ ظاہری الفاظ کا لحاظ رکھتے ہوئے ان سے عالم اخروی کے زمین و آسمان مراد لئے جاسکتے ہیں۔

علمی بات: اس آیت میں ان گمراہ لوگوں کا رد ہے جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ ﷻ نے اشیاء میں جو تاثیریں رکھ دی ہیں انہی کے مطابق ہی افعال کے نتائج بر آمد ہوتے ہیں اور ان میں ردو بدل ناممکن ہے یہ عقیدہ دراصل اللہ ﷻ کی قدرت کاملہ کا انکار ہے وہ اس کی مثال یہ دیتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے زہر کھالیا ہے تو وہ لازماً مر جائے گا اور موت ایسی یقینی ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔ جب کہ اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ اگر اللہ ﷻ چاہے تو زہر کھانے والے کو بھی بچا سکتا ہے۔ اسی طرح اگر اللہ ﷻ چاہے تو کسی مجرم کو تھوڑی بہت سزا دے کر یا سزا دیئے بغیر ہی معاف کر سکتا ہے جیسا کہ گناہگار مسلمانوں کے ساتھ ہو گا۔

فرمان نبوی ﷺ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جب تم میں سے کوئی شخص دعا مانگے تو پختگی کے ساتھ مانگے، یہ نہ کہے کہ اے اللہ! اگر تو چاہے تو مجھے دے دے، اس لئے کہ اللہ ﷻ پر کوئی جبر کرنے والا نہیں۔" (صحیح بخاری، صحیح مسلم)۔

آیت نمبر ۱۰۸: اہل جہنم کے برعکس اب سعادت مند بندوں کے انجام کا بیان ہے۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ اللہ ﷻ کی عطا کردہ جنت اور اس کے نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے رہیں گے۔ جنت کی نعمتیں ابدی ہوں گی جن سے وہ کبھی محروم نہیں ہوں گے۔

فرمان نبوی ﷺ: سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جب اہل جنت جنت میں اور اہل دوزخ دوزخ میں داخل ہو جائیں گے تو موت کو لایا جائے گا، پھر اس کو جنت اور دوزخ کے درمیان رکھ کر ذبح کر دیا جائے گا۔ پھر ایک پکارنے والا پکار لگائے گا کہ اے جنت والو! (اب) موت نہیں آئے گی اور اے دوزخ والو! (اب) موت نہیں آئے گی۔ اس اعلان سے جنت والوں کی خوشی میں اضافہ ہو جائے گا اور دوزخ والوں کا غم بڑھ جائے گا۔" (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: ہم نے کہا اے اللہ ﷻ کے رسول ﷺ! آپ ﷺ ہمیں جنت کے بارے میں بتلائیں کہ اس کی عمارت کیسی ہو گی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ایک اینٹ سونے کی اور ایک اینٹ چاندی کی ہو گی، اس کا گارا انتہائی تیز مہکنے والی کستوری کا اور اس کے کنکر لولو اور یاقوت کے موتی ہوں گے اور اس کی مٹی زعفران ہو گی، جو آدمی جنت میں داخل ہو جائے گا، وہ خوشحال ہو گا، کبھی بدحال نہیں ہو گا، وہ وہاں ہمیشہ ہمیشہ رہے گا، اسے موت نہیں آئے گی، اس کا لباس بوسیدہ نہیں ہو گا اور اس کا شباب زائل نہیں ہو گا۔ (صحیح مسلم)

عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ: اس کے معنی ہیں "غَيْرَ مَقْطُوْعٍ" یعنی نہ ختم ہونے والی عطا۔ اس جملے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ جن کو بھی جنت میں داخل کیا جائے گا ان کا یہ دخول عارضی نہیں، ہمیشہ کے لئے ہو گا اور تمام جنتی ہمیشہ اللہ ﷻ کی عنایات اور اس کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے رہیں گے، اس میں کبھی اختتام نہیں ہو گا۔

آیت نمبر ۱۰۹: مشرکین کے تمام مشرکانہ عقائد غلط ہیں وہ اپنے باپ دادا کی محض اندھی تقلید کر رہے ہیں۔ ان کی سرکشی کا انہیں مکمل بدلہ دیا جائے گا جس میں کچھ کمی نہیں کی جائے گی۔

علمی بات: اس آیت میں بظاہر رسول اللہ ﷺ کو خطاب ہے لیکن اس سے مراد عام خطاب ہے کیونکہ بت پرستوں کی عبادت کے باطل ہونے کے متعلق نبی کریم ﷺ کے شک کرنے کا تو کسی طرح بھی تصور ہی نہیں کیا جا سکتا اور یہ کہ بت پرست جن بتوں کی عبادت کرتے ہیں ان کے پاس ان کی پرستش پر کوئی دلیل نہیں ہے وہ صرف اپنے آباؤ اجداد کی اندھی تقلید کرتے ہیں۔ نیز یہ بھی بتلایا گیا کہ ان کو ان کی سرکشی کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا جس میں کوئی کمی نہیں ہو گی۔

اس ارشاد سے حسب ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں:

۱۔ ان کی بت پرستی کی سزا میں ان کے لئے جو عذاب تیار ہے ان کو وہ عذاب پورا پورا دیا جائے گا اور اس میں کوئی کمی نہیں ہو گی۔

۲۔ ہر چند کہ انہوں نے کفر کیا ہے اور حق سے روگردانی کی ہے لیکن دنیا میں ان کے رزق اور معیشت کا جو حصہ مقرر ہے اس میں کوئی کمی نہیں ہو گی۔

۳۔ ان کو ہدایت پر لانے کے لئے جن اسباب کی ضرورت ہے وہ سب مہیا کئے جائیں گے مثلاً واضح دلائل، رسول علیہ السلام کو بھیجنا، کتاب نازل کرنا اور ان کے شبہات کا ازالہ کرنا وغیرہ ان سب میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے یہ تینوں باتیں مراد ہوں۔

آیت نمبر ۱۱۰: قرآنِ حکیم کی تکذیب کئے جانے پر رسول اللہ ﷺ کی غم گساری کی جا رہی ہے۔ ہر دور میں اللہ ﷻ کی کتاب سے اختلاف کرنے والے موجود رہے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات عطا کئے جانے پر ان کی قوم کے ایک گروہ نے ان سے بھی اختلاف کیا۔ ایسے لوگوں کو اصلاح کے لئے مہلت دی جاتی ہے۔ مہلت سے فائدہ نہ اٹھانے والوں کو مقررہ وقت پر سزا دی جائے گی۔ مشرکین مکہ کا قرآنِ حکیم کے بارے میں گہرے شک میں مبتلا ہونے کا ذکر ہے۔

علمی بات: اس آیت میں یہ بیان فرمایا ہے کہ یہ کافروں کی کوئی نئی روش نہیں ہے بلکہ ہمیشہ سے کفار کا انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ یہی رویہ رہا ہے پھر اللہ ﷻ نے اس کی ایک مثال بیان فرمائی کہ اللہ ﷻ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل فرمائی تو ان کی قوم کے لوگوں نے اس میں اختلاف کیا بعض اس پر ایمان لے آئے اور بعض اس کے انکار پر ڈٹے رہے اور مخلوق کا ہمیشہ یہی وتیرہ رہا ہے۔

علمی بات: لوگ اکثر دیکھتے ہیں کہ زمین پر بیشمار انسان ایسے ہیں جو اللہ ﷻ کے احکام کو نہیں مانتے۔ وہ اللہ ﷻ کے احکامات سے آزاد ہو کر اپنی مرضی کے زندگی گزارتے ہیں۔ پھر بھی ان کا کچھ نہیں بگڑتا ہوا بظاہر نظر نہیں آتا۔ یہ بظاہر کامیاب نظر آتے ہیں۔ اور ظاہری طور پر یہاں یہ بھی دکھائی نہیں دیتا کہ اللہ ﷻ کے وفاداروں کو کوئی خصوصی انعام مل رہا ہو یا پھر اللہ ﷻ کے نافرمانوں کو کوئی خاص سزا بھگتنی پڑتی ہو۔ اس بنا پر لوگوں کو شک ہونے لگتا ہے۔ ان کو یقین نہیں آتا کہ انسانوں کا جو انجام مسلسل وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اس کے سوا بھی کوئی انجام ان بُرے لوگوں کے لئے مقدر ہے۔! یہاں قرآنِ حکیم بتاتا ہے کہ لوگوں

کا مسلسل غیر حق پر چلنا اس وجہ سے نہیں ہے کہ انہوں نے اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور کیا اور پھر اس کو معقول پا کر اسے اختیار کر لیا۔ اس کا سبب در اصل رواج کی پیروی ہے نہ کہ روشن اور واضح دلیل کی۔

اس کے باوجود ان لوگوں کے عمل کا انجام ان کے سامنے نہیں آتا تو اس کا سبب مہلت اور امتحان ہے۔ زمین پر موت سے پہلے کی زندگی جانچ پڑتال کی زندگی ہے۔ اس لئے موت تک انسان کو یہاں ڈھیل دی جارہی ہے کہ وہ جو چاہے بولے اور جو چاہے کرے۔ موت اس مقررہ مدت کا خاتمہ ہے۔ موت کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو مقام امتحان سے اٹھا کر مقام نتائج میں پہنچا دیا جائے۔ وہاں ہر ایک کو وہی ملے گا جس کا وہ فی الواقع مستحق تھا اور ہر ایک سے وہ چھن جائے گا جس کو اس نے استحقاق کے بغیر اپنے گرد جمع کر رکھا تھا۔

علمی بات: جو نافرمان لوگ بظاہر دنیا کی زندگی میں مطمئن نظر آتے ہیں ان کے دل کی دنیا بالکل ویران ہوتی ہے، اور وہ حقیقی چین وسکون سے ناآشنا اور رحت وآرام سے کوسوں دور ہوتے ہیں ان کے دلوں کا ان کی محبتیں بناوٹی ہوتی ہیں اور وہ اپنی زندگی سے بھی عاجز اور اس کے سامنے بے بس ہوتے ہیں لیکن دنیاوی رکھ رکھاؤ کی وجہ سے ایسا ظاہر کرتے ہیں کہ بظاہر وہ بہت مطمئن اور آسودہ ہیں۔

آیت نمبر ۱۱۱: ہر ایک کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ اللہ ﷻ ہر ایک کے اعمال سے پوری طرح باخبر ہے۔

اس کا معنی یہ ہے کہ جس نے رسول علیہ السلام کی تصدیق کی یا رسول علیہ السلام کی تکذیب کی یا جس کو دنیا میں جلدی سزا مل گئی یا وہ جس کی سزا مؤخر کی گئی وہ سب اس امر میں برابر ہیں کہ ان کو آخرت میں پوری جزا ملے گی اہل ایمان کو ان کے ایمان اور اطاعت پر ثواب ہو گا اور کافروں کو ان کے کفر اور معصیت پر عذاب ہو گا۔ پھر اس کی دلیل یہ بیان فرمائی کہ جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ ﷻ ان کی خوب خبر رکھنے والا ہے جب کہ وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے تو اس کو ہر ایک کی اطاعت اور معصیت کا علم ہے اس لئے اس کو یہ علم ہے کہ کون شخص کس جزا کا مستحق ہے اس لئے وہ کسی کا حق اور اس کا بدلہ ضائع ہونے نہیں دے گا اور وہ ہر شخص کو اس کے کاموں کی پوری پوری جزا اور بدلہ دے گا۔

آیت نمبر ۱۱۲: رسول اللہ ﷺ کے توسط سے اہل ایمان کو انتہائی مشکل حالات کے وقت چند ہدایات دی گئی ہیں۔ شدید مخالفت کے باوجود ہر حال میں دین پر استقامت اختیار کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ مخالفین کے ظلم کے رد عمل میں ایسا قدم نہ اٹھایا جائے جو شریعت کے خلاف ہو۔ اللہ ﷻ اہل ایمان اور ان کے مخالفین کے اعمال سے خوب واقف ہے۔

اس آیت میں نبی کریم ﷺ اور اہل ایمان کو ایک تو استقامت و پامردی کی تلقین کی جارہی ہے، جو دشمن کے مقابلے میں ایک بہت بڑا ہتھیار ہے، دوسرے "طُغْيَانٌ" یعنی حد سے بڑھ جانے سے روکا گیا ہے، جو اہل ایمان کی اخلاقی قوت اور رفعت کردار کی بُلندی کے لئے بہت ضروری ہے، حتیٰ کہ دشمن کے ساتھ معاملہ کرتے وقت بھی حد سے تجاوز جائز نہیں ہے۔ "وَلَا تَطْغَوْا" سے مراد ظلم وزیادتی، اللہ ﷻ نے جو حدود مقرر کی ہیں ان سے نکل جانا اور گناہوں کا ارتکاب ہے۔

علمی بات: استقامت کا مفہوم اور اس کی فضیلت: استقامت کے معنی سیدھا کھڑے رہنے کے ہیں، جس میں کسی طرف ذرا سا جھکاؤ نہ ہو، ظاہر ہے کہ یہ کام آسان نہیں۔ استقامت لفظ تو چھوٹا سا ہے مگر مفہوم اس کا ایک عظیم الشان وسعت رکھتا ہے کیونکہ معنی اس کے یہ ہیں کہ انسان اپنے عقائد، عبادات، معاملات، اخلاق، معاشرت، کسب معاش اور اس کی آمد وصرف کے تمام ابواب میں اللہ جل شانہ کی قائم کردہ حدود کے اندر اس کے بتلائے ہوئے راستہ پر سیدھا چلتا رہے، ان میں سے کسی باب میں کسی عمل اور کسی حال میں کسی ایک طرف جھکاؤ یا کمی زیادتی ہو جائے تو استقامت باقی نہیں رہتی۔

دنیا میں جتنی گمراہیاں اور عملی خرابیاں آتی ہیں وہ سب اسی استقامت سے ہٹ جانے کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ استقامت ایک ایسا جامع لفظ ہے کہ دین کے تمام اجزاء وارکان اور ان پر صحیح اور اعتدال کے ساتھ عمل اس کی تفسیر ہے۔

قرآنِ حکیم میں دوسرے مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے: "بیشک وہ لوگ جنہوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے، پھر خوب قائم رہے، ان پر فرشتے اترتے ہیں کہ نہ ڈرو اور نہ غم کرو اور اس جنت کے ساتھ خوش ہو جاؤ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔" (سورہ حٰم السجدۃ ۴۲، آیت: ۳۰)

فرمان نبوی ﷺ: سیدنا سفیان بن عبد اللہ ثقفی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (ﷺ) سے سوال کیا، اے اللہ کے رسول (ﷺ)! مجھے اسلام کے بارے میں کوئی ایسی بات بتلائیں کہ مجھے آپ کے بعد کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہ رہے؟ آپ علیہ السلام نے فرمایا: "کہہ میں اللہ پر ایمان لایا، پھر اس پر استقامت اختیار کر۔" (صحیح مسلم)

علمی بات: یہ ظاہر ہے کہ رسول کریم ﷺ تو انسان کامل کی عملی مثال بن کر اس دنیا میں تشریف لائے تھے اور فطری طور پر استقامت آپ علیہ السلام کی عادت تھی مگر پھر فکر مند اس لئے ہوئے کہ آیت میں مطلق استقامت کا حکم نہیں بلکہ حکم یہ ہے کہ امر الٰہی کے مطابق استقامت ہونا چاہئے، انبیاء کرام علیہم السلام پر جس قدر خوف و خشیت الٰہی کا غلبہ ہوتا ہے وہ سب پر عیاں ہے، اس خشیت ہی کا یہ اثر تھا کہ باوجود کامل استقامت کے یہ فکر لگ گئی کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو جیسی استقامت مطلوب ہے وہ پوری ہوئی یا نہیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ علیہ السلام کو امت کا استقامت پر قائم رہنا دشوار دیکھ کر یہ فکر و غم لاحق ہوا۔

عملی پہلو: اس دنیا میں سب سے زیادہ دشوار کام استقامت ہے اسی لئے محققین صوفیاء کرام رحمۃ اللہ علیہم نے فرمایا ہے کہ استقامت کرامت سے بالاتر ہے، یعنی جو شخص دین کے کاموں میں استقامت اختیار کئے ہوئے ہے، اگرچہ عمر بھر اس سے کوئی کرامت صادر نہ ہو، تو بھی وہ اعلیٰ درجہ کا ولی ہے۔

آیت نمبر ۱۱۳: اہل ایمان کے لئے ایک اور اہم ہدایت دی گئی۔ ظالمین یعنی ظالموں اور بالخصوص مشرکین سے کسی قسم کا سمجھوتا کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ سمجھوتا کرنے میں دین کے دشمنوں کی طرف میلان، ان پر اعتماد، ان کو دوست بنانا، دین کے معاملہ میں لچک پیدا کرنا شامل ہے۔ ظالموں سے سمجھوتا کرنا جہنم کا مستحق بنا دیتا ہے۔

علمی بات: اس آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ ظلم و جور میں خود مبتلا ہونے سے تو دین و دنیا کی تباہی سبھی جانتے ہیں مگر ظالموں کی طرف ادنیٰ سا جھکاؤ اور میلان، ان سے راضی ہونا، ان پر اعتماد کرنا بھی انسان کو اسی بربادی کے کنارے پہنچا دیتا ہے۔ پھر انسان کی بربادی میں دیر نہیں لگتی۔

اس جھکاؤ اور میلان سے کیا مراد ہے؟ اس کے متعلق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم و تابعین کرام رحمۃ اللہ علیہم کے چند اقوال منقول ہیں، اور سب اپنی اپنی جگہ درست اور صحیح ہیں:

۱۔ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مراد یہ ہے کہ ظالموں سے دوستی نہ کرو اور ان کا کہنا نہ مانو۔

۲۔ ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ظالموں کی طرف کسی طرح کا بھی میلان نہ رکھو۔

۳۔ ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ان کے اعمال و افعال کو پسند نہ کرو (قرطبی)۔

۴۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ظالموں سے مداہنت نہ کرو یعنی ان کے بُرے اعمال پر خاموشی یا رضا کا اظہار نہ کرو۔

۵۔ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ظالموں کی صحبت میں نہ بیٹھو۔

۶۔ قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ شکل و صورت اور فیشن اور رہن سہن کے طریقوں میں ان کا اتباع کرنا یہ سب اسی ممانعت میں داخل ہے۔

۷۔ قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ظلم و جور کی ممانعت اور حرمت کے لئے اس آیت میں وہ شدت ہے جو انسان انتہائی طور پر کر سکتا ہے کیونکہ ظالموں کے ساتھ دوستی اور گہرے تعلق ہی کو نہیں بلکہ ان کی طرف ادنیٰ درجہ کے میلان اور جھکاؤ اور ان کے پاس بیٹھنے کو بھی اس میں ممنوع قرار دیا گیا ہے۔

۸۔ امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے نزدیک کوئی شخص اس عالم سے زیادہ مبغوض نہیں جو اپنی دنیوی مفاد کی خاطر کسی ظالم سے ملنے کے لئے جائے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اہل کفر اور اہل معصیت اور اہل بدعت کی صحبت سے اجتناب اور پرہیز واجب ہے، بجز اس کے کہ کسی مجبوری سے ان سے ملنا پڑے، اور حقیقت یہی ہے کہ انسان کی صلاح و فساد میں سب سے بڑا دخل صحبت اور ماحول کا ہوتا ہے، اسی لئے حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے ان دونوں آیتوں کے دو لفظوں کے متعلق فرمایا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے پورے دین کو لا کے دو حرفوں میں جمع کر دیا ہے، ایک، پہلی آیت میں لَا تَطْغَوْا اور دوسرا، دوسری آیت میں لَا تَرْكَنُوْا، پہلے لفظ میں حدود شرعیہ سے نکلنے کی اور دوسرے لفظ میں برے لوگوں کی صحبت کی ممانعت ہے اور یہی سارے دین کا خلاصہ ہے۔

آیت نمبر ۱۱۴: نماز قائم کرنے کا حکم دیا ہے۔ قائم کرنے سے مراد پابندی، آداب اور افضل وقت میں ادا کرنا ہے۔ بتایا گیا ہے کہ نیکیاں برائیوں کے اثرات کو مٹا دیتی ہیں اور نیک کاموں میں نماز کو اولیت حاصل ہے۔ نیکیاں صغیرہ گناہوں کی معافی کا ذریعہ ہیں جب کہ کبیرہ گناہوں کی معافی کے لئے سچی توبہ ضروری ہے۔ نماز اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے تعلق کا اہم ترین ذریعہ ہے۔ اس کے ذریعہ بدی کا مقابلہ کرنے کی ہدایت دی گئی ہے۔

سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "آدمی کی آزمائش اس کی بیوی، اس کے مال، اس کی اولاد اور اس کے پڑوسی میں ہوتی ہے۔ (اور اس آزمائش میں اگر ناکامی ہو جائے تو) نماز، روزہ اور صدقہ اس کا کفارہ کرتے ہیں، نیک بات کا حکم کرنا اور بُری بات سے روکنا (اس کا کفارہ) کرتا ہے۔" (صحیح بخاری)

نماز کے ذریعے گناہوں کا مٹنا احادیث مبارکہ کی روشنی میں: ا۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "بتاؤ کہ اگر کسی کے دروازے کے سامنے کوئی نہر جاری ہو اور وہ اس میں ہر روز پانچ مرتبہ نہاتا ہو تو تم کیا کہتے ہو کہ یہ (نہانا) اس کے میل کو باقی رہنے دے گا؟" صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی، یا رسول اللہ! (اتنا نہانا تو) اس کے میل کو ذرا سا بھی باقی نہیں چھوڑے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "یہی مثال پانچ نمازوں کی ہے، اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔ (صحیح بخاری) آپ ﷺ کا فرمان مبارک ہے کہ اگر کسی شخص کے دروازے پر نہر جاری ہو اور وہ روزانہ اس میں پانچ مرتبہ نہائے تو تمہارا کیا گمان ہے۔ کیا اس کے بدن پر کچھ بھی میل باقی رہ سکتا ہے؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی کہ نہیں یا رسول اللہ ﷺ ہرگز نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہی حال پنج وقتہ نمازوں کا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے سے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔ (صحیح بخاری)

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "پانچوں نمازیں اور (ہر) جمعہ (دوسرے) جمعہ تک درمیانی مدت کے گناہوں کا کفارہ (ان کو مٹانے والے) ہیں جب تک کبیرہ گناہوں کا ارتکاب نہ کیا جائے" (صحیح مسلم)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جب کوئی مسلمان فرض نماز کا وقت ہونے پر اس کے لئے اچھی طرح وضو کرتا ہے اور اس کے خشوع و خضوع اور رکوع کا اچھی طرح اہتمام کرتا ہے تو وہ اس (نماز) سے پہلے کیے ہوئے گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے بشرطیکہ کبیرہ گناہوں کا ارتکاب نہ ہو، اور یہ (فرض نماز سے صغیرہ گناہوں کا معاف ہو جانا) ہمیشہ کے لئے ہے۔" (صحیح مسلم)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جب مسلمان یا مومن بندہ وضو کرتا اور اپنا چہرہ دھوتا ہے تو پانی کے ساتھ یا پانی کے آخری قطرے کے ساتھ اس کے چہرے سے وہ تمام گناہ جھڑ جاتے ہیں جو اس کی آنکھوں نے کیے تھے یا اسی طرح کی کوئی اور بات فرمائی، پھر جب وہ اپنے ہاتھوں کو دھوتا ہے تو پانی کے ساتھ یا پانی کے آخری قطرے کے ساتھ وہ تمام گناہ جھڑ جاتے ہیں جو اس کے ہاتھوں سے ہوئے ہیں، یہاں تک کہ وہ گناہوں سے پاک و صاف ہو کر نکلتا ہے"۔ (جامع ترمذی، مسند احمد)

آیت نمبر ۱۱۵: دعوت دین، نیک اعمال بالخصوص اوقات صلوۃ اور دین پر استقامت کے لئے صبر کی تلقین کی گئی ہے۔ عمدگی کے ساتھ عمل کرنے والے نیکوکاروں کا اجر محفوظ ہے۔

علمی بات: صبر کا جامع معنی ہے کہ ایک مسلمان ہر حال میں شریعت کے قواعد و ضوابط کی پابندی کرتا رہے اور ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کے حضور صبر و شکر کا مظاہرہ کرے۔ لیکن سیاق و سباق کے حوالے سے یہاں صبر کا معنی یہ ہے کہ ایک داعی اور مسلمان پریشانیوں اور مشکلات کے مقابلے میں اپنا حوصلہ قائم رکھے۔ ایسے صابر شخص کو تسلی دینے کے ساتھ ساتھ خوشخبری بھی سنائی جا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا اجر کبھی ضائع نہیں کرے گا۔ صبر بے بسی اور کم ہمت ہو جانے کا نام نہیں۔ صبر قوت برداشت، قوت مدافعت اور تحمل برقرار رکھنے اور طبیعت کو شریعت کا پابند بنانے کا نام ہے۔ دشمن کے مقابلے میں جرأت، بہادری اور مستقل مزاجی کے ساتھ و مصائب کا سامنا کرنے سے مسائل حل ہوتے ہیں، آخرت میں بغیر حساب و کتاب کے جنت میں داخلہ نصیب ہو گا اور دنیا میں اللہ تعالیٰ کی معیت و دستگیری حاصل ہو گی۔

آیت نمبر ۱۱۶: اہل بصیرت اور سمجھدار لوگوں پر فساد سے روکنے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ہلاک ہونے والی اقوام میں فساد اور برائیوں سے باز رکھنے والے چند ہی لوگ تھے جو عذاب آنے پر بچا لئے گئے۔ باقی اکثریت ظالم تھی جو ظلم پر قائم اور دنیا کی عیش و عشرت میں مگن رہی یہاں تک کہ عذاب نے انہیں گھیر لیا۔

علمی بات: یعنی آپ ﷺ کا رب ایسا نہیں ہے کہ لوگوں پر ظلم کرے وہ جو عذاب دیتا ہے اور ہلاک کرتا ہے اس کا سبب کفر اور شرک اور ظلم و معاصی ہوتے ہیں ان گناہوں میں سے یہ بھی ہے کہ جو لوگ گناہوں میں مبتلا ہوں قدرت ہوتے ہوئے انہیں نہ روکا جائے۔ جب لوگ اصلاح کے کام میں لگے ہوئے ہوں گے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب نہیں آئے گا ورنہ عذاب میں مبتلا ہوں گے۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی، اس کے بعد فرمایا: لوگو! تم یہ آیت پڑھتے ہو: (يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ: سورۃ المائدہ ۵، آیت: ۱۰۵) اے ایمان والو! اپنے اپ کی فکر کرو، اور تمہیں دوسرے شخص کی گمراہی ضرر نہ دے گی، جب تم ہدایت پر ہو۔ اور بے شک ہم نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے: جب لوگ کوئی بُری بات دیکھیں اور اس کو دفع نہ کریں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پر اپنا عام

عذاب نازل کر دے۔ (سنن ابن ماجہ)

رسول اللہ ﷺ سے روایت ہے: "بے شک اللہ ﷻ کچھ لوگوں کی نافرمانی کی وجہ سے سب لوگوں کو عذاب میں مبتلا نہیں کرتا حتی کہ وہ اپنے سامنے بُرائی ہوتی دیکھیں اور وہ اسے روکنے کی طاقت کے باوجود اسے نہ روکیں، جب وہ اس طرح کے ہو جائیں تو پھر اللہ ﷻ عام و خاص (زیادہ اور تھوڑوں سب کو) عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔" (مشکوٰۃ المصابیح)

علمی بات: پہلی اقوام کی تباہی کے دو بنیادی اسباب کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا کہ ان لوگوں میں انبیاء کرام علیہم السلام کی بے مثال اور انتھک کوشش کے باوجود ایسے لوگ کیوں نہ تیار ہوئے جو ان کو عقیدہ و عمل کی خرابی اور فساد فی الارض مچانے سے روکتے۔ جنہوں نے دنیا پرست ظالموں کی پیروی کی اور مجرمانہ طرز عمل اختیار کیا۔ ان کی تباہی کا سبب ان کا اپنا کردار تھا۔ اگر یہ اپنے آپ پر ظلم نہ کرتے تو اللہ ﷻ کبھی انہیں اس انجام سے دوچار نہ کرتا کیونکہ وہ اصلاح کرنے والوں کو کبھی ہلاک نہیں کرتا۔

آیت نمبر ۱۱۷: کسی بھی قوم پر ناحق عذاب نہیں آتا۔ ظلم اور فساد کرنے والے عذاب میں مبتلا کئے جاتے ہیں۔ جب تک کسی بستی میں قوم اصلاح کی کوششوں میں لگی رہتی ہے وہاں اللہ ﷻ عذاب نہیں بھیجتے۔

علمی بات: کسی قوم کی بقا اور عذابِ الٰہی سے بچنے کے لئے لازم ہے کہ اس میں اصلاح احوال کے لئے ایک منظم جماعت موجود ہو۔ اللہ ﷻ افراد کی انفرادی اور ذاتی کمزوریوں سے در گزر کر دیتا ہے لیکن جب انفرادی کمزوریاں جرائم کی صورت اختیار کرتے ہوئے اجتماعی شکل اختیار کر لیں اور ان کی اصلاح کے لئے کوئی منظم جماعت بھی نہ ہو۔ تو اس قوم کا وجود دنیا میں کینسر کی صورت اختیار کر لیتا ہے جس کے منفی اثرات ہر جاندار تک پہنچتے ہیں۔ اس صورت حال کو بدلنے اور دنیا کے نظام کو متوازن اور ہموار رکھنے کے لئے ظالم قوم کو عذابِ الٰہی سے ہلاک کر کے جب کہ انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کے ساتھیوں کو بچا لیا جاتا ہے۔ عمومی عذاب کے وقت نیک لوگوں کو بچانے کا وعدہ انبیاء کرام علیہم السلام کی ذات کے ساتھ مشروط ہوا کرتا تھا۔ اب اللہ ﷻ کا اصول یہ ہے وہ چاہے تو بُرے لوگوں کے ساتھ نیک لوگوں کو اس عذاب سے دوچار کر دے بعد ازاں نیک لوگوں کا ان کی نیت کے مطابق معاملہ ہو گا۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا اللہ ﷻ کی حدود پر قائم رہنے والے اور اس میں گھس جانے والے (خلاف کرنے والے) کی مثال ایسے لوگوں کی سی ہے جنہوں نے ایک کشتی کے سلسلے میں قرعہ ڈالا۔ جس کے نتیجہ میں بعض لوگوں کو کشتی کے اوپر کا حصہ ملا اور بعض کو نیچے کا۔ پس جو لوگ نیچے والے تھے، انہیں (دریا سے) پانی لینے کے لئے اوپر والوں کے پاس سے گزرنا پڑتا۔ انہوں نے سوچا کہ کیوں نہ ہم اپنے ہی حصہ میں ایک سوراخ کر لیں تاکہ اوپر والوں کو ہم کوئی تکلیف نہ دیں۔ اب اگر اوپر والے بھی نیچے والوں کو من مانی کرنے دیں گے تو کشتی والے تمام ہلاک ہو جائیں گے اور اگر اوپر والے نیچے والوں کا ہاتھ پکڑ لیں تو یہ خود بھی بچیں گے اور ساری کشتی والے بھی بچ جائیں گے۔ (صحیح بخاری، جامع ترمذی، سلسلۃ الصحیحہ، مسند احمد)

آیت نمبر ۱۱۸: اللہ ﷻ چاہتا تو تمام انسانوں کو دین حق کے راستے میں ڈال دیتا مگر کسی کو زبردستی کسی دین پر مجبور کرنا حکمت کا تقاضا نہیں ہے، انسان کو اختیار دیا گیا جس کے تحت وہ اچھے یا بُرے اعمال کر سکتا ہے۔ ہر دور میں کچھ لوگ اختیار کا غلط استعمال کر کے حق کی مخالفت اور اس سے اختلاف کرتے رہے ہیں۔

علمی بات: مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ ﷻ چاہتا تو سب لوگوں کو ایک ہی امت بنا دیتا اور سب ایک ہی دین پر ہوتے دنیا میں اسلام ہی اسلام ہوتا اور وہ سب تکوینی طور پر اور جبراً مسلمان ہو جاتے۔ لیکن اللہ ﷻ کی حکمت کا یہ تقاضا ہے کہ حق اور باطل دونوں راستے بیان کر دیئے جائیں اور جسے ایمان قبول کرنا ہو وہ اپنے اختیار سے قبول کرے اور جسے کفر پر جمے رہنا ہو وہ اپنے اختیار سے کفر پر جما رہے جیسا کہ سورۃ الکہف میں فرمایا "اور آپ فرما دیجئے کہ تمہارے رب کی طرف سے حق ہے سو جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر اختیار کرے بیشک ہم نے ظالموں کے لئے آگ تیار کر رکھی ہے" پس جب حق قبول کرنے پر جبر نہیں کیا بااختیار بنا دیا تو شیاطین کی کوششوں اور نفسانی خواہشات کے تقاضوں پر چلنے والے کافر رہیں گے اور اس طرح-اہل حق اور اہل باطل میں ہمیشہ اختلاف رہے گا ہاں جس پر اللہ ﷻ کی مہربانی ہو وہ حق ہی کو اختیار کرے گا اور اسی پر رہے گا۔

علمی بات: اس سے معلوم ہوا کہ اختلاف سے مراد اس جگہ دین حق اور تعلیمات انبیاء کرام علیہم السلام کی مخالفت ہے، اجتہادی اختلاف جو ائمہ دین اور فقہاء اسلام میں ہے وہ فروعی اختلاف ہے، اصول دین کے اندر ان حضرات کے بیچ کوئی اختلاف نہ تھا اور حق و باطل کے درمیان اختلاف اصول و عقائد میں ہوا کرتا ہے نیز یہ

فروعی مسائل میں رائے مختلف ہونا عہد صحابہ کرام علیہم السلام سے ہوتا چلا آیا ہے وہ اس میں قطعاً داخل نہیں اور نہ وہ رحمت الٰہی کے خلاف ہے بلکہ مقتضائے حکمت و رحمت ہے، جن حضرات نے ائمہ مجتہدین کا اختلاف اس آیت کی رو سے غلط، خلاف رحمت قرار دیا ہے، یہ خود سیاق آیت کے بھی خلاف ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم وتابعین کرام رحمۃ اللہ علیہم کے عمل کے بھی۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

علمی بات: اختلاف مذموم ہونے کے باوجود مجتہدین کا اختلاف کیوں محمود ہے؟ اس آیت میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اختلاف کی مذمت فرمائی ہے اور اختلاف کرنے والوں کو رحمت سے دور قرار دیا ہے اسی طرح حدیث میں بھی اختلاف کی مذمت بیان ہوئی ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ بیشک بنی اسرائیل بہتر (۷۲) فرقوں میں بٹ گئے تھے اور میری امت کے تہتر (۷۳) فرقے ہوں گے اور ایک فرقے کے سوا وہ سب دوزخ میں جائیں گے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا یارسول اللہ! وہ کون لوگ ہوں گے، فرمایا: جس طریقہ پر میں اور میرے اصحاب رضی اللہ عنہم ہیں۔ سنن الترمذی، المستدرک، مسند احمد) سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: بنی اسرائیل ۷۱ گروہوں میں تقسیم ہوئے تھے، ان میں سے (۷۰) ہلاک ہوگئے اور ایک گروہ کامیاب ہوا، اور میری امت (۷۲) فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی، ان میں سے (۷۱) فرقے ہلاک ہوں گے اور صرف ایک گروہ نجات پائے گا، ایک روایت میں ہے: سارے کے سارے فرقے آگ میں جائیں گے، ماسوائے ایک فرقے کے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دریافت کیا: اے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! وہ کونسا گروہ ہو گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جماعت والا، جماعت والا۔ (مسند احمد)

اب یہ سوال ہوتا ہے کہ جب قرآنِ مجید اور مستند احادیث میں اختلاف کی مذمت کی گئی ہے تو فقہاء مجتہدین کا ایک دوسرے سے اختلاف کرنا اور تمام ائمہ مجتہدین کا برحق ہونا کس طرح درست ہو گا، اس کا جواب یہ ہے کہ قرآنِ مجید اور احادیث میں جس اختلاف کی مذمت کی گئی ہے وہ عقائد کا اختلاف ہے اور ائمہ مجتہدین کے درمیان عقائد میں اختلاف نہیں ہے بلکہ مسائل فرعیہ میں اختلاف ہے اور یہ اختلاف باعث رحمت ہے کیونکہ اس سے امت کے لئے عمل میں آسانیاں پیدا ہوتی ہیں اور مسائل فرعیہ میں اختلاف کے جواز کی دلیل مندرجہ ذیل حدیث ہے

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) غزوہ احزاب سے واپس ہوئے تو آپ علیہ السلام نے ہم سے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص بنو قریظہ پہنچنے سے پہلے نماز نہ پڑھے۔ بعض مسلمانوں نے راستے میں عصر کی نماز کا وقت پالیا، ان میں سے بعض نے کہا ہم بنو قریظہ پہنچنے سے پہلے نماز نہیں پڑھیں گے اور بعض نے یہ کہا بلکہ ہم نماز پڑھیں گے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہم سے یہ ارادہ نہیں فرمایا تھا پھر انہوں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے ان میں سے کسی کو ملامت نہیں فرمائی۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم)۔

آیت نمبر ۱۱۹: جن پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی رحمت ہو گی وہ لوگ اختلافات سے محفوظ رہتے اور سیدھی راہ پالیتے ہیں۔ اختیار کی قوت انسانوں کے علاوہ جنات کو بھی دی گئی ہے۔ دین حق سے اختلاف کا راستہ اختیار کرنے والے جنات اور انسانوں کی اکثریت جہنم کی مستحق ہو گی۔

علمی بات: یہ بات قرآنِ کریم نے بار بار واضح فرمائی ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ چاہتا تو تمام انسانوں کو چار و ناچار ایک ہی دین کا پابند بنا دیتا، لیکن اس کائنات کی تخلیق اور انسان کو اس میں بھیجنے کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ انسان کو اچھے بُرے کی تمیز سکھا کر اسے یہ موقع دیا جائے کہ وہ اپنے اختیار اور اپنی مرضی سے جو راستہ چاہے اختیار کرے اسی میں اس کا امتحان ہے کہ وہ اپنی مرضی اور اختیار کو ٹھیک استعمال کرتا ہے، اور اس کے نتیجے میں جنت کماتا ہے یا اس اختیار کا غلط استعمال کر کے دوزخ کا مستحق بن جاتا ہے، اس امتحان کی وجہ سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے کسی کو اس کے اختیار کے بغیر زبردستی کسی ایک راستے پر نہیں رکھا۔

کافر انسانوں میں سے بھی ہوں گے اور جنات میں سے بھی ہوں گے دونوں جماعتوں کے کفار سے جہنم بھر دی جائے گی، جیسا کہ سورۃ الاعراف میں اور سورۃ ص میں ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ابلیس کو خطاب کر کے فرمایا "میں تجھ سے اور ان سب جنات اور انسانوں سے دوزخ بھر دوں گا جو تیری پیروی کریں گے"۔

علمی بات: "وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ" اور اسی کے لئے اس نے انہیں پیدا فرمایا۔ اس جملہ کا تعلق آیت کے کس حصہ کے ساتھ ہے؟ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اس کا تعلق الا من رحم ربک کے ساتھ ہے۔ یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے لوگوں کو پیدا تو رحمت کے لئے کیا ہے، یہ الگ بات ہے کہ وہ شقاوت کو اپنے لئے پسند کریں۔ انسان کی تخلیق کی غایت یہ ہے کہ وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی رحمت سے بہرہ مند ہوتا رہے۔ اور ہمیشہ ہدایت کی شاہراہ پر گامزن رہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس کا تعلق اختلاف سے ہے یعنی انسان کو اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ اپنے اختیار سے کوئی راہ چنے۔ اسے کسی ایک راہ پر چلنے کے لئے مجبور نہیں کیا جائے گا۔ اس طرح جو اختلاف رونما ہو گا

اس کے پیش نظر بعض کو جنت میں اور بعض کو دوزخ میں بھیجا جائے گا اور ایک قول یہ بھی ہے کہ اس کا تعلق اختلاف اور رحمت دونوں سے ہے۔ اب آیت کا معنی یہ ہو گا کہ اہل اختلاف، اختلاف کے لئے پیدا کیا اور اہل رحمۃ کو رحمۃ کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ علامہ قرطبی کہتے ہیں ان شاء اللہ یہ توجیہ سب سے بہتر ہے۔

علمی بات: رسول اللہ ﷺ سے فرمایا گیا کہ آپ گمراہ لوگوں کے وجود پر غم و حیرت کا اظہار نہ کریں کیونکہ اہل حق کے مقابلے میں گمراہ لوگ بھی برابر پیدا ہوتے رہیں گے۔ راہ حق کے قبول کرنے اور اس سے اختلاف کرنے والے ہمیشہ رہے ہیں چنانچہ کچھ لوگ فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے درست راہ اختیار کریں گے اور دین حق اپنائیں گے اور کچھ فطرت کے مطابق نہ چلتے ہوئے گمراہ ہوں گے، پس اہل ایمان رحمت کے مستحق اور اہل کفر عتاب خداوندی کا شکار رہوں گے۔

آیت نمبر ۱۲۰: سابقہ رسولوں کے واقعات بیان کرنے کے تین مقاصد ہیں:

۱۔ تاکہ رسول اللہ ﷺ کی تسلی و تشفی ہو اور اہل ایمان کے ایمان اور استقامت میں اضافہ ہو۔

۲۔ آپ ﷺ اور اہل ایمان تک سابقہ انبیاء کرام علیہم السلام کے حالات پہنچ جائیں جن کی انہیں پہلے سے خبر نہ تھی۔

۳۔ تمام انسانوں اور بالخصوص اہل ایمان کے لئے نصیحت و یاددہانی کا سامان ہے۔

علمی بات: گزشتہ انبیائے کرام علیہم السلام اور ان کی قوموں کے حالات بیان کرنے سے مقصود یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی تسلّی و تشفی کے ساتھ مزید ہمت افزائی کی جائے اور انہیں بتایا جائے کہ مکہ مکرمہ میں آپ علیہ السلام پر اور آپ علیہ السلام کے ساتھیوں پر جو مصائب آرہے ہیں اسی طرح جب بھی کوئی رسول علیہ السلام کسی قوم کی طرف مبعوث ہوئے اور دعوت حق پیش کی تو ان کی مخالفت اسی شد و مد سے ہوئی۔ چنانچہ کفار مکہ آپ علیہ السلام کے ساتھ جو برتاؤ کر رہے ہیں اس پر آپ علیہ السلام دل برداشتہ نہ ہوں۔ انبیاء و رسل علیہم السلام اور ان کے ساتھیوں کو ہمیشہ ایسے ہی حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ گزشتہ امتوں نے بھی اپنے انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ ایسا ہی کچھ کیا، لیکن بالآخر اللہ ﷻ نے اپنے رسول علیہ السلام کی مدد کی اور ان کو کافروں پر غلبہ عطا فرمایا لہٰذا آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھیوں کو غلبہ نصیب ہو گا، کفار مکہ ناکام و نامراد ہوں گے، اور آپ علیہ السلام اور آپ ﷺ کے تمام صحابہ کرام و اہل بیت اطہار رضی اللہ عنہم کو اللہ ﷻ معزز و مکرم بنائے گا اور دین اسلام غالب ہو کر رہے گا۔

آیت نمبر ۱۲۱: توحید کے واضح دلائل دیکھ لینے کے باوجود ایمان نہ لانے والوں کے لئے رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے دوٹوک اعلان کرایا گیا کہ وہ اپنے طریقہ پر اور اہل ایمان اپنے طریقہ پر عمل کرتے رہیں گے۔

آیت نمبر ۱۲۲: انکار پر اصرار کرنے والوں کو ان کے بُرے انجام کا منتظر رہنے کی تنبیہ کی گئی ہے۔ توحید کو اختیار کرنے والے اپنے بہترین انجام کے منتظر رہیں گے۔ جو فریق جیسے انجام کا اہل ہو گا اللہ ﷻ ویسے انجام سے دوچار کرے گا۔

علمی بات: ایک قول کے مطابق یہ مراد ہے کہ شیطان نے تم کو جو فقر و فاقہ سے ڈرایا ہے تم اس کا انتظار کرو اور ہم اس رحمت اور مغفرت کا انتظار کر رہے ہیں جس کا اللہ ﷻ نے ہم سے وعدہ کیا ہے ایک رائے کے مطابق تم ہماری ہلاکت کا انتظار کرو اور ہم تم پر عذاب کے نازل ہونے کا انتظار کر رہے ہیں۔ وقت بتلائے گا کہ کون پکڑ کا مستحق ہے۔

آیت نمبر ۱۲۳: اللہ ﷻ آسمان و زمین کے تمام رازوں سے واقف ہے۔ تمام انسانوں کے معاملات آخری فیصلہ کے لئے اسی کے سامنے پیش ہوں گے۔ اللہ ﷻ کی بندگی اور اسی پر بھروسہ کرتے ہوئے دعوت حق کا کام جاری رکھنے کی تلقین کی گئی ہے۔

علمی بات: الٰہ ﷻ کی متعدد صفات ہیں۔ یہاں خصوصیت کے ساتھ علم اور قدرت کا ذکر فرمایا، صفت علم اور قدرت کا مطلب ہے کہ اللہ ﷻ مخلوق کے ظاہر و باطن سے خوب واقف ہے۔ اور جزا اور سزا پر مکمل قادر ہے۔ جب اللہ ﷻ ہی مستقل بالذات علم و قدرت والا ہے۔ تو اسی کی عبادت کرنی چاہیئے اور اسی پر توکل رکھنا چاہیئے کیونکہ حقیقتاً اور مستقلاً وہی مدد گار ہے۔

یہ بھی یقین رکھنا چاہیئے کہ اللہ ﷻ بندوں کے اعمال سے غافل نہیں ہے۔ یعنی وہ اطاعت گزاروں کی اطاعت کو ضائع نہیں فرمائے گا، ور منکروں اور سرکشوں کو مزید ڈھیل نہیں دے گا۔ وہ قیامت کے دن سب کو میدان حشر میں زندہ کر کے جمع کرے گا اور ہر شخص سے حساب لے گا، اور انجام کار نیکوکاروں کو جنت عطا فرمائے گا، اور بدکاروں کو دوزخ میں دھکیل دے گا۔

عملی پہلو: مومن اللہ ﷻ کی عبادت، اللہ ﷻ پر بھروسہ کے بعد اپنے تمام امور اسی کے سپرد کر دیتا ہے۔ اور اللہ ﷻ اس کا محافظ و نگران حال بن جاتا ہے اور اپنی رحمت کا دامن اس کے لئے کشادہ فرما دیتا ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے اس آیت میں آپ ﷺ کو تسلی دی ہے کہ آپ علیہ السلام اہل کفر و شرک کی شرارتوں سے دل گرفتہ نہ ہوں آپ علیہ السلام اپنی دعوت کو جاری رکھئے اور ان کا فیصلہ اللہ ﷻ کے حوالہ کر دیجئے، اس سے آسمان و زمین کی کوئی بات چھپی ہوئی نہیں، سب معاملات اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ وہاں انہیں پتہ لگ جائے گا کہ وہ کس خبط میں پڑے ہوئے تھے۔ آپ علیہ السلام اپنے پروردگار کی بندگی اور فرمانبرداری میں لگے رہیے اور اپنی امت کو بھی اس کی تلقین فرمایئے۔ اور اسی کی مدد پر قوی بھروسہ رکھیے۔ آپ علیہ السلام کا رب آپ علیہ السلام کے ماننے والوں اور آپ علیہ السلام کے مخالفین کے تمام اعمال سے بخوبی آگاہ ہے۔ وہ ان کے ان اعمال کا بدلہ ضرور دے گا۔